McGill University Library
3 102 886 028 9

حدیثِ دفاع

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں

از خامہ
میجر جنرل محمد اکبر خاں
کرنل کمانڈنٹ رائل پاکستان آرمی سروس کور

فیروز سنز
لاہور ——— کراچی ——— پشاور

باردوم ۱۹۵۸ء قیمت پانچ روپے

~~39~~ ~~A2236~~
INSTITUTE
OF
ISLAMIC
STUDIES
22459 ★
McGILL
UNIVERSITY
Ch. 68

حدیثِ دفاع

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں

از خامہ

(سابق) میجر جنرل محمد اکبر خاں

کرنل کمانڈنٹ رائل پاکستان آرمی سروس کور

فیروز سنز

لاہور　پشاور　کراچی

بار دوم　۱۹۵۸ء　پانچ روپے

میجر جنرل محمد اکبر خان

فہرس

عنوان	صفحہ
حرفِ آغاز	۷
دیباچہ	۱۰
جنگ اور فطرت انسانی	۱۶
دنیا کے فاتح	۱۷
سیرتِ مبارک کا اہم پہلو اور اس سے تہی پہلو	۱۹
غزوات نبوی	۱۹
عالمگیر لڑائیاں اور ان کے اسباب و عوامل	۲۰
جنگ کے مقاصد	۲۵
چند واقعات و دلائل	۲۵
دفاع اور ہم۔ اصولِ جنگ اور وسائلِ جنگ	۲۹
دفاعی سیاست	۳۰
فنِ سپہگری اور دفاعی سیاست	۳۲
ملکِ عرب کی جغرافیائی حیثیت	۳۸
اہلِ حجاز	
تمدن و نسلی حالات	۵۳
مشہور قبائل	۵۴
معاش و معاشرت	۵۵
یثرب	۵۶
بدؤوں کے امتیازی قومی خصائص	۵۷
اسلام کا اثر	۶۰
فنِ حرب	۶۱

تجارت	۶۲
مذہب واعتقادات	۶۳
واقعۂ فیل	۶۴
حجاز کے گردوپیش کی دنیا	۶۷
بانیٔ اسلام کا بچپن اور جوانی	۶۹
خاندان اور اجداد	۷۰
ولادت ومابعد	۷۱
شام کا سفر	۷۳
جہالت کا دورِ دورہ	۷۵
معاش کی جدوجہد	۷۶
شادی کے بعد	۷۹
خانہ کعبہ کی تعمیر	۸۰
ریاضت واستغراق	۸۰
آغازِ اسلام	۸۱
سِرِّ دلبراں در حدیثِ دیگراں	۸۶
تقدیر	۸۹
ہجرت دفاعی نقطۂ نظر سے	۹۴
واقعۂ ہجرت اور مورخین کا سکوت	۹۶
اسباب ہجرت	۹۷
دفاعی اہمیت	۱۰۱
دفاعی مرکز	؍؍
یثرب کی دفاعی اہمیت	۱۰۵
اندرونی استحکام	۱۰۹
حرم	۱۱۰
تجربات وشواہد	۱۱۱
تین نعمتیں	۱۱۳

تیاری اور اصولِ جنگ ۱۱۴
آنحضرت صلعم بحیثیت سپہ سالار ۱۱۷
لشکریانِ اسلام کی تربیت ۱۲۳
ایک مغالطہ ۱۲۶
ہجوم و اقدام ۱۲۷
آنحضرت صلعم کی دفاعی تیاریاں ۱۳۴
فوجی دستوں کی روانگی ۱۳۴
آنحضرتؐ کی روانگی ۱۳۵
نخلہ کی مہم ۱۳۶
غزوات:- ۱۴۲
غزوۂ بدر۔ بدر اور اس کا نواح ۱۴۲
جنگ بدر کے اسباب ۱۴۵
پہاڑی علاقوں کی جنگ ۱۵۰
جنگِ کا آغاز ۱۵۳
بدر کے بعد۔ غزوۂ بنی قینقاع ۱۶۶
ابوسفیان کا تعاقب ۱۶۷
نجد کے راستہ کی ناکہ بندی ۱۶۸
جنگ اُحد ۱۷۳
مدینے کے مقامی حالات اور آبادی ۱۷۳
غزوۂ اُحد کے بواعث ۱۷۵
صف آرائی اور مورچہ بندی ۱۷۷
آغازِ جنگ ۱۷۸
مسلم خواتین کا جذبۂ ایثار ۱۸۱
مدینہ کو مراجعت اور دشمن کا تعاقب ۱۸۲
مغرب کے دفاعی مبصرین ۱۹۰
واقعات مابعد اور اخلاقی سبق ۱۹۴

ایک غلط فہمی	۲۰۱
اُحد کے بعد	۲۰۶
واقعۂ رجیع	؍؍
بیر معونہ کا واقعہ	۲۰۷
بنو نظیر	۲۰۹
غطفان کے قبائل	۲۱۱
غزوۃ السویق یا بدر ثانی	۲۱۳
غزوۂ خندق	۲۱۸
غزوۂ بنی قریظہ	۲۲۷
اسباق و نتائج	۲۲۹
غزواتِ بنی لحیان و بنی مصطلق	۲۴۳
مختلف مہمات	۲۴۴
نتائج و اسباق	۲۴۵
صلحِ حدیبیہ	۲۴۷
غزوۂ خیبر	۲۶۰
عمرہ اور حج	۲۶۲
عمرو بن العاص اور خالد بن ولید کا ایمان لانا	۲۶۴
عمرو بن العاص کی دوسری مہم	۲۶۵
غزوۃ الخبط	۲۶۶
غزوۂ موتہ	؍؍
فتحِ مکّہ	۲۷۴
فتحِ مکّہ کے بعد	۲۸۲
غزوۂ تبوک	۲۸۶
اسباق	۲۹۱
خلاصہ	۲۹۲
جنگ کے ہتھیار	۳۲۰

حرفِ آغاز

ایک مسلمان کے لئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ امیؔ ابی) کی ذاتِ اقدس و گرامی اس لئے بھی محبوب و مطلوب ہو سکتی ہے کہ اس کے ایمان و ایقان کے مطابق آپ اللہ کے رسول برحق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی اپنا کلامِ پاک قرآنِ مجید کی صورت میں آپ پر نازل فرمایا اور حضور کا اسوہ حسنہ ایک مکمل و اکمل انسانی زندگی کا آئینہ دار بنا اسلئے ایک مسلمان کے لئے حضوؐر کی متابعت ہی دینی اور دنیوی فوز و فلاح کا باعث ہو سکتی ہے +

لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام صرف مسلمانوں کے لئے ہی مخصوص نہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمگیر پیامِ امن و آزادی ہے اور اس کا مقصدِ وحید انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانا ہے تاکہ وہ اپنے مدارج کو پہچان سکے +

دیکھنا یہ ہے کہ نبوت و رسالت کے اعلیٰ مدارج کے علاوہ بحیثیت ایک انسان آنحضرت صلعم کی صفاتِ حسنہ دنیا کے تمام بڑے بڑے انسانوں سے مابہ الامتیاز تھیں؛ یہی وہ معیار ہے۔ جس کی بنا پر ہر شعبۂ حیات میں آنحضرت صلعم کی بزرگی، افضلیت اور انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے +

آنحضرت صلعم کی سیرتِ پاک کے متعلق بڑی کاوش اور محنت سے متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے حضوؐر کی عام زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کے قلب و ذہن پر ایسے واقعات ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر آنحضرت صلعم نے جنگ اور دفاع کے متعلق جو قابلِ تقلید اور یادگار نقوش چھوڑے ہیں اُن کے اجاگر اور نمایاں کرنے کی طرف آج تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ یہ درست ہے کہ کتبِ تاریخ و سیر میں غزوات کے حالات کافی شرح و بسط سے موجود ہیں مگر جس مہارتِ فنِ حرب اور تدبر و دانش سے

آپؐ ہر غزوہ میں کامیاب و کامگار رہے۔ اس پر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی +
دُنیا کے بڑے بڑے فاتحوں، جرنیلوں، اور سپہ سالاروں کے نام عزت سے لئے جاتے ہیں۔ اور ان کے کارناموں کو انتہائی تفاخر سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی جرنیل ایسا نہ ہوگا۔ جس کو اپنی زندگی بھر کسی نہ کسی موقعہ پر ناکامی کا منہ دیکھنا نہ پڑا ہو، اور کامل مہارتِ فنونِ جنگ کے باوجود کسی مقام پر ٹھوکر نہ کھائی ہو بر عکس اس کے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ پاک کے اس پہلو کو دقتِ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو اس میں بھی ان لوگوں کے لیئے رشد و ہدایت کے لاثانی شاہکار نظر آتے ہیں۔ جو دنیا کے دوسرے جرنیلوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سکتے ہیں اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی جہاں اخلاقِ عالیہ کا مجسم نمونہ تھی۔ اور جن کی تخلیق ہی اللہ کے اخلاق پر ہوئی تھی وہاں آپ نے میدان جنگ کے لئے جو اصول و قواعد وضع فرمائے اور جو طریق اختیار کیا۔ وہ آج بھی دیدۂ بینا کے لئے سرمۂ بصیرت کا کام دے سکتا ہے +

مقامِ مسرت ہے کہ نبی اکرم صلعم کی حیات اقدس کے اس اہم اور نہایت ضروری پہلو پر ہمارے کرمفرما عالیجناب میجر محمد اکبر خاں صاحب میجر جنرل، کرنل کمانڈنٹ رائل پاکستان آرمی سروس کور نے پہلی مرتبہ قلم اٹھایا ہے۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ یہ اہم کام ایسے ہی ماہرِ فنِ حرب کی توجہ کا محتاج تھا۔ جو دَورِ جدید کی حربی ایجادات اور ملٹری سائنس کی جزئیات سے کامل واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ پاک پر بھی گہری نظر رکھتا ہو اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے مشن میں کامیاب رہے ہیں۔ آپ کا یہ کارنامہ نہ صرف مسلمان قوم پر احسانِ عظیم ہے۔ بلکہ دنیا بھر کے جرنیلوں اور سپہ سالاروں کے لیئے ایک ایسا جنگی ہدایت نامہ ہے۔ جس کی روشنی میں دشوار گذار منزلیں سامنے نظر آنے لگتی ہیں +

گذشتہ دونوں جنگ ہائے عظیم کے بعد انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں متعدد ایسی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ جن میں چوٹی کے جرنیلوں نے محاربات میں جو جو اصول و قواعد استعمال کیئے۔ ان پر بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے۔ کہ ان اصولوں کو اپنا کر وہ کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب رہے اور کس حد تک ناکام ؟

اس خالص دفاعی اور حربی نکتۂ نگاہ سے اسلامی نظریۂ حرب اور بالخصوص رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات کو نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس کتاب کے ذریعے یہ خدمت بحسن وخوبی سرانجام دی گئی ہے۔ جو نہ صرف ایک دینی خدمت ہے۔ بلکہ عسکری اور حربی کے علاوہ بہت بڑی علمی اور ادبی بھی ہے +

ہماری بھی خوش قسمتی ہے کہ وقت کی اس اہم کتاب کی نشر و اشاعت کا کام ہماری فرم کے حسن انتظام سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے لیکن کسی ذہنی کاوش کی بہترین داد یہی ہو سکتی ہے کہ عوام و خواص اس کے مطالعہ سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اٹھائیں +

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

ناشرین

دیباچہ

جہاں تک راقم الحروف کے علم و واقفیت کا تعلق آنحضرت صلعم (روحی فداہ) کے غزوات کے متعلق ہے اردو میں یا اُردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں اس وقت تک کوئی ایسی کتاب نہیں ہے۔ جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے عسکری پہلو پہ کماحقہٗ روشنی ڈالی گئی ہو اور یہ دکھایا گیا ہو کہ اس اعتبار سے دنیا میں آپؐ کا مرتبہ کتنا بلند ہے +

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سابق استاذِ قانون جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کو جنہوں نے اس طرف توجہ فرمائی اور "عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ" کے نام سے دو مبسوط رسالے شائع کئے اور اشاعت سے پہلے واقعات اور مقامات کی صحت کا اس درجہ اہتمام کیا کہ دو دفعہ چشم دید مطالعہ و مشاہدہ کے لئے حجازِ مقدس تشریف لے گئے اور سفر و حضر میں طویل مدت گذارنے کے بعد انتہائی کاوش کے ساتھ نقشہ ہائے جنگ مرتب کیے +

ہم نے ان دونوں رسالوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ واقعی یہ ایک بلند پایہ اور قابلِ تعریف کوشش ہے اور مرتب نے سچے اور صحیح جذبہ کے ساتھ یہ خدمت انجام دی ہے۔ نہ صرف اسی پہ اکتفا کی ہے۔ بلکہ غزوات کے سلسلے میں بھی مسلسل کام کر رہے ہیں + اور بتوفیقِ ایزدِ متعال آیندہ بھی کرتے رہیں گے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر صاحب معترف ہیں۔ آپ ملٹری سائنس (عسکری علوم) سے ناآشنائے محض ہیں۔ کاش آپ کو اس میں بھی درک ہوتا اور آپ کا علمی تبحّر اور ذوقِ تحقیق و تجسس جو آپ کو سیرت مبارک کے اس پہلو سے ہے غفلت و بے خبری کے پردوں کو چاک کر کے تاریکیوں میں روشنی کی جھلک پیدا کر دیتا۔ جو مسلمانوں کے فکر و فہم کا احاطہ کئے ہوئے ہیں +

چونکہ آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک کے اس پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ لہٰذا

واقعات غزوات کے سلسلے میں عجیب عجیب غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور سطحی نظر رکھنے والے ہی نہیں اکثر اربابِ فکر و بصیرت بھی ان میں مبتلا ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال غزوۂ بدر کے ابتدائی واقعات ہیں۔ اربابِ سیرت و تاریخ کا خیال ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے جب آپؐ مدینہ سے فدائیانِ اسلام کو لے کر روانہ ہوئے تو آپؐ کا مقصد ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کو لوٹنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مذکور نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے اور اسلامک ریویو (لندن) کے شمارۂ ستمبر ۱۹۲۳ء میں اس پر اس سے استدلال کیا ہے۔ کہ آپ کی نقل و حرکت بالکل خفیہ تھی۔ حتّٰی کہ آپؐ نے اونٹوں کے گلوں سے گھنٹیاں کھلوا دیں آپ رات کے وقت سفر فرماتے تھے۔ تاکہ مخالفین کو نقل و حرکت کا پتہ نہ چل سکے۔ لیکن روانگی کے بعد کے حالات شاہد ہیں کہ یہ خیال قطعی طور پر غلط، بے بُنیاد اور آپؐ کے منصوبہ دفاع کا معارض ہے۔ اگر مقصد محض قافلۂ تجارت کو لوٹنا ہوتا تو اس کے لئے نہ طول طویل اور پُرپیچ و دشوار راستہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی اور نہ بدر کے میدان تک پہنچ جانے کے بعد قیام و سکون کی گنجائش۔ آپ کو آگے بڑھ کر قافلہ پر حملہ کر دینا چاہیئے تھا۔ اور اتنی مہلت نہیں دینی چاہیئے تھی کہ ابوسفیان بدر کے میدان میں پہنچ کر یہ معلوم کرتا کہ آپؐ اور آپ کے ساتھی نواحِ بدر تک پہنچے یا نہیں۔ پھر جب اسے قرائن و شواہد سے آپؐ کے پہنچ جانے کا علم ہو گیا تھا تو اسے اتنا وقت نہ دیا جاتا کہ واپس جا کر قافلہ کا راستہ بدلتا اور بچ کر نکل جاتا لیکن تاریخ کہتی ہے کہ آپؐ نے اس طرف دانستہ طور پر بے اعتنائی کی۔ مشرکین کا قافلہ بعافیت نکل جاتا ہے۔ مگر آپؐ میدانِ بدر کا معائنہ فرما رہے ہیں۔ لوگوں سے خفیہ طور پر مل کر لشکرِ قریش کی اطلاعات حاصل کر رہے ہیں صحابہؓ کو ساتھ لے کر محاذ آرائی و مورچہ بندی کا انتظام فرما رہے ہیں اور اس لئے فرما رہے ہیں کہ مقصد لوٹ مار نہیں بلکہ لشکرِ قریش کو اپنے دفاعی منصوبے کے جال میں پھانس کر تباہ کرنا ہے۔ روانگی کے وقت اگر آپؐ نے مقصدِ منزل کا اظہار نہیں فرمایا اور اہلِ لشکر نے یہ سمجھا کہ آپ قافلہ کو لوٹنے جا رہے ہیں تو یہ بالکل قدرتی بات تھی۔ آپؐ نے سکوت اس لئے فرمایا کہ کوئی ہوشمند جرنیل اپنے منصوبۂ دفاع کو کبھی کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ مسلمانوں کا ایسا سمجھنا محض اس وجہ سے تھا کہ وہ کچھ ہی دنوں پہلے یہ دیکھ چکے تھے کہ آپؐ کے بھیجے ہوئے چند جانباز خاص مکّہ کے قریب جا کر مشرکین کے ایک قافلۂ تجارت کو لوٹ چکے اور اس کے سالار کو موت

22 459

کے گھاٹ اُتار چکے ہیں۔ لہٰذا جب وہ مکّہ کے قریب پہنچ کر اس دلیری کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ تو ابوسفیان کی سالاری میں واپس آنے والا قافلہ تو مکّہ سے بہت دُور ہے۔ اور ہزاروں کی مالیت کا سامان اور زر و نقد لئے جا رہا ہے۔ تو اس سے بھی ضرور تعارض کیا جائیگا۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آنحضرت صلعم سے انصار نے جو معاہدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اس وقت لڑیں گے جب مسلمانوں پر حملہ کیا جائے گا۔ یعنی جب قریش مکّہ مدینہ پر چڑھائی کریں گے تو دفاع میں آپ کا ساتھ دیں گے۔ اگر آپ جنگ و پیکار کا اظہار و اعلان کر کے روانہ ہوتے تو قطعی اندیشہ تھا کہ آپ کی جمعیت کمزور ہو جاتی، انصار میں تفرقہ پڑ جاتا، معاندین و منافقین کو پروپیگنڈے کا موقعہ مل جاتا اور بیرونی اثرات کی کارفرمائیاں ان کے شیرازہ کو کمزور کر دیتیں۔ جس طرح مسلمانوں کو لوٹ مار کا خیال ہوا اسی طرح مشرکینِ مکہ کو بھی غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے سمجھا کہ جب مسلمان ہمارے گھر پر چھاپہ مار کر لوٹ سکتے ہیں تو اتنے بڑے قافلہ کو کب چھوڑیں گے۔ لہٰذا وہ لاؤ لشکر اور اپنے حلیف و متعاہد قبائل کو لے کر چل کھڑے ہوئے۔ ایک جمعیت قافلہ کی حفاظت کے لئے تیار کی گئی اور ایک ہزار کے قریب لڑنے والی فوج کی حیثیت سے معہ جملہ سامان جنگِ بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ آنحضرت صلعم کی پیش بینی و دفاعی مہارت کا کمال تھا کہ آپ نے بدر کا انتخاب پہلے سے کر لیا تھا۔ اور اس طرح کفار کو اپنے دفاعی جال میں پھانس کر اپنے منتخب کردہ میدانِ جنگ میں لڑنے پر مجبور اور شکست دے کر ذلیل کیا۔

اس کی تفصیل اس کتاب میں اپنے محل پر بیان کی گئی ہے۔ یہاں ان واقعات کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ جو غلطی قریب قریب تمام مورخین نے کی ہے۔ اسی کا ارتکاب نادانستہ طور پر محض تقلیداً ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے بھی ہوا۔ اور اس کی وجہ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے خود اعتراف کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلعم کے غزوات کے واقعات کی تو کوئی کمی نہیں مگر ملٹری سائنس کے نقطۂ نظر سے آپ کے غزوات کے متعلق نہ کہیں کوئی چیز پڑھنے میں آتی ہے نہ سننے میں۔ تیرہ سو سال پہلے کی لڑائیوں پر کچھ لکھنے کے لئے تاریخی واقعات کے علاوہ فوجی تجربہ اور ملٹری سائنس سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ اور اسی فوجی تجربہ اور ملٹری سائنس (عسکری علوم) سے وہ علم و آگہی مقصود ہے جس نے مجھے یہ کتاب لکھنے پر آمادہ کیا۔

اس کی تسوید و اشاعت کا مقصد محض یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات گرامی کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو اب تک عام و خاص سب کی نظروں سے پوشیدہ رہا ہے اور جس کی دفاعی حکمتوں اور عسکری عظمتوں کا کوئی جواب ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ہم آنحضرتؐ کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ سب کچھ فخر و احترام سے بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ آپؐ نے اپنے مشن کی تکمیل کس طرح فرمائی، کن تدبیروں سے کام لیا، دفاعی سیاست میں آپؐ کا مقام کیا ہے اور دفاعی حدیث کیا اہمیت رکھتی ہے؟ جب ہم ہر طرح آپؐ کی تقلید کو واجب بلکہ فرض سمجھتے ہیں تو عسکری زندگی، فوجی قیادت، دفاعی سیاست اور فن سپہ گری کو کیوں فراموش رکھا جائے۔ اس سے کیوں نہ رہنمائی حاصل کی جائے کیوں نہ اس پر عمل کرنے کو لازم قرار دیا جائے اور کیوں آپ کے بلند کردار کے موتیوں کو نظر انداز کر کے دوسروں کے خذف ریزوں کے لئے دریوزہ گری کی جائے؟

یہ کام یقیناً آسان نہیں لیکن ہم نے حتی المقدور شرح و بسط کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے انتہائی حوصلہ فرسا حالات میں کس طرح کام کیا۔ آپؐ کی دفاعی سیاست، فوجی نقل و حرکت اور حرب و ضرب کے اصول کتنے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ دشمنوں پر آپؐ کی ہیبت کس طرح اور کس درجہ قائم تھی۔ جہاں طاغوت پرستیوں، کج راہیوں، منافقتوں اور دشمنیوں کے طوفان اُمنڈ رہے تھے۔ وہاں صداقت شعاری، خدا پرستی، نکوکاری اور تہذیب و شرافت کا دور دورہ کس طرح ہوا۔ اور افلاس و نکبت کی جگہ اطمینان و فراغت اور آسودہ حالی کس طرح میسر آئی۔ دعوت الی الحق کا جہاد سے کیا تعلق ہے۔ غزوات اور دنیا کی دوسری لڑائیوں میں کیا فرق ہے اور فخرِ موجودات اور رحمۃ للعالمین کے معنی کیا ہیں؟

لہٰذا ہم نے دعویٰ کیا ہے ——— اور یہ دعویٰ زندگی کے طویل تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے ——— کہ جس طرح آنحضرتؐ کی ذات دوسرے تمام اعتبارات سے واجب التقلید ہے اسی طرح سپہ سالار، مجاہد، دفاعی سیاست کے ماہر اور فن سپہ گری کے امام کی حیثیت سے بھی واجب التقلید ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ دنیا کتنی ہی ترقی کر جائے مادی اسباب و وسائل کتنے ہی فراہم ہو جائیں۔ مگر اصول و فن اور عمل کے اعتبار سے آپؐ کے مقام سے آگے کوئی اور مقام پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمان جس پستی اور نکبت میں گرفتار اور جس احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ اس کا واحد علاج حدیثِ دفاع کا احیاء اور اس پر سرگرمی اور خلوص کے ساتھ عملدرآمد ہے۔ یہ خالی دعویٰ نہیں اپنی پشت پر ٹھوس حقائق اور منطقی دلائل رکھتا ہے +

چونکہ یہ کتاب اپنی نوعیت کی غالباً پہلی کوشش ہے۔ اس لئے اس میں کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا ہونا مستبعد نہیں۔ اہلِ نظر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ ان سے درگزر فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرمائیں اور جہاں کہیں تطبیق واستخراجِ نتائج میں کوئی نقص نظر آئے۔ وہاں اس سے مطلع کر کے مصنف کو شکریہ کا موقعہ دیں +

ان حضرات کو جنہوں نے مغرب کی بعض دفاعی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اس قسم کی کمی ضرور نظر آئیگی کہ فلاں دستہ کی کمان کس کے سپرد تھی اور فلاں جنگ کی محاذ آرائی اور صف بندی کس طرح کی گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک کمی کہی جاسکتی ہے۔ مگر یہ ایسی نہیں جس سے کتاب کے مطالب اور متعینہ مقصد کے پیش کرنے میں کوئی سقم واقع ہوتا ہو۔ ہمارا اصل مدعا یہ ہے کہ آنحضرت کی عسکری مہارت، دفاعی سیاست اور فنِ سپہ گری کے کمال کا اظہار کیا جائے۔ اس لئے ماتحت سالاروں اور صحابہؓ کے کارناموں کے بیان کی نہ ضرورت تھی نہ گنجایش۔ ان کی زندگیاں اور زندگی کی ساری تابناکیاں حیاتِ مبارک ہی کے آفتاب سے مستفید رہیں +

اس طرح ترتیب مضامین اور ضبطِ تحریر میں بھی ہم نے روشِ عام کو چھوڑ کر اپنا راستہ علیحدہ بنایا ہے اور وہ یہ ہے کہ عبارت کو مآخذ کے حوالوں اور فٹ نوٹوں سے بوجھل نہیں بنایا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ چیزیں عام قاری کے ذوقِ مطالعہ پر بار ہوتی ہیں۔ تحریر کی روانی مجروح ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف یا مؤلف اپنی سعی وکاوش کا اشتہار دے کر پڑھنے والے سے داد وستائش کے انعام کا متمنی ہے۔ ورنہ نہ تو وہ اس بات کی ضمانت ہوتے ہیں کہ مصنف نے ان کی صحیح ترجمانی کی ہے اور نہ مختصر حوالوں اور تذکروں سے مطالب کی وضاحت اور استناد کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر ایجاز واختصار پسندی سے پڑھنے والا خسارہ میں رہتا ہے +

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے دوسری کتابوں سے استفادہ نہیں کیا۔ کتاب کی تسوید کے دوران میں ہمارے سامنے تاریخ وسیرت کی مستند ترین کتابیں

رہی ہیں۔ سیرت اور غزوات کے تمام واقعات و حالات انہی سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اخذ و اختیار کے بعد حسب روایت ہر نقل و حرکت اور ہر محاذ آرائی کو نقشہ پر منتقل کر کے علت و معلول کا سلسلہ ہم نے خود قائم کیا ہے اور منطقی ربط پیدا کرنے کے بعد ان سے دفاعی اسباق و نتائج حاصل کئے ہیں۔ یہ تمام کام راقم کا اپنا ہے۔ اس میں جہاں ۲۷ سالہ سپاہیانہ زندگی کے تجربات و مشاہدات نے میری مدد کی ہے۔ وہاں وہ سرکاری دفاعی و تاریخی کتب و رسائل بھی میرے معین و مددگار ہوئے ہیں۔ جن کے مطالعہ کا موقعہ مجھے وقتاً فوقتاً اپنی فوجی زندگی میں ملتا رہا ہے۔ میں ان کے مصنفین کا شکرگزار ہوں۔ لیکن افسوس کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں ان کے نام ظاہر نہیں کر سکتا۔

آخر میں میں اپنے رفیقِ تحریر شبیر بیگ صاحب بریلوی کا جو ایک تجربہ کار اہل قلم اور کہنہ مشق اخبار نویس ہیں۔ شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔ جن کی محنت اور عرق ریزی کی بنا پر یہ کتاب اتنی جلد اس حسنِ ترتیب اور اس اسلوبِ نگارش کے ساتھ منصۂ شہود پر آئی۔ ان کی رفاقت و ہمت افزائی نے میرے حوصلوں کو بہت بڑھایا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے!

محمد اکبر خاں (میجر جنرل)
کرنل کمانڈنٹ رائل پاکستان
آرمی سروس کور

قدسی۔ ملیر روڈ کراچی
مورخہ ۶ر جنوری ۱۹۵۳ء

دفاعی حدیث

جنگ اور فطرتِ انسانی

جنگ فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ ہر زمانے میں جنگ کسی نہ کسی صورت میں دنیا پر مسلط رہی۔ اب جبکہ آسان ذرائع آمد و رفت اور تعلیم و سائنس کی ترقی نے دنیا کے تمام ممالک کو ایک عالمگیر برادری میں منسلک کر دیا ہے جبکہ تمام ضروریاتِ انسانی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں۔ جب تک بین الاقوامی تعلقات بہتر اور استوار نہ ہوں لیکن اس کے باوجود جنگ کے مہیب بادل عالمِ انسانیت پر چھائے رہتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کی تباہی و بربادی کے پیشِ نظر جمعیت الاقوام کا وجود عمل میں آیا۔ لیکن جمعیت کا وجود ختم ہو گیا۔ جب ۱۹۳۹ء میں جرمنی کے ڈکٹیٹر ہر ہٹلر نے جنگ کا اعلان کر دیا اور دُنیا دوسری عالمگیر جنگ کے ہولناک جہنم میں جھونک دی گئی۔ اسی جنگ کے دوران میں اقوامِ متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے مقاصد و عزائم وہی ہیں۔ جو جمعیت الاقوام کے تھے کہ دنیا کو جنگ کی ہولناکیوں اور خون آشامیوں سے بچایا جائے۔ لیکن کیا جنگ کا خطرہ مستقلاً ٹل گیا ہے؟ اس کے متعلق کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ عوام کے قلوب میں یہ وساوس موجود ہیں کہ تیسری جنگ قضائے مبرم ہے۔

جنگ فطرتِ انسانی ہے۔ ایک ملک کو جنگ کی آرزو نہ رکھتے ہوئے بھی جنگ کرنی پڑتی ہے۔ بمثال کے طور پر کوئی ملک کسی ایسے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جو لڑنا نہیں چاہتا۔ مگر جب کوئی اس پر حملہ آور ہوگا۔ تو وہ ضرور مدافعت کرے گا۔ مدافعت اس کا ایسا حق ہے، جسے چھینا نہیں جا سکتا۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ جب خداوندِ کریم نے حضرت آدم کی تخلیق کا فیصلہ

کیا تو فرشتوں سے فرمایا کہ میں آدم کو بنانا چاہتا ہوں جو زمین پر میری خلافت کے فرائض انجام دے گا۔ اس پر فرشتوں نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کی باری تعالیٰ! آدم دنیا میں فساد پھیلائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر عہد میں جنگ ہوئی خواہ اس کا مقصد ظلم و جور تھا یا ظلم و جور کا قلع قمع +

دنیا کے فاتح جرنیل

سکندر کو سکندرِ اعظم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے یورپ اور ایشیا کا کچھ حصہ بہت تھوڑے عرصہ میں فتح کر لیا۔ مگر واقعاتی اعتبار سے وہ مکمل جرنیل نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی فوج نے خواہ وہ کسی وجہ سے بھی اس کے خلاف بغاوت کی اور آخر کار اسے ہندوستان سے اپنے ارادوں میں ناکام ہو کر واپس لوٹنا پڑا +

نپولین کی عسکری و جنگی قابلیت بلاشبہ حیرت انگیز تھی۔ اس نے یورپ کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ لوگ اس اکیلے کو دس ہزار فوج کے برابر سمجھتے تھے۔ اس کے جنگی اصول اٹل ہیں جو یورپ کے فوجی اسکولوں میں آج کل پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر اس نامور جرنیل نے بھی شکست کھائی اور قید خانہ میں مجبور و لاچار انسان کی حیثیت سے زندگی کی آخری سانسیں پوری کر کے رخصت ہو گیا۔ اسے بھی مکمل جرنیل تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے +

رچرڈ دی لائن ہارٹ (شیر دل رچرڈ) نے بھی فتوحات حاصل کیں۔ مگر وہ بھی ناکام و نامراد مرا۔ یہی حشر ہنیبال کا ہوا۔ موجودہ زمانہ میں ہٹلر نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ مگر آخر کار خودکشی کر کے ہلاک ہوا۔ اسے بھی صحیح مکمل اور کامیاب جرنیل تسلیم نہیں کیا جا سکتا +

اس میں شک نہیں کہ مشکلات اور ناکامیوں سے انسان کے فطری اور عملی قویٰ بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس کی فطرت ہجوم مصائب کو ایک خاص حد تک ہی برداشت کر سکتی ہے۔ ربڑ کے غبارے کی مثال لیجئے۔ غبارہ میں ہوا بھریئے اور برابر بھرتے چلے جایئے ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ زیادہ ہوا کا تحمل نہ ہو سکے گا اور پھٹ جائے گا۔ اسی طرح جب انسان پر آلام و مصائب کا بوجھ برداشت سے زیادہ پڑ جاتا ہے۔ تو اس کی فطرت ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ فوجی لیڈر میں برداشت کی یہ طاقت اس کی قابلیت و استعداد کے مطابق ہوتی ہے شکست و ناکامی کے اثرات انسان میں

فطری طور پر بزدلی، کم فہمی، بے رحمی اور بغاوت جیسی کمزوریاں پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن لیڈر کی ذاتی مثال اس کی دور اندیشی اور تدبر و قابلیت اس کی فوج سے یہ کمزوریاں دور رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے آنحضرت صلعم کے علاوہ دنیا کا کوئی دوسرا فوجی لیڈر ایسا نظر نہیں آتا جو اس معیار پر پورا اترتا ہو+

انسان ہمیشہ سے لڑتا چلا آیا ہے اور باہمی اختلافات کے تصفیہ کے لیئے اُسے بالآخر تلوار اٹھانا پڑی ہے۔ اسی فطرت انسانی کے مطابق حکومتیں بھی اپنے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیئے لڑتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ انسان فطرتاً جنگ کا عادی ہے ابتدائے آفرینش سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اگر اس فطرت میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہ ہو گئی تو آیندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ اور چونکہ لوگ یہ بات جلد بھول جاتے ہیں کہ جنگ میں شکست بھی ہوتی ہے۔ لہذا حصول مقصد کے لیئے جنگ و جدل کبھی ختم نہ ہو گا+

آج کل عام خیال ہے کہ جس قوم کے پاس ہوائی جہاز، ایٹم بم، فوج اور زر و مال زیادہ ہے وہی فتح کا پرچم لہرائے گی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں پہلے لوگ بھی کہتے تھے کہ صرف وہی قومیں فاتح بن سکتی ہیں۔ جن کے پاس فوج اور روپیہ زیادہ ہے حالانکہ یہ غلط اور بالکل غلط ہے مگر عوام اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی قومیں ذلت و تباہی کے غار میں ایسی گرتی ہیں کہ پھر کبھی نہیں سنبھلتیں۔ ہمارے سامنے ہٹلر کی مثال موجود ہے۔ اس نے جرمنی کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس کر کے زبردست فوج تیار کی اور اس کی مدد سے اسے فاتح عالم بنانے کی کوشش کی۔ مگر شکست کھائی۔ اسباب شکست کے تعین پر مبصرین کی رائے میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے اگر ہٹلر انگریزی فوج کو ڈنکرک سے انگلستان نہ جانے دیتا اور انگلستان پر فوراً حملہ کر دیتا تو جنگ کا نتیجہ دوسرا ہوتا۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر ہٹلر جبل الطارق اور اسپین پر قبضہ کر لیتا تو برطانیہ کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر العالمین کے مورچہ پر فیلڈ مارشل رومیل کو بروقت کمک بھیج دیتا تو برطانیہ یقینی طور پر پسپا ہو جاتا ایک گروہ کے نزدیک روس پر حملہ کرنا ہٹلر کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اگر انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل رہتی ہے کہ فوج کی کامیابی اور ظفر مندی کا انحصار لیڈر کی ذات پر ہوتا ہے اور اس کی عالی حوصلگی، بلند خیالی، تدبر و ہوشمندی

اور دل و دماغ کی دوسری صلاحیتوں پر بہت سے امور کا دار و مدار ہوتا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جو فتح و شکست کا ماضی میں بھی فیصلہ کرتے تھے اب کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے۔ انہی اسباب کی بنا پر عرب کا ایک یتیم نوجوان اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر دنیا کو چیلنج کرتا ہے۔ شروع میں اسے مصائب و مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور شکست و ناکامی کی وجہ سے وطن سے ہجرت کر کے دوسری جگہ چلا جاتا ہے۔ مگر مقصد و نصب العین کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ آخر چشمِ فلک نے وہ منظر بھی دیکھا کہ تھوڑے سے عرصہ کے بعد وہی ہجرت کرنے والا فاتح بن کر واپس آتا ہے۔ اپنے اصولوں کی بے روک اشاعت کرتا ہے اور دنیا کو امن و اطمینان کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے +

سیرت مبارک کا اہم ترین پہلو اور اس سے پہلوتہی

یہ سب کیونکر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی کے اسباب کیا تھے؟ ان اوراق میں انہیں سوالات کا جواب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس لئے کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے آپ کی حیاتِ طیبہ کا یہ پہلو پوری تفصیل و وضاحت سے آ جائے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ مسلم فتوحات کی تاریخ کے اوراق نابود کیے جا چکے ہیں انکے لکھنے والے اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اور جو کچھ باقی ہے اس کی حیثیت قصے کہانیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ تحقیق و درائت کی دنیا میں بالکل اندھیرا ہے۔ پھر بھی کوشش یہ ہے کہ یہ تاریکی باقی نہ رہے اور وہ موتی جو ادھر اُدھر بکھرے ہوئے باقی رہ گئے ہیں یا زیرِ زمین دفن ہیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تا کہ ہماری آئندہ نسلوں کے کام آئیں +

غزواتِ نبوی

غزواتِ نبوی اور ماضی و حال کی دوسری لڑائیوں میں جو فرق سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ان کی جنگ کا مقصد محض اپنا مفاد ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک کے فاتح اور دوسرے کے مفتوح بننے کے بعد جب صلح ہوتی ہے تو وہ پیامِ امن و سکون بننے کے بجائے آئندہ جنگ کے اسباب یعنی کینہ و انتقام کے جذبات ساتھ لاتی ہے اس کے برعکس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام جنگوں کا خاتمہ امن و امان پر ہوتا ہے۔ یعنی

جہاں دوسری جنگوں نے ظلم وستم اور غارتگری پھیلائی۔ وہاں حدیثی جنگوں نے تمام دنیا کو اخوت ومساوات کی دعوت دی شرائطِ صلح طے کرتے وقت غیر مسلم فاتحوں کی نیت ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ مفتوح کو زیادہ سے زیادہ مجبور و بے بس بنایا جائے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ آئندہ فاتح اقوام کے حدود یہ ہونگے اور اقوام کی طاقت کا توازن یہ ہوگا پھر مفتوح کو اس قدر جکڑا جائے گا کہ دائمی طور پر غلام بن جائے اور مالی، اقتصادی، تمدنی اور معاشرتی حالت تباہ ہو جائے۔ یہ سختیاں مفتوح اقوام کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑکاتی ہیں۔ مگر حدیثی فتوحات کے بعد شرائطِ صلح میں ہمیشہ مفتوح قوموں کی آئندہ زندگی کی فلاح وصلاح کو مدنظر رکھا گیا اور انہیں امن واطمینان اور مساوات وانصاف کی دولت سے بہرہ ور کیا گیا۔

عالمگیر لڑائیاں اور ان کے اسباب وعوامل

غالباً ان سطور کے سمجھنے میں اس وقت اور زیادہ آسانی ہوگی جب مختصر طور پر وہ اسباب بیان کر دیئے جائیں گے۔ جن کی بنا پر دنیا کو تھوڑی سی مدت میں دو عالمگیر جنگوں کی خونریزی، غارتگری اور بربریت کے ہولناک مناظر دیکھنے پڑے اور نہ صرف دیکھنے پڑے بلکہ اس میں سے گزرنا پڑا۔ ان لڑائیوں میں فریقین کا اصل الاصول یہ رہا کہ فاتح کا مفتوح کے ساتھ انصاف سے کام لینا حماقت ہے۔ اس پر ہر قسم کا ظلم وتعدی جائز ہے اور تشدد اور لوٹ مار فاتح کا پیدائشی حق ہے۔ اس کی تائید میں ہٹلر کی اس تقریر کا حوالہ کافی ہوگا جو اس نے یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمن پارلیمنٹ میں کی تھی۔ اس میں اس نے کہا:۔

> "۱۹۱۹ء میں ہم سے بھرے ہوئے پستول کی نال کی زد میں دستخط کرائے گئے۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں دھمکی دی گئی کہ اگر ان شرطوں پر دستخط نہ کئے گئے تو جرمنی کے لاکھوں باشندے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے اس طرح زبردستی دستخط کرانے کے بعد ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ دستاویز قانونی طور پر اٹل ہے"

اس بیان میں ہٹلر نے چرچل کے وہ الفاظ دہرائے ہیں جو اس نے ۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو دارالعوام میں کہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ہماری ناکہ بندی مکمل ہے بصروں کا بیان ہے کہ جرمنی بھوک سے تڑپ رہا ہے۔

طرفہ یہ کہ انگلستان کے مشہور مبصر اور سیاستدان مسٹر لائیڈ جارج نے صلح کانفرنس کے ارکان کو اسی وقت متنبہ کر دیا تھا۔ کہ" اگر آپ جرمنی کی ساری نوآبادیاں چھین لیں اس کی بحری بّری اور ہوائی فوج کو انتہائی طور پر کم کر دیں اسے ہتھیار بنانے کی اجازت بھی نہ دیں۔ تب بھی اگر جرمنوں کو یہ یقین ہو جائے گا۔ کہ صلح کی شرطیں بے انصافی سے ہم پر ٹھونسی گئی ہیں تو وہ یقیناً انتقام پر اتر آئیں گے اور ہماری سختیاں اور پابندیاں ان میں ایثار، قربانی اور دلیری کے جذبات برانگیختہ کر کے انہیں ہمارے مقابلہ پر لے آئیں گی"

مگر ارکان صلح نے لائیڈ جارج کے مشورے پر کان نہ دھرا اور اس طرح دوسری عالمگیر جنگ کی بنیاد ڈال دی +

اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کئی صدیوں سے انگلستان کی پالیسی یہ رہی ہے کہ وہ مختلف دول یورپ کو ایک دوسرے کے خلاف اُکسا بھڑکا کر دو گروہوں میں منقسم رکھے تاکہ طاقت کا توازن برقرار رہے۔ برطانیہ پہلے یہ دیکھتا تھا۔ کہ اس کا مدِمقابل کون ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ملک شر انگیز ہے بلکہ یہ ہوتا تھا کہ آئندہ چل کر وہ برطانیہ کی سلطنت یا تجارت کے لئے خطرناک بن سکتا ہے۔ اگر وہ قدرتی وسائل اور مالی تجارتی یا اسی قسم کے دوسرے اسباب کی بنا پر طاقتور ہوتا تو برطانیہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے تعاون سے اسے نیچا دکھا دیتا۔ لیکن صلح کے بعد دشمن کو اتنا کمزور نہ کرتا تھا کہ وہ بالکل ہی ختم ہو جائے اور یورپ کا توازن بگڑ جائے۔ ممکن ہے امریکہ اور فرانس نے لائیڈ جارج کے مشورہ کو اسی بنا پر رد کر دیا ہو۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اس وقت برطانیہ فرانس سے خائف تھا۔ کیونکہ وہ یورپ میں سب سے زیادہ طاقتور رہنا چاہتا تھا یا ممکن ہے اس مرتبہ اپنی...... ٹانگ اڑانا چاہتا ہو تاکہ برطانیہ تجارتی میدان میں کبھی اس کا مدمقابل نہ بن سکے۔ ان جھگڑوں میں پھنسا رہے اور اس بنا پر امریکہ و فرانس میں کوئی خفیہ سازباز ہو گئی ہو +

برطانیہ نے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے لیگ آف نیشنز (League of Nations) کی بنیاد ڈالی۔ اس پر برطانیہ اور فرانس میں چل گئی۔ ۱۹۱۹ء میں فرانس نے برطانیہ کی مرضی کے خلاف ٹرکی کی مدد کی۔ جس کی وجہ سے کمال اتاترک ترکی میں آزاد حکومت بنانے میں

کامیاب ہوا۔ مگر جب ۱۹۲۳ء میں فرانس نے جو یورپ میں سب سے زیادہ طاقتور حکومت تھی۔ جرمنی کے علاقہ روہر (Ruhr) پر زبردستی قبضہ کر لیا تو برطانیہ نے جرمنی سے ساز باز شروع کر دی اور خفیہ طریقہ سے جرمنی کو دوبارہ طاقتور بننے میں مدد دینے لگا۔ اس مدد کی بنا پر جرمنی میں فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ (Hinden Burg) کے ماتحت وہ حکومت قائم ہوئی جس کا جانشین ہٹلر بنا +

مگر اس زمانہ میں برطانیہ ایک بڑی مشکل میں گرفتار تھا یعنی ۱۹۱۳ء کی طرح ۱۹۲۵ء میں برطانیہ دنیا کے بنکوں کی پالیسی پر حاوی نہ رہا تھا۔ بلکہ مالی مرکز لندن کی بجائے نیویارک بن گیا تھا۔ برطانیہ زرگری اور زراندوزی کے اس مرکز کو دوبارہ لندن لانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے گولڈ اسٹینڈرڈ (Gold Standard) کے قوانین نافذ کئے۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۱ء تک امریکہ سے تجارتی جنگ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ آمدنی میں کمی کی وجہ سے اپنے دفاع پر بہت کم خرچ کر سکا۔ ادھر فرانس اور جرمنی طاقتور بننے جا رہے تھے۔ مالی بحران کے اس نتیجہ کو چھپانے کے لئے اس نے ایک نئی ترکیب نکالی تاکہ اسے وقت مل جائے اور وہ تجارتی جنگ میں امریکہ سے بازی لے جائے وہ ترکیب یا منصوبہ یہ تھا کہ تمام حکومتیں اپنی اپنی فوجیں کم کر دیں۔ جس سے دنیا میں دوبارہ جنگ کا امکان باقی نہ رہے۔ چنانچہ اسی بنا پر لیگ آف نیشنز (League of Nations) میں جنگی ہتھیار بنانے پر پابندیاں عائد کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ برطانیہ نے چونکہ مالیاتی بحران کی وجہ سے دفاع پر بہت کم خرچ کیا تھا۔ لہٰذا اس کمی کو اس نے دنیا کے سامنے نمونہ و مثال بنا کر پیش کیا۔ جرمنی لیگ آف نیشنز (League of Nations) کا ممبر نہیں تھا۔ اس نے اپنی فوجی طاقت بڑھانی شروع کر دی۔ اس میں خود برطانیہ کی مدد اور اس کا ایما شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب برطانیہ نے ہٹلر کو بہت زیادہ خطرناک بنتے دیکھا تو وہ اُف تک نہ کر سکا۔ برطانوی حکومت اہل برطانیہ کے سامنے فرانس یا جرمنی کے مقابلہ پر جنگی تیاری کا بجٹ پیش نہ کر سکی تھی اور وہ کرتی تو اسے استعفیٰ دینا پڑتا اس لئے جب یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تو برطانوی حکومت اہلِ برطانیہ کو جنگ کے صحیح اسباب نہ بتا سکی اور اس کا اظہار نہ کر سکی کہ ہمیں جرمنی کے خلاف اپنے پرانے اصول یعنی طاقت کے توازن کے مطابق جنگ کرنی ہے اور

نئے جرمنی کے حصولِ حیات، طریقِ تجارت اور صنعت و حرفت پر قدغن لگا کر برطانوی تجارت اور برطانوی سلطنت کو بچانا مقصود ہے۔ بالفاظ دیگر برطانیہ جرمن تجارت کے غیر معمولی فروغ کے خلاف ہے۔ یا یوں کہیئے کہ برطانیہ جرمنی کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یورپ میں طاقت کا توازن قائم رکھنا چاہتا ہے +

مگر جب ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے اعلان جنگ کیا تو اسے صلیبی جنگ (جہاد) کا نام دیا۔ اور سیاسی مفاد کو بالائے طاق رکھ کر ہٹلر اور اس کے نازی مددگاروں کی ہلاکت پر کمر بستہ ہو گیا۔ اس پالیسی نے آگے چل کر برطانیہ کے لئے ایسی الجھنیں پیدا کر دیں جنہیں وہ آج تک نہیں سلجھا سکا۔ اور اب دنیا تیسری عالمگیر جنگ، ایٹم بم، جراثیمی گولوں اور گیس کے گولوں کی تباہ کاریوں کے اندیشوں سے لرز رہی ہے +

چند شہادتیں

اس تصویر کو آسانی سے سمجھنے کے لئے اوپر کے بیانات کی تائید میں روسی مدبروں اور مبصروں کے تبصرے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اس سلسلہ میں ہر گروہ کے خیالات سامنے آجائیں۔ اسٹالن نے ۱۹۳۴ء میں کہا کہ "۱۹۱۴-۱۸ء کی لڑائی نے جرمنی کو برباد نہیں کیا۔ بلکہ فاتح قوموں نے اہلِ جرمنی کے دلوں میں انتقام کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا ہے جو آج تک زندہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس جنگ کی طفیل روس طبقہ امراء کے منحوس اثر سے آزاد ہوا اور اسی کی وجہ سے سوویٹ یونین وجود میں آئی۔ کیا عجب ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کمیونسٹوں کے لئے اور بھی موجبِ رحمت ہو"

۱۰ر مارچ ۱۹۳۹ء کو اس نے ایک بیان میں کہا "ہمیں خبردار رہنا چاہیئے کہ ہم جنگ بازوں کے دھوکے میں آکر اپنے ملک کو خون سے غسل نہ دیں ..... وغیرہ" اس کے بعد اس نے ہٹلر سے دوستی کا پیمان کیا۔ مگر پولینڈ پر جرمنی کے حملے کے وقت پولینڈ میں اپنا حصہ بانٹ لیا اور الگ ہو کر دوسرے موقعہ کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ مناسب وقت آنے پر اپنے مفاد کو حاصل کر سکے۔ چونکہ مسلسل جنگ سے طرفین کمزور ہو جاتے ہیں۔ مالی حالت بگڑ جاتی ہے۔ اس لئے روس کا خیال تھا کہ فاتح اور مفتوح دونوں میں بھوک اور جنگ کی دوسری تکلیفوں کی وجہ سے کمیونسٹ خیالات

کی اشاعت آسان ہو جائے گی۔ گویا اس نے نہ صرف فریقینِ جنگ کی مشکلات مول لینے سے انکار کیا۔ بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کے منصوبے بنا لئے۔ اس کے ساتھ وہ اپنی فوجی طاقت بھی بڑھاتا رہا۔ تاکہ وقت پر اس سے کام لے سکے +

اب جرمنی کے حقوق و مفاد کا حال ہٹلر کی زبان سے سنئے۔ کہتا ہے "کسی ملک کے حدود کی اہمیت اس پر نہیں ہے کہ ان کے اندر وہ اہلِ ملک کے لئے کافی خوراک یا خام سامان پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ اس پر ہے کہ سیاسی اور دفاعی نقطۂ نظر سے محفوظ بھی ہے یا نہیں ...." یعنی ہٹلر نہ صرف ۱۹۱۴ء سے پہلے کی نو آبادیات چاہتا تھا۔ بلکہ وہ خود جرمنی کے حدود کو وسعت دے کر اسے دفاعی اعتبار سے مضبوط بنانا چاہتا تھا تاکہ وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہے۔ یہی نہیں وہ جرمنی کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی بنانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب "مائین کیمف" میں صاف صاف لکھا تھا کہ اس کے ملک کی توسیع صحیح طور پر روسی علاقہ پر قبضہ کرنے ہی سے ہو سکتی ہے اور چونکہ روسی کمتر درجہ کی قوم ہیں۔ لہٰذا جرمنی کو جو افضل و برتر قوم کا گہوارہ ہے۔ روس سے زمین کا مناسب رقبہ چھین لینے کا حق ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ روس پر یہودیوں کا اثر غالب ہے اور اسے یہودی خطرے سے بچانا جرمنی کا فرض ہے"+

ہٹلر سمجھتا تھا کہ اس عظیم سلطنت پر یہودی اپنا قبضہ واثر دیر تک قائم رکھ سکیں گے اس لئے اسے یقین تھا کہ روسی باشندے اس اثر سے بچنے کے لئے روس میں جرمنی کے فاتحانہ داخلہ کے منتظر ہوں گے +

بظاہر ہٹلر کی خواہش یہ تھی کہ جرمنی عزت کے ساتھ آزادانہ زندگی بسر کر سکے اور اس کا ملک بڑی طاقتوں میں شمار ہو۔ مگر اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ دنیا کو تہ و بالا کر دینا جائز سمجھتا تھا۔

امریکہ اس جنگ کو اپنے تجارتی فروغ کے لئے فالِ نیک سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس طرح اس کا سب سے بڑا حریف برطانیہ اور اس کے ساتھ جرمنی فرانس اور جاپان میدان سے ہٹ جائیں گے +

یہ تھے وہ خیالات جو دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز کے وقت مختلف قوموں

کے دماغوں میں پرورش پا رہے تھے۔ شرکائے جنگ نے اعلانِ جنگ کے وقت ان خیالات کو جس جس رنگ میں پیش کیا۔ دنیا اس سے واقف ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ مقدس جنگ جو اتحادیوں نے شروع کی اور جسے جرمنی اور اس کے حلیفوں نے زندگی اور موت کی لڑائی کا نام دیا۔ کن اصولوں پر لڑی گئی +

جنگ کے مقاصد

مغربی اقوام کی دفاعی سیاست متعدد فوجی مبصرین کے افکار کا نچوڑ ہے۔ ان میں جرمنی کے مشہور جرنیل کلازرچ (Clause Witz)، مالٹک (Moltke) اور ڈیلبرک (Delbruck) وغیرہ شامل ہیں۔ ڈیلبرک نے کلازوچ کے افکار و خیالات کو واضح طور پر قلمبند کیا ہے۔ ان کے خیالات میں جنگ کے مقاصد دو قسم کے ہوتے ہیں:-

۱۔ کسی خاص سیاسی مفاد کا حصول۔ جب یہ سیاسی مفاد حاصل ہو جائے تو صلح کر کے جنگ بند کر دینا مناسب ہے۔ لہٰذا اس لڑائی میں دفاعی سیاست کا مقصد میدانِ جنگ میں فیصلہ کن فتح کا حاصل کرنا ہوتا ہے +

۲۔ آخر دم تک لڑنا یعنی غیر محدود قسم کی جنگ تاکہ دشمن کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔ تاکہ آیندہ وہ کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دورانِ جنگ میں متعدد طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً

(ا) پروپیگنڈے کے ذریعہ دشمن کے ملک میں حکومت کے خلاف بغاوت یا عدمِ تعاون کے جذبات برانگیختہ کرنا۔

(ب) دشمن پر مالی و اقتصادی دباؤ ڈال کر اس کے ملک میں بدامنی پھیلانا اور اسے ختم کر دینا +

(ج) مختلف قسم کی فوجی نقل و حرکت کر کے دشمن کو مجبور و بے بس بنا دینا +

چند واقعات و دلائل

جس طرح چرچل نے برطانیہ کی صدیوں پرانی اور آزمودہ پالیسی "طاقت کے توازن" کو پسِ پشت ڈال کر نازیت کے خلاف مقدس "صلیبی جنگ" کا اعلان کیا۔

اسی طرح ہٹلر نے اپنے پرانے دفاعی مبصروں کی رائے اور اپنے جنرل اسٹاف کے مشوروں کو بالائے طاق رکھ کر من مانی کارروائی کی۔ اگرچہ لڑائی کے پہلے دو سال تک وہ اپنے جنرل اسٹاف سے مشورہ لیتا رہا۔ لیکن اس کے بعد مشورہ لینا بھی گوارا نہ کیا۔ سنہ ۱۹۳۹ء کی ایک تقریر میں اس نے ماضی کے فوجی مبصرین اور موجود الوقت جنرل اسٹاف کے متعلق کہا تھا "کون کہتا ہے کہ میں سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے احمقانہ اصولوں پر آئندہ کی لڑائیاں لڑوں گا۔ کیا میں نے اب تک اس بات کی انتہائی کوشش نہیں کی ہے کہ ایسے خیالات کو ہم بالکل بھلا دیں۔ بہت سے لوگ ایسی باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں نہ وہ مستقبل کو دیکھ سکتے ہیں نہ نئی ایجادیں کر سکتے ہیں اور تو اور ہمارے جرنیل بھی بدھو ہیں۔ وہ لکیر کے فقیر اور کتابوں کے کیڑے ہیں عقلمند موجد ایسے کم فہم لوگوں سے دور رہتا ہے"! حکومت کا سب سے بڑا رکن اپنے جرنیلوں کی اس سے زیادہ اور کیا بے عزتی کر سکتا ہے اور اس سے زیادہ کھلم کھلا اپنی بے اعتمادی کا اظہار کس طرح کر سکتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی اعلان کیا۔ کہ میں جرمن قوم کی زبردست سلطنت قائم کرنا چاہتا ہوں جس کا نام اس نے لبسرم (Lebesraum) رکھا +

ہٹلر جہاں اس نئے اصول پر چلنے کا اعلان کر رہا تھا۔ وہاں چرچل جس کا اتحادیوں کی کونسل میں کافی اثر تھا اطالوی جرنیل دوہت (Giulio Douhet) کے دفاعی اصولوں کا حامی بن گیا۔ اس جرنیل کے دفاعی اصول یہ تھے کہ جب دو فریقوں میں لڑائی چھڑتی ہے تو طرفین ایک دوسرے پر غالب آنے کے لئے بحری، بری اور فضائی طاقت سے کام لینے کے منصوبے بناتے ہیں اور جب کوئی فریق مخالف کی فوجوں کو شکست دے دیتا ہے تو ہاری ہوئی فوج کے ملک والوں کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے اور ہاری ہوئی فوج ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ بالآخر اس کو توڑ دیا جاتا ہے...... ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اور سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ میں بھی یہی ہوا یعنی جب میدانِ جنگ کی فوجیں ہار گئیں تو شکست خوردہ فوج کے ملک نے صلح کی درخواست کی۔ یعنی ملک کے باشندوں کا حوصلہ فوج کی شکست سے ٹوٹا اور اس حوصلہ ٹوٹنے سے اس ملک نے شکست تسلیم کر لی۔ لہٰذا کیا وجہ ہے کہ عام طریقے سے لڑنے

کی بجائے مخالف ملک کے باشندوں پر فضائی طاقت سے حملہ کر کے اور ان کے حوصلوں کو پست کر کے جنگ کو جلد از جلد ختم نہ کیا جائے یعنی لمبے عرصے تک لڑنے کے بجائے ہم ہوائی جہازوں کے استعمال سے کمتر مدت میں اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم دشمن کے چند شہروں کے باشندوں کو ہوائی بمباری سے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیں تو یقینی طور پر دشمن کے شہریوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ اور اس تجربہ کا اثر ان پر بہت گہرا اور دیرپا ہو گا۔ کیونکہ یہ تجربہ خود ان کو ہو گا۔ اور اس کا اثر یقینی طور پر اس خوف سے زیادہ ہو گا۔ جو وہ اپنے ملک کی فوجوں کی شکست کے بعد محسوس کرتے۔ لہٰذا اگر کسی ملک کی فضائی فوج ہار جاتی ہے اور اس کے مخالف ہوائی جہاز آسمان سے مسلسل آگ برسا کر اس کے صنعتی اور دوسرے ضروری وسائل اور اہم مقامات کو تباہ کر دیں اور باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں تو اس ملک کے عوام ضرور یہ خیال کریں گے کہ اب دشمن کی مزاحمت کرنا اور اس کے خلاف لڑنا بے سود ہے۔ اس لئے اب اس کے پاس صلح کی درخواست بھیجنی چاہیئے۔ یعنی ان باشندوں کو شکست کا احساس خود اپنے تجربہ سے ہو گا۔ ایک شہر کا یہ حال جب دوسرے شہر والے سنیں گے تو ان کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے+ ایسی صورت میں کوئی حکومت یا اس کی فوج اور پولیس رعایا کو جنگ جاری رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ بالخصوص اس وقت جبکہ اس ملک کے ذرائع آمد و رفت، وسائل خوراک اور دوسرے معاشی سلسلے بالکل ختم ہو گئے ہوں۔ یعنی ماضی میں حریف کی فوجی طاقت کو شکست دے کر اپنی فتح منوائی جاتی تھی۔ اس اصول کے باعث غیر مصافی باشندوں کو ہراساں اور بے خانماں کر کے حریف ملک کی حکومت کو بے دست و پا بنانا مقصود ہے+

ان اصولوں پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے دفاعی سیاسی اصولوں پر ان کا گہرا اثر پڑے گا۔ مگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ لڑائی کے دفاعی سیاسی اصول وہی رہیں گے جو پہلے تھے۔ البتہ ان کا طریق استعمال بدل گیا ہے۔ اس پر آگے چل کر تبصرہ کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ دیکھنا ہے۔ کہ اتحادیوں کی اس مقدس جنگ نے آہستہ آہستہ سارے بین الاقوامی قوانین کو

توڑ کر رکھ دیا۔ ان قوانین نے تمام قوموں کے شہروں شہریوں اور صنعتی مرکزوں پر گولہ باری یا بم باری جرم قرار دی تھی۔ مگر انہوں نے اس لڑائی میں ان کو پسِ پشت ڈال کر نہتے عوام پر ہوائی جہازوں سے آگ برسائی اور ایٹم بم گرائے اور اس طرح بلا عذر ان کو توڑ دیا +

یہ واقعات اس لئے بیان کئے گئے ہیں کہ عوام موجودہ مہذب اقوام کے عہد و پیمانِ بین الاقوامی قوانین کے احترام اور مقدس اعلانات کی نوعیت و اہمیت کو سمجھ سکیں۔ اور ان کا مقابلہ عہدِ نبوی کے حالات اور حرب و پیکار کے واقعات سے کر سکیں۔ نیز ایک طرف اپنے قابل ترین اور کامیاب ترین سالار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دفاعی سیاست و فنِ سپہ گری سیکھیں اور دوسری طرف آپ کی دفاعی سیاست کے ساتھ سیاسی مفاد کو سمجھیں۔ اسی طرح یہ معلوم کیا جا سکے گا کہ آنحضرتؐ نے ہمارے لئے اس حدیث میں کیا کیا ہدایات چھوڑی ہیں تاکہ ہم ان پر عمل کر کے ماضی و حال کے سیاسی و دفاعی ماہرین پر سبقت لے جائیں +

آج کل چونکہ جنگوں کا مقصد ہوتا کچھ ہے اور ظاہر کچھ کیا جاتا ہے اور اس میں انوکھا انداز اور انوکھی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ اس لئے جب جنگ ختم ہوتی ہے تو صلح کے وقت فاتحانِ جنگ نئی جنگ کی بنیاد ڈال دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا سے امن و سکون اُٹھ گیا ہے۔ اعتماد عنقا ہو گیا ہے۔ بے دینی بڑھ گئی ہے اور عہد و پیمان بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیرو اور مہذب کہلانے والی قومیں دفاعِ نبوی کا انصاف اور غیر جانبداری کی نظر سے مطالعہ کریں گی اور اس پر عمل پیرا ہو کر دُنیا سے تیسری عالمگیر جنگ کے چرچے ختم کر دینگی تاکہ امن و عافیت کی متاعِ گم گشتہ ہمیں پھر مل جائے +

دفاع اور ہم

اصولِ جنگ اور وسائلِ جنگ

جنرل فرانسس ٹوکر (Tucker) نے دوسری جنگ عظیم پر جو تبصرہ کیا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں "جب ہم پچھلی خوں ریز عالمگیر جنگ میں شامل ہوئے تو ہمیں اس بات کا قطعاً علم نہ تھا کہ یہ آگے چل کر کیا صورت اختیار کرے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ ۱۸-۱۹۱۴ کی جنگ کس طریقہ سے لڑی جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم کبھی یہ نہ معلوم کر سکیں گے کہ آئندہ کی لڑائیاں کن حالات میں لڑی جائیں گی۔ مگر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ جنگیں کس صورت سے لڑی جائیں گی۔ بلکہ یہ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آئندہ یہ دفاعی سیاست کے دائرہ میں کس طرح اور کن اصولوں پر لڑی جائیں گی۔ جنگ کا طریقہ ابتداء سے ایک اور خاص روایات کے سانچہ میں ڈھلا ہوا رہا ہے اور اس کے اندر نہایت غیر معمولی حالات میں بہت شاذ کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

اس تبدیلی سے اس کی مراد یہ ہے کہ پہلے لڑائیاں دو ملکوں کی حدود سے شروع ہوتی تھیں۔ آج کل ہوائی جہازوں کی مدد حاصل ہے۔ اس لئے حریف ملکوں کے اندرونی علاقوں سے شروع ہوتی ہیں اور طرفین اعلانِ جنگ کرتے وقت بلکہ اس سے پیشتر بھی دشمن علاقہ کے باشندوں اور شہروں پر ہوائی جہازوں سے بمباری کر سکتے ہیں۔ چونکہ پچھلی لڑائیوں کے واقعات اس بیان کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔ لہٰذا اس پر کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔

جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو عوام نے دفاعی مبصروں پر یہ الزام عائد کیا تھا

کہ انہوں نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا اور طریقِ جنگ کے متعلق وہ غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ بقول جنرل ٹوکر (Tucker) "ہم اپنی اس غلطی کو تسلیم کرتے ہیں مگر اس کی ذمہ داری کا بیشتر الزام ان سیاستدانوں پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے عوام سے اپنے اصل مقاصد کو پوشیدہ رکھا اور دنیا سے پکار پکار کر کہتے رہے کہ فوجیں کم کرو اور ہتھیار بنانا بند کر دو۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ کے سیاستدانوں نے سلطنت کے اندر اپنی فوجیں گھٹا دیں، اسلحہ ساز کارخانے بند کر دیئے اور عوام کے دلوں میں جنگ سے نفرت پیدا کر کے ذہنی، تعلیمی اور اخلاقی اعتبار سے ملک کو مفلوج کر دیا" ہمیں جنرل ٹوکر (Tucker) سے پورا پورا اتفاق ہے۔ ایک پاکستان نہیں سارا عالمِ اسلام خطرات سے گھرا ہوا ہے لہٰذا ان کے مقابلہ کے لئے ہمیں اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اربابِ دفاع کو جہاں صرف پریڈ گراؤنڈ کی فوجی نقل و حرکت میں مشغول رہ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیئے۔ وہاں عوام کے جہل و لاعلمی کو دور کرنے کی ضرورت کو بھی پوری طرح محسوس کرنا چاہیئے ان کی بیداری اور ارباب دفاع سے یہ ربط و تعلق اسی وقت پیدا ہو گا جب زمانۂ حال کی سائنس اور انجینیری کی نئی ایجادوں کو سامنے رکھ کر ان سے صحیح نتائج اخذ کئے جائیں گے۔

دفاعی سیاست

بعض طبقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ چونکہ ہمارے پاس ہتھیار کم ہیں اور اسلحہ سازی کے کارخانے موجود نہیں ہیں۔ اس لئے ہم کچھ کرنے سے معذور ہیں یہی وہ احساسِ کمتری و معذوری ہے۔ جسے دور کرنے کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنگی کارناموں کی حدیث پیش کرنے کی جرات کی گئی ہے۔ غور کیجیئے کیا آنحضرتؐ کی فوج اسلحہ اور مالی حالت کے اعتبار سے دشمنوں کے مقابلے میں کبھی عشر عشیر بھی تھی۔ پھر کیا آپؐ نے دل چھوڑا اہمت ہاری؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں ہاری؟ کیا کبھی ہم نے آپؐ کی دفاعی سیاست کا مطالعہ کرنے اور اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا کی ہے؟ دراصل ہماری پستی، کم ہمتی اور احساس کمتری کا سبب یہی ہے۔ قبل اس کے کہ اس سلسلے میں کچھ اور لکھا جائے۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دفاعی سیاست سے کیا مراد ہے۔

جرمنی کے مشہور دفاعی ماہر کلازوچ (Clause Witz) نے دفاع کے موضوع پر

اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں لکھا ہے: "دفاعی سیاست سے ہمارا منشاء یہ ہے کہ اپنے ملک کے مفاد کے لئے دشمن سے جنگ کریں یعنی دفاعی سیاست کے ماتحت جنگ کا مقصد اپنے ملکی مفاد کو دشمن سے منوانا ہے۔ دفاعی سیاست جنگ کے منصوبے کو اس طرح سانچے میں ڈھالتی ہے کہ جنگ میں جو مختلف لڑائیاں لڑی جائیں۔ وہ ایک ہی مقررہ تجویز کے مطابق لڑی جائیں۔ اس طرح دفاعی سیاست ان لڑائیوں کے نتائج حاصل کرنے میں بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہے"۔

جرمنی کا دوسرا مشہور جرنیل مالٹک (Moltke) اس کو اس طرح بیان کرتا ہے:
"دفاعی سیاست سے ہماری مراد ان دفاعی تجویزوں سے ہے۔ جن کو فوج کا سالار مفادِ ملکی کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے عمل کا جامہ پہناتا ہے"۔

موجودہ حالات میں دفاعی سیاست کی تشریح یہ ہو سکتی ہے کہ دفاعی سیاست وہ منصوبہ ہے جسے ملک کے سیاسی مفاد کے حصول کی خاطر فوجوں کی نقل و حرکت کیلئے بنایا گیا ہو۔ لیکن دفاعی سیاست کا مقصد فوجوں کی نقل و حرکت کا منصوبہ ہی بنانا نہیں ہے بلکہ اصل و بنیادی مقصد سیاسی مفاد کا حصول ہے۔ پھر جب اس منصوبہ کے ماتحت فوجوں کی نقل و حرکت شروع ہو جاتی ہے تو اس کو فنِ سپہ گری یا فنِ حرب کہتے ہیں۔ مگر دفاعی سیاست کے حدود کہاں ختم ہوتے ہیں اور فنِ سپہ گری کے کہاں ختم ہوتے ہیں اس میں بڑی موشگافی کی گنجائش ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے جس طرح دفاعی سیاست کا مقصد وقتی سیاسی پالیسی کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس طرح فنِ حرب و سپہ گری کا مقصد دفاعی سیاست کے تابع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وقتی سیاسی پالیسی بسا اوقات حکومت کی اصل اور مستقل پالیسی سے کسی قدر مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً یورپ کے طاقت کے توازن کے اصول کو چھوڑ کر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ کا نازیت کے خلاف "اعلانِ جہاد"۔ سیاسی پالیسی کا مقصد محض لڑائی جیتنا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اختتامِ جنگ پر اپنے سیاسی مفاد اور دوسرے ملکوں کے سیاسی حالات پر نظر رکھنا بھی تھا۔ مگر جب سیاسی پالیسی اس منصوبہ پر عمل نہیں کرتی تو اسے وقتی سیاسی پالیسی کہہ سکتے ہیں اور اس وقتی سیاسی پالیسی اور دفاعی سیاست کے مقاصد میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ یعنی وقتی سیاسی پالیسی اور دفاعی سیاست مستقل سیاسی پالیسی کے تابع ہوتی ہیں۔

سیاسی پالیسی کا منصوبہ پہلے اس امر کا یقین کر لینا ہے کہ ملک کے ہر قسم کے وسائل، جنگ کے سیاسی مفاد کے .... حصول کے لئے جمع کئے جا سکیں گے۔ اس طرح ملک کے مالی اقتصادی اور صنعتی وسائل کو انتہائی ترقی دی جاتی ہے۔ عوام کو ملک کی خاطر ایثار و قربانی کے لئے تیار ...... اور دشمن کا .... آخری دم تک مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے لڑنے والی فوجوں کو ہر طریقہ سے مدد دی جاتی ہے اور یہ مدد دفاعی سیاست کے منصوبے کے تحت برّی بحری اور ہوائی فوجوں کو متناسب و متوازن طور پر ملتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی منصوبے کے ماتحت دشمن پر مالی اور اخلاقی دباؤ ڈالنا بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ اس کے حوصلے پست ہو جائیں اور مقابلہ کرنے کی ہمت نہ رہے اسی طرح دشمن کو شکست دینے کی ساری تدبیروں پر غور کر کے عمل کے تمام ضروری طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دورانِ جنگ میں اور اس کے اختتام پر اعتدال کو اس طرح راہ دی جائے کہ امن و امان اور خوشحالی و فارغ البالی یقینی ہو جائے سیاسی منصوبہ میں آغازِ جنگ سے قبل اور اس کے دَوران میں ان باتوں پر برابر غور کیا جاتا ہے۔

فنِ سپہ گری اور دفاعی سیاست

اگرچہ دفاعی سیاست اور فنِ سپہ گری کے درمیان حدودِ فاصل کا قائم کرنا دشوار ہے۔ تاہم ذہنی طور پر یہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ فنِ سپہ گری کا مقصد دشمن سے لڑنا ہے اور دفاعی سیاست کے منصوبے کا نظریہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم لڑائی لڑے بغیر دشمن کی فوج کا حوصلہ توڑ دیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ دفاعی سیاست اس وقت نہایت ہی بلند پایہ تصور کی جاتی ہے۔ جبکہ دشمن پست ہو کر بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیتا ہے اس کی مثال عالمگیر جنگِ ثانی میں جرمن فوجوں کی وہ نقل و حرکت تھی۔ جس کی وجہ سے بلجیم کے علاقہ کی اتحادی فوج معطل ہو گئی تھی اور بعد کو ڈنکرک سے جان بچا کر بھاگی تھی۔ دوسرے نظریہ کی مثال آنحضرت صلعم کی فتح مکہ ہے۔ اس حملہ میں آنحضرتؐ کا منصوبہ ایسا تھا۔ کہ مسلم فوج کے دفعتہً نمودار ہونے پر کفار ہیبت زدہ ہو گئے اور ان کی ہمت اتنی پست ہوئی کہ انہوں نے بغیر لڑے

شکست تسلیم کر لی۔

در اصل یہ منصوبہ ایک ایسی فوجی چال کا نتیجہ ہوتا ہے جو فطری اور قابلِ تسلیم منطق کے اصول کے مطابق دشمن پر شکست کے اثرات طاری کر دیتا ہے۔ مثلاً

۱۔ دشمن کے پشت کے راستے جن سے وہ بصورتِ شکست پیچھے ہٹ سکے کاٹ دیئے جائیں یا فنِ حرب کے مطابق ایسی نقل و حرکت کی جائے کہ دشمن کے نقشۂ جنگ یعنی محاذ کی سمت دفعتہً تبدیل ہو جائے یا اس کے فوجی نظام میں گڑ بڑ پیدا ہو جائے۔

۲۔ فوجی نقل و حرکت ایسی ہو کہ دشمن کی فوج چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جائے اور وہ مجتمع ہو کر حملہ نہ کر سکے۔ یا پھر اس کی رسد رسانی کا انتظام خطرے میں پڑ جائے اس قسم کی ہر فوجی نقل و حرکت دشمن کے دل میں بزدلی پیدا کر دیتی ہے اور عام طور پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ لیکن مفصلہ بالا حالات زیادہ مؤثر اس وقت ہوتے ہیں جب مختلف طریقے اس اثر کو پیدا کرنے کے لئے بیک وقت اختیار کئے جائیں یعنی اچانک حملے کے ساتھ اس کو مغالطہ کا شکار بھی بنایا جائے تاکہ دشمن بے بس ہو کر ہمت ہار دے اور اس کا دفاع مبہوت ہو کر کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہے۔

میدانِ جنگ میں ہر ایک محاذ دو رخ لئے ہوئے ہوتا ہے اور دفاعی اصولوں کے استعمال کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ کس وقت کون سے طریقہ سے کام لینا مناسب ہے۔ اس کا فیصلہ حالات کے مطابق فوجی کمانڈر کرتا ہے۔ جنگ میں حملہ اور بچاؤ کا سوال پہلو بہ پہلو رہتا ہے۔ مثلاً تلوار سے لڑتے وقت ڈھال کا استعمال ہوتا تھا اور طرفین کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حریف پر ایسی جگہ وار کیا جائے۔ جہاں وہ بچاؤ نہ کر سکے یا ایسے وقت کیا جائے۔ جبکہ بچاؤ کے معاملہ میں اس کے خیالات منتشر ہوں۔ اسی طرح اگر دفاعی منصوبہ کے ماتحت اپنی فوجیں زبردست طاقت میں کسی ایسی جگہ جمع کر دی جائیں جہاں دشمن کی فوجیں بکھری ہوئی ہوں، تو اس پر کارگر وار کیا جا سکتا ہے۔ عملی اعتبار سے ہر منصوبہ ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ حصولِ مقصد کے لئے حسبِ موقع و حالات اس میں تبدیلی کی جا سکے۔ اس طرح نہ صرف دشمن فریقِ مخالف کے ارادوں سے بے خبر رہتا ہے۔ بلکہ مختلف تدابیر کے رد کرنے کی فکر میں اس پر انتشار کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور اس طرح خالی جگہ پا کر اس پر پوری طاقت سے وار کیا جا سکتا ہے۔ یہی اصول طریقِ کار حرب و ضرب میں بھی عمل میں لانا چاہیئے

البتہ اس وقت چونکہ دونوں فوجیں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں اس لئے دشمن کو زیادہ بے خبر نہیں رکھا جاسکتا۔ پھر بھی مقابل فوج کے اس حصہ پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں اس کا مورچہ بہت کمزور ہو۔ جس طرح درخت کے تنے پر شاخیں نہ ہونے سے اس پر پھول پھل نہیں آتا۔ اسی طرح اگر دفاعی منصوبہ میں جدت طرازی نہ ہو تو نتیجہ حسبِ مراد نہیں نکلتا۔ جنگ سے جس حکومت کا سیاسی مقصد محض حصولِ فتح ہو گا۔ اور وہ مابعد جنگ کے حالات وواقعات پر غور نہیں کرے گی تو اس کا انجام خود اس کے حق میں بربادکن ثابت ہوگا۔ کیونکہ ایسے مقصد میں آئندہ جنگ کے جراثیم پنہاں ہوتے ہیں پھر اگر کوئی حکومت جنگ کے سیاسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی بساط سے زیادہ دولت وطاقت صرف کرتی ہے تو وہ تھک کر اس قدر چکنا چور ہو جاتی ہے کہ فتح وبالِ جان بن جاتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جنگ ۴۵ - ۱۹۳۹ ہی کو لیجئے۔ فاتح برطانیہ اور فرانس کی مالی حالت ابھی تک تشویشناک ہے حالانکہ مفتوح جرمنی وجاپان بالکل فنا ہو چکے ہیں۔

جب مختلف حکومتیں آپس میں متحد ہو کر کسی دشمن سے لڑتی ہیں تو ایسی لڑائی میں اندرونی طور پر بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ابتدا میں اتحادی سب یکجہت اور ہمخیال ہوتے ہیں۔ مگر جیسے جیسے جنگ طویل پکڑتی جاتی ہے باہم مختلف قسم کی الجھنیں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور ایسا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ان کے سیاسی، تجارتی، اخلاقی، تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی مفادات کچھ نہ کچھ اور کہیں نہ کہیں مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ اور امتدادِ وقت کے ساتھ اکثر یہ اختلافات بڑھتے ہی رہتے ہیں کم نہیں ہوتے۔ اس لئے فاتح ہونے کی صورت میں بھی صلح کی شرطیں کبھی تسلی بخش نہیں ہوتیں۔ پچھلی عالمگیر جنگوں کے تجربات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی صلح آئندہ جنگ کا پیش خیمہ بنی۔ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کی شرائطِ صلح پر تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ ۴۵-۱۹۳۹ء کی صلح کے نتائج دیکھئے اتحادی مستقل طور پر دو گروہوں یا بلاکوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور تیسری جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ تاریخ میں عبرت کے لئے ایسی اور بھی مثالیں ہیں۔ مگر پھر بھی دنیا کی نظر میں اس صورتِ حال کا کوئی علاج اور اس مشکل کا کوئی حل نہیں۔ اتحادی جنگ کے حصول کے ماتحت ایک ملک باقی سب ملکوں سے زیادہ طاقتور بن جاتا ہے۔ اس لئے

ان دوسرے ملکوں کو اس سے حسد پیدا ہوتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد روس اور امریکہ کی طاقت واقتدار کی پیچیدگیاں ہمارے سامنے ہیں +

حریص و قانع حکومتیں

دنیا میں دو قسم کی حکومتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو اپنے حدود اور موجودہ سیاسی مفاد پر قانع ہیں۔ خواہ اس قناعت کی وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری وہ جو اپنے حدود اور دوسرے مفادات کو بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ قانع حکومت ایک خاص حد کے بعد حریف سے صلح کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ مگر حریص حکومت دشمن کی مکمل تباہی اور قطعی فتح حاصل کرنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ ان حالات میں سیاسی پالیسی کے اعتبار سے گو بظاہر دونوں اتحادی ہو سکتی ہیں۔ مگر فی الحقیقت وہ ایک نہیں ہوتیں۔ اس لئے دفاعی سیاست کا منصوبہ بھی بدلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ جنگ کے مقاصد اور فاتح کی شرطیں بھی اور چونکہ حرص کا بڑھتا رہتا ہے۔ اس لئے اتحادیوں میں اختلاف رائے لازمی ہو جاتا ہے۔

ان نتائج پر جب قانع حکومت نظر ڈالتی ہے تو بسا اوقات وہ اپنی سیاسی پالیسی کو محض بچاؤ قرار دیتی ہے تاکہ نہ جھگڑا مول لے اور نہ مشکلات میں گرفتار ہو۔ اس کی اصل غرض امن سے زندگی بسر کرنا ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس قسم کے سیاسی مفاد کے لئے کس قسم کا دفاعی منصوبہ اور کیسی سیاست صحیح اور صائب ہوگی؟ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تب بھی ہم فوراً کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ یہ حکومت بچاؤ چاہتی ہے لہذا دفاعی نظریہ سے صرف اپنے ملک کی حفاظت کرنی چاہیئے اور اس بناء پر منصوبہ بنانا چاہیئے۔ بالخصوص اس لئے کہ اس میں اسے ملک کا بہت کم روپیہ صرف کرنا پڑے گا۔ مگر تاریخ کہتی ہے کہ جس حکومت نے اس دفاعی نظریہ پر عمل کیا وہ نابود ہو گئی۔ ایرانی حکومت چنگیز خاں کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ ہندوستان کے راجا محمود غزنوی کے حملوں سے پس گئے۔ فرانس ۱۹۳۹ء میں مجینو لائن پر تکیہ کئے محو خواب رہا اور اس وقت جاگا۔ جب جرمنی اس پر قابض ہو چکا تھا۔ یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ لیکن وہ ملک جنہوں نے اپنے بچاؤ کا اصول یہ رکھا کہ اگر کوئی غیر ملک ان پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ اینٹ کا جواب پتھر سے

دیں گے۔ انہوں نے ہمیشہ عزت و عافیت کی زندگی بسر کی +

برطانیہ کا نظریہ ۱۹۱۴ئہ تک بڑی حد تک یہی رہا اور اسے اس نے یورپ کے ملکوں میں نہایت پابندی سے برتا۔ اس نے متعدد بار یورپی ملکوں سے مل کر مختلف جنگوں میں حصہ لیا۔ مگر فتح حاصل ہونے کے بعد یورپ کے کسی حصہ پر کبھی قبضہ نہیں کیا بلکہ طاقت کے توازن کے اصول پر سختی سے کاربند رہا۔ مگر جب وہ اس اصول سے الگ ہوا تو اس کے نتائج ظاہر ہیں کسی تشریح کے محتاج نہیں +

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس اصول پر پوری پابندی سے عمل کیا۔ اس پر آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔ البتہ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اس اصول پر عمل کرنے والی حکومت پر لازم ہے کہ وہ اپنی فوج کو پوری تربیت دے کر تیار رکھے۔ تاکہ وہ ہر طرف اور ہر قسم کے ملک میں آسانی اور قابلیت کے ساتھ نقل و حرکت کر سکے۔ تاکہ اس سے پیشتر کہ دشمن کوئی خطرناک کارروائی کرے اس کی فوج اسے تتر بتر کر سکے +

حریص حکومتوں کی مثالیں نپولین اور ہٹلر کے عہدِ اقتدار سے بہتر کیا ہو سکتی ہیں انہوں نے فتوحات کی بڑی بڑی امیدوں میں اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ طاقت کا غرور انتہائی خطرناک ہے۔ اگر طاقت کو صحیح طریقہ سے استعمال نہ کیا جائے تو طاقتور کی طاقت خود اسی کو برباد کر دیتی ہے۔ اگرچہ طاقت پر بھروسہ اور لڑنے کا جذبہ حصول فتح کے لئے لازمی شے ہے۔ لیکن ان حالات میں بھی وہ شخص یا وہ جرنیل جو حوصلہ و استقلال سے کام لیتا ہے۔ اس بہادر سے بدرجہا بہتر و فائق تر ہے جو جوش سے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اشتعال پذیر سیاسی لیڈر اور سالارِ فوج ملک اور فوج کے لئے سخت خطرناک ہیں سیاستدان اور فوج کے سالار کو بردبار اور دور اندیش ہونا چاہیئے۔ انہیں عظیم الشان فتح کی بجائے مستقبل کے پائدار امن کو ترجیح دینی چاہیئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب پرامن قومیں جنگ پر مجبور ہو جاتی ہیں تو جارحانہ اقدامات کرنے والی قوموں سے بڑی سختی سے لڑتی ہیں اور جارحانہ اقوام مقابل کو طاقتور دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ مگر امن پرور قومیں اڑ جاتی ہیں اور آخری دم تک لڑتی ہیں اور بعض اوقات انتقام پر بھی اتر آتی ہیں ایسی صورت میں ان قوموں کے لیڈروں کو احتیاط اور مآل اندیشی سے کام لینا چاہیئے اور جلد از جلد عارضی صلح کر کے جذبۂ اشتعال پر قابو پانا چاہیئے +

یہاں ارباب سیاست و حکومت کی دشواریوں پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے دفاعی سیاست کو جامۂ عمل پہنانے والے یعنی فوجوں کے سالار انہی سیاستدانوں کے احکام بجا لاتے ہیں۔ اس طرح سرسری نظر ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں عوام و حکومت میں ربط و یکجہتی ضروری ہے۔ وہاں ان کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے والوں پر اعتماد رکھنا بھی لازمی ہے۔ ان کو ہر وقت حالات سے باخبر رکھنا چاہیئے تاکہ وہ ان کے احکام پر عقلمندی، دور اندیشی، اور قابلیت کے ساتھ عمل کر سکیں۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں شیخ سعدی کی یہ نصیحت بھی بڑی اہم اور قابلِ توجہ ہے کہ ؎

نہ دہد مردِ سپاہی را تا جاں بدہد
گر زر نہ دہی سر نہ دہد در عالم

یہ نظریہ دفاعی حدیث کا ہے یا صرف شیخ سعدی کا۔ اس پر آگے چل کر تبصرہ کیا جائے گا۔

ملکِ عرب کی جغرافیائی حیثیت

عرب ایک جزیرہ نما ہے۔ خلیج فارس کی طرف سطح کا ڈھلان وسعت کی وجہ سے بہت کم ہے مگر بحیرۂ قلزم کے ساحل پر بالکل کھڑا اور بیڈھب سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سطح مرتفع مغربی ساحل کی طرف ہے۔ بحیرۂ قلزم سے ملحقہ علاقہ کا شمالی اور جنوبی حصہ اونچا ہے۔ مثلاً یمن اور میدان کا علاقہ جو سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے وسطی علاقہ دو ہزار فٹ کی اونچائی پر ہے لیکن مکہ معظمہ کا مغربی علاقہ ایک ہزار فٹ اونچا ہے بعض مقامات پر مثلاً خیبر میں بعض پہاڑ آٹھ ہزار فٹ تک بلند ہیں۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بحیرۂ قلزم کے ساحل کی طرف اور اس کے برابر برابر پہلے ایک اونچی پہاڑی ہے۔ پھر اس کے اور ساحلِ سمندر کے درمیان ایک اور کم اونچی پہاڑی ہے جو ساحل کے برابر چلی گئی ہے۔ یہاں نباتات بہت کم نظر آتی ہے۔ اگر کچھ ہے بھی تو سورج کی تپش سے جھلسی ہوئی پژمردہ۔ اگرچہ یہ خطہ بنجر ہے مگر تاریخ میں مشہور ہے۔ یہی وہ خطہ ہے جس کا نام توریت میں اردیہ ہے۔ اسی کے صحراؤں میں بنی اسرائیل نے سرزمین مصر میں پہنچنے سے پہلے برسوں چکر کاٹے تھے۔ یہیں جبلِ طور کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ جس پر چڑھ کر حضرت موسیٰؑ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتے تھے اور جہاں سے بنی اسرائیل کے لئے قانون لاتے تھے۔ یہیں وہ پتھر ہے جس میں عصائے موسیٰؑ کی ضرب سے چشمہ جاری ہوا تھا۔ اور اسی ارضِ مقدس میں شہر پٹرا کے ویرانے ہیں:

حجاز

حجاز اسلام اور تمدنِ اسلام کا گہوارہ اور ملکِ عرب کا ایک صوبہ ہے اور طبعی اعتبار

سے پانچ حصّوں میں منقسم ہے اور یہ پانچوں حصّے ایک دوسرے کے متوازی واقع ہوئے ہیں +

ا۔ ساحل کے برابر کا علاقہ جو بہت ریتیلا ہے۔ اس میں مونگے کی چٹانیں ہیں۔ اور بعض جگہ مثلاً میدانی علاقہ بہت کم چوڑا ہے۔ زمین ساحل سمندر کے برابر اور ہم سطح ہے +

ب۔ پہاڑی علاقہ جو شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کی اونچائی شمال سے جنوب کی طرف برابر کم ہوتی جاتی ہے۔ مکہ معظمہ کے قریب یہ پہاڑ دو ہزار فٹ بلند ہے +

ج۔ شمالی حصے کی سطح مرتفع۔ یہاں آتش فشاں پہاڑ کا پگھلا ہوا مادہ ہے جس کی وجہ سے اس پہاڑ پر گہرے نالے نہیں ہیں۔ مگر اس کی ڈھلوان بھی جنوب کی طرف ہے۔ مکہ معظمہ اور طائف کے مغرب کی طرف اس کی بلندی سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ رہ جاتی ہے +

د۔ بڑا پہاڑ۔ یہ ان مقامات پر زیادہ بلند ہے۔ جہاں اس کی چوٹیوں پر لاوا جما ہوا ہے۔ مثلاً حمہ اور خیبر میں جہاں اس کی بلندی علی الترتیب چھ ہزار اور آٹھ ہزار فٹ ہے۔ مگر مکہ معظمہ کے قریب صرف پانچ ہزار فٹ کے قریب رہ جاتی ہے +

ہ۔ مشرقی ڈھلوان کا سب سے بلند حصہ جو وسطی عرب کی طرف نشیب لئے ہوئے ہے

حجاز میں آباد مقامات بہت کم ہیں۔ قصبہ اور شہر مفصلہ بالا (ا) اور (ج) کے علاقوں میں ہیں مثلاً ینبع اور جدہ وغیرہ پہلے حصہ میں ہیں اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ (ج) میں ہیں خیبر اور طائف وغیرہ دوسرے حصّوں میں واقع ہیں +

بڑی بڑی وادیاں جن میں برساتی نالے بہتے ہیں۔ بڑے پہاڑ سے شروع ہوتی ہیں اور تیسرے علاقہ (ج) سے گذرتی اور دوسرے حصہ کو کاٹتی ہوئی سمندر میں جاکر ختم ہو جاتی ہیں۔ ان وادیوں میں مستقل طور سے پانی نہیں رہتا۔ البتہ بارش کے زمانہ میں کبھی کبھی زبردست سیلاب آجاتا ہے +

بڑے پہاڑ کے شمالی جانب ڈھلوان وادیاں بہت زیادہ گہری اور ڈھلان لئے ہوئے ہیں۔ یہ یکے بعد دیگرے بحیرۂ وسطیٰ میں جاکر ختم ہوتی ہیں +

ان وادیوں کی وجہ سے سارا ملک بہت بری طرح کٹ گیا ہے۔ جس سے آمد و رفت بہت دشوار ہے۔ اور اسی سبب سے حجاز میں نقل و حمل زیادہ تر شمال سے جنوب کی طرف

ہوتی ہے۔ تجارتی راستے یا تو سمندر کے برابر برابر ہیں یا پھر علاقہ (۸) میں ہیں یہ راستے شام سے آتے ہیں۔ زائرین زیادہ تر انہی کو استعمال کرتے ہیں۔ حجاز ریلوے بھی اسی راستے پر بنائی گئی ہے۔ ان وادیوں کی وجہ سے مشرق سے مغرب کو آمد و رفت بہت مشکل ہے۔ پھر چونکہ ان کے کنارے بہت زیادہ ڈھلوان ہیں۔ اس لئے زراعت کے لئے بیکار ہیں۔ حجاز کا وہ علاقہ جسے میدان کہتے ہیں اس وجہ سے بہت کم آباد ہے۔ اور اس کے متعلق باہر کی دنیا کو بہت کم معلومات ہیں۔ البتہ کم بلندی کے علاقوں میں یہ وادی زیادہ گہری نہیں ہے اور اس کے کنارے زیادہ ڈھلان لئے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لئے یہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔

وادیوں میں سب سے زیادہ مشہور حمد کی وادی ہے۔ یہ شہر ویجہ (Wejh) کے جنوب سے کچھ میل دور شروع ہوتی ہے۔ جہاں دو نالے ایک خیبر سے اور دوسرا ادیرِدہ (Aweiridh) سے نکل کر ملتے ہیں۔ اس وادی سے مدینہ منورہ کی کاریزوں کو پانی ملتا ہے اور اسی کی وجہ سے مدینہ کے قرب و جوار میں بہت سے نخلستان ہیں۔ دوسری مشہور وادیاں وہ ہیں جو عملیج (Umlejh) ینبع Yambo رابغ Rabugh قذیمہ Qadhimah جدہ Jiddah اور لیتھ (Lith) کے قرب و جوار سے نکلتی ہیں۔ ان کی وجہ سے نہ صرف ساحل کے برابر برابر جگہ جگہ نخلستان ہیں۔ بلکہ تہامہ Tihamah اور مکہ مدینہ کے درمیانی علاقوں میں بھی ملتے ہیں لیکن ان نخلستانوں میں مستقل آبادیاں یعنی بڑے بڑے قصبے نہیں ہیں۔ بلکہ ان پر آس پاس کے قبائل کا قبضہ ہے۔

جنوبی حجاز کی وادیاں چونکہ گہری نہیں ہیں۔ اس لئے ان سے آمد و رفت میں زیادہ رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ وادئ حمد مدینہ کے جانب جنوب مکہ کی طرف حجاج کی آمد و رفت کے لئے بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسری وادیاں مثلاً مدینہ سے ینبع کے مابین اور جدہ و مکہ کے مابین استعمال ہوتی ہیں۔ اسی طرح کچھ وادیاں ساحل کے راستوں کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

عمومی طور پر حجاز کو غیر آباد اور بنجر علاقہ کہا جاسکتا ہے۔ نخلستان کم ہیں۔ ساحل کے اس حصہ کے علاوہ جہاں وادیاں سمندر میں داخل ہوتی ہیں۔ باقی ساحل پر سب جگہ مونگے کے پہاڑ ہیں۔ وہاں ہر وقت باریک ریت اڑتی رہتی ہے۔ پہاڑ خشک ہیں۔ نباتات بہت

ہی کم ہے۔ البتہ کہیں کہیں چونے کے پتھر ملتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور درخت بھی نظر آتے ہیں۔ حجاز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بنجر ہونے کی وجہ سے یہ شمالی حصّے یعنی نجد اور ساحلی علاقوں کے درمیان ایک رکاوٹ ہے۔ حجاز کے معنی ہی رکاوٹ کے ہیں؛

حجاز کے بڑے بڑے شہر طائف مکہ اور مدینہ ہیں؛

طائف :۔ چھ ہزار فٹ کی بلندی پر نہایت سرسبز و شاداب مقام ہے۔ صحت افزاء اور آب و ہوا اور خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ آج کل سعودی حکومت کا صدر مقام ہے۔ طائف کا گلاب اور اس گلاب کا عطر آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے بھی مکہ معظمہ کی تمام تقریبوں میں استعمال ہوتا تھا۔ انگور کی شراب مشہور ہے اور زمانۂ قدیم سے بنتی چلی آئی ہے۔ شہد، کیلہ، انجیر، انگور، زیتون، آڑو، اور تربوز وغیرہ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی شادابی و خوبصورتی اور پیداوار کی وجہ سے عرب اسے بہشت کہتے ہیں؛

مکہ معظمہ :۔ یہ قدیم ترین شہر ہے اور اُمّ القریٰ کہلاتا ہے۔ اسلام کا آفتاب یہیں سے طلوع ہوا۔ زمانۂ قدیم سے مقدس سمجھا جاتا ہے۔ بحرِ احمر سے تقریباً ۴۸ میل دور ایک بنجر پہاڑ کی وادی میں واقع ہے جو موسم گرما میں بے حد زیادہ گرم ہو جاتی ہے۔ پُرانے زمانے میں گرم مسالے کی تجارت کا مرکز تھا جو ہندوستان اور ملایا وغیرہ سے ہوتی تھی۔ خشکی کے راستے سے شام و یمن کو اسی شہر میں سے ہو کر جاتے تھے۔ یہودی تاجر زیادہ تعداد میں آباد تھے۔ کھجور کی تجارت بھی خوب ہوتی تھی۔ تجارت کی گرم بازاری کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بدر کی جنگ قریش کے جس تجارتی قافلہ کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے اونٹوں پر ۵۹۰۰ ہزار دینار کا مال لدا ہوا تھا +

مکہ کے لئے تمام سامانِ خوراک اور دوسری چیزیں باہر سے لائی جاتی ہیں۔ صنعت و حرفت کچھ نہیں ہے؛

مدینہ منوّرہ :۔ آغازِ اسلام سے پہلے اسے یثرب کہتے تھے۔ یہ مکہ سے تقریباً ۳۰۰ میل کے فاصلہ پر شمال کی طرف واقع ہے۔ یہ بھی مکہ کی طرح گرم مسالہ کی تجارت کا مرکز تھا۔ جب حکومتِ روما نے فلسطین کو فتح کیا تو بہت سے یہودی یہاں آکر بس گئے۔ انہوں نے تجارت و زراعت میں بہت ترقی کی۔ کھجور کے بہت سے باغات کے مالک تھے۔ یورپین

مورخوں کا قیاس ہے کہ پہلے انہی یہودیوں نے یثرب کو مدینہ کہا۔ آنحضرت صلعم کی ہجرت کے بعد سے اسے مدینۃ النبی یا مدینہ منورہ کہا جاتا ہے۔ ینبوع یہاں سے ۱۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے +

آب و ہوا۔ حجاز میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ باقی حجاز کے مقابلہ میں میدان میں کسی قدر زیادہ بارش ہوتی ہے۔ مکہ میں بارش گرمی کے موسم میں طوفان باد' بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک کے ساتھ ہوتی ہے۔ بارش کا پانی تیزی سے وادیوں میں سے بہتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔ ایک دو روز تک نالے ناقابل عبور رہتے ہیں۔ پھر خشک ہو جاتے ہیں۔ طائف میں بارش کافی ہوتی ہے۔ مگر وہاں برسات کا کوئی موسم نہیں ہے +

مکہ معظمہ سطح سمندر سے صرف ۸۰۰ فٹ بلند ہے۔ اردگرد کے پہاڑ خشک اور بنجر ہیں۔ اس لئے یہاں کی آب و ہوا بہت گرم ہے۔ موسم گرما میں یہ علاقہ تنور کی طرح پھکتا ہے +

اس کے مقابلے میں مدینہ منورہ کا درجہ حرارت موسم گرما میں شاید ۷۰ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے صحت کے لئے اس کی آب و ہوا تمام سال بہت اچھی رہتی ہے مکے میں اور نشیب کے علاقہ کے نخلستانوں میں بخار بہت پھیلتا ہے۔ مکہ میں ہیضہ اور وبائی امراض کی شکایت عام ہے مکے اور طائف کے اردگرد کے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر کبھی کبھی برف بھی پڑتی ہے اور پانی جم جاتا ہے اور ایسا گرمی کے زمانے میں بھی ہوتا ہے۔ اس کا کوئی خاص موسم نہیں ہے مکے میں دن کے وقت جہاں سخت گرمی ہوتی ہے وہاں راتیں ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی ہیں +

حجاز کی بادِ خمیس بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ قافلے والے جب آسمان پر افق کی جانب سرخی دیکھتے ہیں تو اسے بادِ خمیس کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ سرخی کے بعد تاریکی اور پھر زردی نظر آتی ہے اور سارے علاقہ پر باریک ریت چھا جاتی ہے۔ جیسے ہوا اس طرح پھیلاتی ہے جس طرح طوفان سمندر کے جھاگ کو اڑاتا ہے صحرا کی ریت ہوا سے اڑ اڑ کر لہریں پیدا کرتی ہے۔ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ ہونٹ سوکھ جاتے ہیں' اونٹ انتہائی پریشانی میں ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں اور ہار کر تھوتھنیوں کو زمین پر مارنے لگتے ہیں۔ انسان و حیوان سب کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ گرمی کی شدت انہیں بدحال کر دیتی

ہے۔ ریت کے نئے پہاڑ بن جاتے ہیں اور راستہ بھولنا بہت آسان ہو جاتا ہے اس بادِ خمیس کی وجہ سے بہت سے جانور اور مسافر ہلاک ہو جاتے ہیں +

میدان - اس علاقہ سے حجاز کا وہ حصہ مراد ہے جسے عوام جبل میدان کہتے ہیں یہ شمال مغربی ساحلی علاقہ ہے لیکن اس سے مراد درحقیقت اس علاقہ سے ہے۔ جو ۳۰ درجہ شمالی عرض البلد کے مابین واقع ہے +

یہ علاقہ بہت دشوار گذار اور پہاڑی ہے۔ اس میں ایسی مستقل بستیاں جنہیں عام دیہات سے بڑا کہا جا سکے بہت ہی کم ہیں اور جو ہیں وہ عموماً ساحل سمندر کے برابر ہیں۔ حجاز ریلوے اسی علاقہ میں ہے۔ معان (Máan) سے دار الحمرہ (Darul Hamra) تک جو تقریباً ۲۵۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ بجز تبوک (Tebuk) کے کوئی بستی نہیں ہے جہاں ریلوے اسٹیشن ہیں وہاں چند جھونپڑیاں نظر آتی ہیں۔ تبوک (Tebuk) میں تقریباً ۳۰۰ نفوس کی آبادی ہے۔ ساحلی علاقہ سات میل سے ۱۵ میل تک چوڑا ہے اور نہایت باریک قسم کے ریت سے پٹا ہوا ہے۔ جہاں برساتی نالے (وادی) سمندر میں ملتے ہیں وہاں کچھ کھیتی باڑی نظر آتی ہے۔ ان نالوں میں مصر سے آنے والے قافلوں نے اپنے لئے پانی کے کنوئیں کھود لئے ہیں۔ سب سے بڑا نخلستان سارما (Sarma) ہے۔ اس علاقہ کے مشہور قصبے یہ ہیں +

عقبہ (Akaba) یہ قصبہ خلیج عقبہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ جس کا قطر تقریباً تین میل ہے۔ اس کے کونے شمال اور شمال مغرب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خلیج کے دہانے کے قریب ساحل بہت نیچا ہے۔ اور جہاں نالہ عرابہ (وادی) سمندر میں داخل ہوتا ہے وہاں کناروں پر ریت کے اونچے اونچے ٹیلے ہیں۔ عقبہ میں شاید پچاس ساٹھ مکان ہیں ترکوں کے زمانہ سے وہاں پولیس کی ایک چوکی اور ایک تار گھر قائم ہے اور ایک فوجی دستہ بھی رہتا ہے۔ نواح میں کچھ نخلستان ہیں مگر یہاں ماہی گیروں کی کشتیاں نظر نہیں آتیں۔ آب ہوا خراب ہے۔ بخار کی شکایت عام ہے۔ میٹھے پانی کا صرف ایک کنواں ہے۔ وہ بھی آبادی سے باہر۔ اس سے سب لوگ پانی پیتے ہیں۔ باقی سارے کنوئیں کھاری ہیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا قلعہ بھی ہے۔ جس میں مصر کے قافلۂ حجاج کے لئے غلّہ وغیرہ جمع رہتا ہے قلعہ کی غربی سمت کو جہازوں کے لئے ایک دقیانوسی سی گودی بنی ہوئی ہے +

مویلح (Muweilah) عقبہ سے تقریباً ۱۵۰ میل جنوب کی طرف ہے۔ اس گاؤں میں تقریباً ۵۰ مکانات ہیں۔ یہ حجاج مصر کی قیامگاہ اور بدوؤں کا تجارتی مرکز ہے۔ قریب ہی کھجوروں کے کچھ باغ ہیں۔ پینے کا پانی وادی میں کنواں کھود کر حاصل کیا گیا ہے۔ گو پانی کافی ہے۔ مگر قدرے کھاری ہے۔ بھیڑیں کثرت سے پالی جاتی ہیں ساحل بہت نیچا ہے۔ سمندر سے اندرونی علاقہ کی طرف جائیں تو بہت اونچی پہاڑیاں ملتی ہیں۔ گاؤں کے پاس کوئی بندرگاہ نہیں ہے۔ مگر مونگے کی پہاڑ کی پشت پر کشتیوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے لیکن وہاں سمندر کی طرف سے پہنچنے کا راستہ بہت دشوار گذار ہے اور تیز ہوائیں تو بالکل ناممکن ہے یہاں سے ایک راستہ مدینہ منورہ کو جاتا ہے۔ مویلح کے علاوہ اس علاقہ میں ضبا (Dhaba) جیسے اور بھی چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔

ساحل سمندر پر میدانی حصے کے عقب میں جہاں خلیج عقبہ واقع ہے۔ زمین یک لخت چار ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر بحیرۂ احمر کے قریب ۷ ہزار اور ۹ ہزار فٹ تک اونچے پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں کے عقب میں سطح مرتفع چھ ہزار فٹ بلند ہے۔ ان پہاڑوں اور سطح مرتفع کا درمیانی حصہ ریتیلے پتھر کا ہے۔ جس میں درخت اور جھاڑیاں بہت کم ہیں۔ اس کے پیچھے اونچا میدان ہے جس میں سرخ رنگ کی ریت ہے۔ اس علاقہ میں جو تقریباً ۵۰ میل چوڑا ہے۔ کہیں کہیں اونچے ٹیلے ہیں۔ جنہیں یہاں کے باشندے حسمیٰ (Hisma) کہتے ہیں۔ میدان کے جنوب مشرقی سمت کو خشک گنجی پہاڑیاں ہیں۔ جن کی لاوا جمی ہوئی چوٹیاں آس پاس کے علاقہ سے ۱۴۰۰ فٹ بلند ہیں۔ ان پہاڑیوں کے بعد زمین بہت ڈھلوان ہو گئی ہے اور مغربی و وسطی عربستان تک اسی طرح ڈھلوان چلی گئی ہے +

وادی حمد (Wadi Hamdh)

وہ علاقہ جو ۲۷ درجہ شمالی عرض البلد سے ۲۴ درجہ عرض البلد تک چلا گیا ہے۔ اس کا سارا برساتی پانی وادی حمد میں آتا ہے اور یہ وادی یا نالہ ویجہ (Wejh) سے ۲۰ میل جنوب میں وادی خیبر اور اویرہ کے سنگم سے نکل کر بحیرۂ احمر میں مل جاتا ہے۔ حجاز ریلوے یہاں سے ساحل سمندر کے متوازی تقریباً ۱۵۰ میل کے فاصلے پر گذرتی ہے۔ اس درمیانی علاقہ

کے متعلق تفصیل کے ساتھ صحیح طور پر کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس حصہ کو آج تک کسی معتبر سیاح نے طے نہیں کیا۔ البتہ ادھر سے گزرنے والے مسافروں کا بیان ہے کہ ساحل جو شمالی حصہ سے زیادہ بنجر ہے اور صوبہ میدان کا پہاڑ دونوں اس حصّہ کی جنوبی حد تک مسلسل چلے گئے ہیں۔ البتہ پہاڑی علاقہ کا ڈھلان بہت گہرا ہے۔ مگر جوں جوں ہم جنوب کی طرف جائیں یہ پہاڑ کم اونچے ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ینبع کے شمال میں پھر بہت بلند ہو گئے ہیں۔ اس اونچے پہاڑ کا نام جبل رووح (Radhwah) ہے۔ نالہ حمد اسی پہاڑ کے بیچ میں سے گذر کر سمندر میں جا گرتا ہے۔ اس علاقہ میں سے دو راستے گذرتے ہیں۔ پہلا ویجہہ (Wejh) سے العلا (El-ala) کو جاتا ہے۔ دوسرا ینبع (Yambo) سے مدینہ کو۔ حاجیوں کے قافلہ کا مشہور راستہ جو مدینہ سے مکہ کو جاتا ہے۔ اس صوبہ کے جنوبی مشرقی حصہ کو ترچھا کاٹتا ہے۔ اس راستہ میں کافی تعداد میں چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہو گئی ہیں۔ یہ راستہ تمام علاقہ میں نہ صرف سب سے زیادہ گنجان آباد ہے۔ بلکہ اس میں جھونپڑیوں کی چھوٹی چھوٹی مستقل آبادیاں ہیں۔ لیکن یہ اتنی چھوٹی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی قصبہ نہیں کہا جا سکتا۔ وادئ حمد کی مستقل آبادیاں یہ ہیں۔

ویجہہ (Wejh) - یہ چھوٹا سا قصبہ ہے جو اس نام کی خلیج کے کنارے واقع ہے پانی کھاری اور کمیاب ہے۔ بازار چھوٹا سا ہے۔ ساحل سمندر کے برابر مونگے کی پہاڑیاں ہیں جو ساٹھ ستر فٹ بلند ہیں۔ ان سے تقریباً چار میل اندر کی طرف کچھ اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ مونگے کی پہاڑیوں اور ان پہاڑیوں کے درمیانی علاقہ کی زمین شور اور دلدلی ہے۔ قصبہ کی بندرگاہ جہاز رانی کے لئے اچھی خاصی اور محفوظ ہے۔ خلیج کا دہانہ تقریباً ۲۰۰ گز چوڑا ہے۔ اس قصبہ میں سے حاجیوں کے قافلے گزرتے ہیں۔

املیج (Umlejh) - اس گاؤں میں تقریباً ایک سو مکانات ہیں۔ یہاں کھجوروں کے جھنڈ ہیں مگر معمولی قسم کے۔ یہ گاؤں چھوٹی سی بندرگاہ کی وجہ سے ترقی کرتا جا رہا ہے یہاں کشتیوں کی آمد و رفت زیادہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں سے مدینہ منورہ کا فاصلہ ۱۴۰ میل ہے اور راستہ اچھا ہے۔ بہت سے لوگ یہاں سے چل کر حجاز ریلوے کے اسٹیشن استبال پر سوار ہوتے ہیں۔ یہ اسٹیشن یہاں سے ایک سو میل دور ہے۔ علاقہ کسی قدر سرسبز ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو اس خلیج میں تجارتی اغراض کے لئے بہت

اچھی بندرگاہ بن سکتی ہے +

ینبوع (Yambo) ۔ساحل سمندر اور پہاڑی سلسلے کے درمیان بنجر زمین پر واقع ہے۔ یہاں بھی ایک خلیج ہے۔جس میں وہ بندرگاہ ہے جسے مدینہ جانے والے حاجیوں کے قافلے استعمال کرتے ہیں۔ یہ بندرگاہ قدرتی ہے۔جس کی ترقی وتوسیع کے لئے ابھی تک شاید کوئی سعی عمل میں نہیں لائی گئی - خلیج میں آمدورفت کا بحری راستہ آسان ہے دہانہ کو قدرت نے ایک ریتیلے جزیرہ سے جس کی بنیاد مونگے کی چٹان پر ہے محفوظ کر دیا ہے جزیرہ کی آڑ میں کشتیاں سمندر کی غضبناک لہروں سے بچ کر لنگر انداز ہو سکتی ہیں ۔مدینہ کو جانے والے قافلے کئی صدی سے اسے تجارت اور زیارت بیت اللہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بندرگاہ میں پانی کافی گہرا ہے۔بعض جگہ ۱۸ فٹ ہے اور بعض جگہ ۶ فٹ ۔مگر بستی بہت گندی ہے ۔نہر سویز کی تعمیر اور بڑے بڑے جہازوں کی آمدورفت سے پہلے اس کی اہمیت کافی تھی۔کیونکہ یورپ اور افریقہ کے قافلے زیادہ تر اسی راستے سے آتے جاتے تھے۔ لیکن اب وہ باقی نہیں۔میٹھے پانی کی قلت ہے اور قصبے سے کئی میل دُور کنووں سے لایا جاتا ہے۔شمال مشرق کی طرف کھجوروں کا مشہور نخلستان ہے +

الاعلے (Elála) - خاصہ بڑا نخلستانی قصبہ ہے۔جسے حجاز ریلوے کی وجہ سے بہت ترقی ہوئی ہے۔نخلستان کئی میل لمبا اور کئی میل چوڑا ہے۔یہاں کی کھجوریں بہت مشہور ہیں۔جن چشموں سے اسے پانی ملتا ہے۔ان کا پانی کسی قدر گرم ہے اور اس میں گندھک کا جزو شامل ہے۔لوگ اس میں نہانے کے لئے دور دور سے آتے ہیں مستورات کے لئے غسل کرنے کی جگہیں علیحدہ اور باپردہ ہیں۔کچھ نخلستان کنوؤں پر بھی ہیں۔مگر ان کا پانی کھاری اور ٹھنڈا ہے۔ کھجوروں کے علاوہ لیموں اور آلوچے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں انگوروں کی بیلیں بھی نظر آتی ہیں۔ زمین زرخیز ہے۔ اس لئے اونٹوں کے علاوہ گائے، بکریاں، گدھے، اور گھوڑے بھی کافی تعداد میں پالے جاتے ہیں +

مدینہ منورہ ۔ اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ حجاز ریلوے کا آخری سٹیشن ہے مگر اب اس کو غالباً اس سے آگے لے جانے کی کوشش کی جائے گی۔سطح سمندر سے اس کی بلندی ۲۳۰۰ فٹ ہے۔تین طرف پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔جو کہیں پانچ میل کے فاصلہ پر ہیں۔کہیں تقریباً گیارہ میل کے فاصلہ پر۔شہر کا میدانی علاقہ جنوب کی

طرف ہے اور کھلا ہوا ہے۔ چونکہ یہاں کئی نالے مختلف سمتوں سے آکر ملتے ہیں اس لئے پانی کی افراط کی وجہ سے شہر کی وادی نہایت شاداب ہے +

شہر کے دو حصے ہیں۔ پرانا مدینہ اور نیا مدینہ اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نظر آتے ہیں۔ قدیم شہر کے کئی دروازے ہیں جو مختلف راستوں کی نگہبانی کرتے ہیں۔

۱۔ باب الشامی (Bab Elshami) جو جبل احد کے راستہ کے سرے پر ہے۔

۲۔ باب الجمعہ (Bab Eljumah) یہاں سے شاہراہِ نجد کا آغاز ہوتا ہے یہ مشرق کی طرف ہے۔

۳۔ باب الکعبہ (Bab El Káabah) یہ جنوب کی سمت ہے۔ یہاں سے کعبہ کو راستہ جاتا ہے +

۴۔ باب العانبری (Bab El Ambri) یہ جانب مغرب ہے یہاں سے ینبوع کو سڑک جاتی ہے۔ جو قافلے پا پیادہ یا بذریعہ ریل آتے ہیں۔ وہ اس دروازہ سے گذر کر برالمنقہ کے میدان میں قیام کرتے ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے۔ جہاں وہ لوگ جو کرایہ پر مکان نہیں لے سکتے ایام حج میں خیموں کے اندر قیام کرتے ہیں۔ اسی میدان سے پھر باب المصر میں داخل ہوتے ہیں +

شہر کا علاقہ بہت سرسبز ہے۔ یہاں ۵۰ اقسم کی کھجوریں پیدا ہوتی ہیں پانی کثرت سے ہے۔ بعض کنوئیں کھاری بھی ہیں اور کہیں کہیں زمین بھی شورہ ہے۔ چونکہ یہاں دنیا بھر کی مسلم قوموں کے افراد آکر بس گئے ہیں اور یہاں شادیاں کر لی ہیں۔ اس لئے لوگ مخلوط النسل زیادہ ہیں۔ صرف زبان کے اعتبار سے عرب کہلائے جا سکتے ہیں لیکن آس پاس کے نخلستانوں کے لوگوں میں اور بالخصوص بدوؤں میں باہر کے خون کی آمیزش کم ہے۔ عام ذریعہ معاش زراعت و تجارت ہے

تیما (Teima) : ایک چھوٹا سا نخلستانی قصبہ ہے۔ جو سطح مرتفع کے نشیبی حصہ میں واقع ہے۔ جب اس میدان کی زرخیز مٹی پر بارش ہوتی ہے تو وہ بہ کر اس نشیبی حصہ میں چلی جاتی ہے اور وہاں کھاد کا کام دیتی ہے۔ یہاں کھجوروں کا ایک بڑا نخلستان ہے اور اس کے ارد گرد دوسرے چھوٹے چھوٹے نخلستان ہیں۔ آب و ہوا صحت کے لحاظ سے بہت اچھی ہے۔ مکان اگرچہ کچے ہیں۔ مگر کشادہ اور ہوادار ہیں اور باغیچوں کی وجہ سے ایک

دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے ہیں۔ زمین چونکہ زرخیز ہے۔ اس لئے کھجوروں کے علاوہ گیہوں، جَو اور جوار کی بھی کاشت ہوتی ہے اور انار، آلوچہ، انجیر، لیموں نارنگی اور انگور وغیرہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ آبادی بیشتر بدوی ہے جو مخلوط النسل معلوم ہوتی ہے حبشی خون کی ملاوٹ کے آثار نمایاں ہیں۔

خیبر (Khaibar) - یہ نخلستانی قصبہ کئی چھوٹی چھوٹی بستیوں کا مجموعہ ہے جو صحرا ہترا میں سطح سمندر سے ۲۸۰۰ فٹ کی بلندی پر آتش فشاں پہاڑ کی ایک گہری نشیبی چٹان پر واقع ہے۔ جس کے لاوا کے پتھروں کا رنگ کہیں سبز اور کہیں خاکی مائل سبز ہے تاریخ اسلام میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ طلوعِ اسلام سے پہلے یہاں بڑے بڑے مالدار یہودی رہتے تھے۔ جن کا پیشہ تجارت اور روپے کا لین دین تھا۔ یہ عرب قبائل کو آپس میں لڑا کر خود آرام و اطمینان سے رہتے اور ان پر اپنا اقتدار قائم رکھتے تھے۔ انہوں نے یہاں مضبوط قلعے بنائے تھے۔ ان قلعوں کی وجہ سے خیبر کو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا اور عرب قبائل ان پر حملہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔

خیبر جس چٹان کے نشیب پر واقع ہے۔ وہ باقی پہاڑ سے الگ وادی زیدیہ (Zeidiyah) کے درمیان میں ہے۔ جو خیبر کی دوسری وادیوں میں سب سے بڑی ہے۔ چٹان کے اوپر کی سطح ہموار میدان ہے۔ جس کا طول تقریباً چار سو گز اور عرض دو سو گز ہے۔ اس میدان میں ایک کنواں ہے۔ جس کے چاروں طرف ایک دیوار ہے۔ یہ کنواں خطرے کے وقت بہت ہی مفید اور کارآمد ہوتا ہے۔ پانی کے ذخیرے پتھر کی دیوار اور مضبوط دروازوں کی وجہ سے یہ جگہ بہت محفوظ بن گئی ہے چشموں کا پانی نیم گرم اور گندھک والا ہے۔ لیکن کھاری نہیں - زمین کافی شور ہے۔ لیکن اگر متواتر ہل چلا کر کاشت کی جائے تو تھوڑے عرصہ میں بہتر ہو جاتی ہے۔ کاشتکاری کے لئے بیل استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور بجز اس زمانہ کے جب قحط کی وجہ سے بدو قبائل اس علاقہ میں آ کر کھیتی باڑی کرنے لگتے ہیں اونٹ بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ آب و ہوا خراب ہے۔ بخار کا مرض عام رہتا ہے۔ اس وجہ سے عرب مالکان اراضی مدینہ منورہ میں بود و باش رکھتے ہیں اور کاشت حبشی قوم کے لوگ کرتے ہیں جو عربوں کے کاشتکار کہلاتے ہیں۔ اس علاقہ میں بدو عربوں کا حق بھی تسلیم کر لیا گیا ہے وہ یہاں کی چراگاہوں میں اپنے مویشی چرا سکتے ہیں اور قحط کے زمانہ میں

حبشی مزارعین (کاشتکار) خوشی سے اپنی زمین کا نصف حصّہ انھیں کاشت کے لئے دے دیتے ہیں۔ مگر جب صحرا میں چارہ پیدا ہو جاتا ہے تو بدو قبیلے واپس چلے جاتے ہیں اور کھجوروں کے جو نئے درخت لگاتے ہیں یا جو فصل بوتے ہیں اس کی قیمت روپے یا فصل کے ایک حصے کی صورت میں لے لیتے ہیں۔ حبشی کئی ہزار کی تعداد میں آباد ہیں۔ اور کھجور اور غلّہ کی کاشت کرتے ہیں۔ زمینوں کے حقدار مالک صرف عرب قبیلے ہیں۔ وہ زمین خرید کر مالک نہیں بن سکتے۔

نواحی دیہات میں خصوصاً مغرب کی سمت زمین کے کچھ قطعے ایسے بھی ہیں جہاں حبشیوں نے اپنے گاؤں بسالئے ہیں۔ ان کے مالک حبشی ہی ہیں جو یہاں کھیتی باڑی کرتے ہیں یہاں کھجور کی تجارت خاص ہے۔ مگر کھجور اعلیٰ قسم کی نہیں ہوتی۔ زرعی پیداوار جوار، مکئی اور جَو وغیرہ ہے جسے بدو قبیلے خرید کرلے جاتے ہیں۔ بہار کے موسم میں یہاں ایک میلہ لگتا ہے جو کئی روز تک رہتا ہے۔ اس میں دور دور کے تاجر خرید و فروخت کیلئے آتے ہیں۔ پورے علاقہ پر افلاس چھایا ہوا ہے۔ حبشی لوگ مشکل سے اپنی روزی پیدا کرتے ہیں۔

جنوبی اطراف کا علاقہ:۔ یہ علاقہ ۲۴ درجہ شمالی عرض البلد سے ۲۰ درجہ شمالی عرض البلد تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے جنوب میں اسیر کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں حجاز کی وہ تقسیم جو ہم نے پہلے کی تھی۔ یعنی سمندر کا ساحلی حصہ ساحل کے برابر کے پہاڑ، سطح مرتفع کا میدانی علاقہ اور بڑے پہاڑ یہاں بالکل علیحدہ نظر آتی ہے۔ البتہ سمندر کے ساتھ والے پہاڑی سلسلے کی بلندی بہت کم ہو جاتی ہے۔ خصوصاً حجاج کے قافلہ کا راستہ ربوغ (Rabugh) سے مدینہ منورہ تک بہت گرد آلود ہے۔ اس کی بلندی دو ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر جب یہ جبل سعدیہ (Jebel-e-Sadiyah) پہنچتا ہے جو جدّہ سے مکہ کے راستے کے جنوب میں کچھ فاصلے پر واقع ہے تو اس کی بلندی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ساحل کا شمالی حصّہ قابلِ زراعت ہے۔ جدّہ اور اس کے شمال سے ربوغ تک زمین زرخیز ہونے کی وجہ سے کئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں اور کھجور کے نخلستان ہیں۔ جنوب میں پھر ریگستان ہے۔ سطح مرتفع کا میدان بہت زیادہ گرد و غبار سے بھرا ہوا ہے۔ البتہ وادیٔ فاطمہ (Wadi-e-Fatima) کا خطّہ جو مکّہ کے شمال سے نکل کر جدہ کے جنوب میں بہتی ہے۔ بہت زرخیز ہے۔ اس خطہ میں کئی

نخلستان ہیں اور زمین کا خاصہ بڑا رقبہ زیرِ کاشت ہے۔ مدینہ سے سو میل تک پہاڑ کے علاقہ میں کئی زرخیز وادیاں ہیں۔ جوں جوں یہ پہاڑ مکہ کے قریب پہنچتے ہیں ویران اور غیر آباد ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ جبلِ قرعہ (Jebel-e-Qura) سے گذرتے ہیں تو شادابی شروع ہو جاتی ہے اور طائف میں تو یہ علاقہ بہشتِ بریں کا نمونہ نظر آتا ہے۔ طائف کے جنوب کی زمین بھی کافی زرخیز ہے۔ اس خطہ کے مشہور شہر اور قصبے یہ ہیں :۔

مکّہ معظّمہ

اس کا ذکر مختصراً پہلے آ چکا ہے۔ یہ اسلامی دنیا کا دینی و اخلاقی مرکز ہے۔ ایک گہری وادی میں واقع ہے۔ جس کے چاروں طرف کئی کئی سو فٹ اونچے پہاڑ پاسبانی کر رہے ہیں۔ اسی لئے غالباً کسی زمانہ میں بھی اس کی حفاظت کیلئے چار دیواری نہیں بنائی گئی۔ زمانۂ قدیم کی فصیل وادی کے تینوں راستوں کی روک کے لئے تھی لیکن اب یہ دیوار نظر نہیں آتی۔ البتہ اس کے تینوں دروازوں کے نام زندہ ہیں۔ مدینہ کا راستہ اور جدہ سے جنوب کا راستہ دونوں جبلِ ہندی (Jebel Hindi) کے سایہ تلے مل کر باب العمرہ (Bab-el-Omrah) یعنی مغربی سمت سے شہر میں پہنچتے ہیں یمن کا راستہ جنوبی دروازے سے ہے۔ منیٰ اور عرفات کا راستہ شمالی دروازہ باب المعلیٰ (Bab-el-Mala) اور شہر کے بالائی حصہ سے آتا ہے۔ مکّہ کے اطراف میں کئی نئی بستیاں ہیں۔ مثلاً بدوؤں کا مرکز، مصریوں کا کیمپ شام کے حاجیوں کا پڑاؤ وغیرہ +

شہر کی لمبائی تقریباً ۳ میل ہے اور چوڑائی تقریباً ۲ میل۔ مقاماتِ مقدسہ مثلاً کعبہ اور مدرسہ وغیرہ شہر کے جنوبی حصے میں ہیں۔ پانی کاریزوں کے ذریعہ جبلِ عرفات سے آتا ہے جو شہر کے وسط سے گذرتی ہیں۔ پانی مقدار میں کافی اور میٹھا ہے۔ چاہِ زمزم یہیں ہے۔ اس کی گہرائی تقریباً چالیس فٹ ہے۔ اس کا پانی ہر سال لاکھوں حاجی دنیا کے مختلف گوشوں میں لے جاتے ہیں +

مکّہ کے نواح کی زمین بالکل بنجر ہے۔ اس لئے زراعت بہت کم ہوتی ہے۔

نخلستان بھی معدودے چند ہیں۔ شہر کے لئے ہر قسم کا سامان خوراک باہر سے آتا ہے۔ صنعت کوئی نہیں۔ عوام کی گذر بسر زائرین کی خدمت و راہبری اور باربرداری کے کام سے ہوتی ہے۔ زیارت کرنے والے سال بھر تک متواتر دنیا کے ہر گوشہ سے آتے رہتے ہیں اور حج کے زمانے میں تو کئی کئی لاکھ کا اجتماع ہو جاتا ہے۔ شہر کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے۔

مکہ معظمہ کی آب و ہوا اگرچہ بہت خشک اور گرم ہے۔ مگر صحت کے لحاظ سے خاصی اچھی ہے۔ اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہونے کی وجہ سے ہوا بہت کم اور ننگی پہاڑیوں کی وجہ سے تپش بہت زیادہ پڑتی ہے۔ راتیں اکثر ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ بارشیں سال بھر میں ایک دو دفعہ ہوتی ہے اور جب زیادہ ہوتی ہے۔ تو پانی کئی کئی فٹ کھڑا ہو جاتا ہے پھر شہر کے جنوبی دروازہ سے میدان میں چلا جاتا ہے اور اپنے ساتھ شہر کی غلاظت بھی بہالے جاتا ہے۔

اہلِ حجاز

پچھلے باب میں سرزمینِ حجاز کے طبعی حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے جا چکے ہیں تاکہ وہ اصحاب جو حجاز کے جغرافیائی حالات سے ناواقف ہیں یا انگریزی نہیں جانتے۔ وہ اس سے ضروری واقفیت بہم پہنچا سکیں۔ زیرِ نظر باب میں اہلِ عرب کے مذہب تمدن، ذرائع معاش اور قومی خصائص وغیرہ کا ذکر کیا جائے گا۔

تمدنی و نسلی حالات

آغازِ اسلام سے پہلے اہلِ عرب کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا وہ خاندانوں، قبیلوں اور جتھوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کوئی اجتماعی نظام نہ تھا، کوئی حکومت نہ تھی۔ ہمسایہ ملکوں کی طاقتور حکومتوں کا خوف انہیں لرزاں و ترساں رکھتا تھا۔ گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ اونٹ اور بھیڑ بکری کے دودھ اور کھجور کے علاوہ کھانے کو کچھ میسر نہ تھا۔ جو کی روٹی مالدار لوگوں کو بھی مشکل سے ملتی تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون رائج تھا۔ قبیلے آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اگرچہ عربی بولنے والے اس زمانہ میں بھی ایشیا اور افریقہ کے کافی حصہ میں آباد تھے۔ مگر انتشار و خانہ جنگی کی وجہ سے کوئی سیاسی نظم نہ تھا مختلف مذاہب نے عربی بولنے والوں کو الگ الگ قوموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جس وقت آنحضرت صلعم دنیا میں تشریف لائے عرب کے باشندے انتہائی پستی کی حالت میں تھے اور یہ پستی فرد و اجتماع کی زندگی کے ہر پہلو پر پوری طرح طاری تھی۔ آپؐ نے ان کو نہ صرف اس پستی سے نکال کر اوجِ ترقی و اقبال پر پہنچایا۔ بلکہ اخوت، مساوات اور اتحاد کے اسلامی رشتے میں منسلک کر کے اس طرح زندہ و پائندہ بنایا کہ آج دنیا میں آپ کے نام لیوا کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

عام خیال یہ ہے کہ عرب میں جتنے لوگ آباد ہیں وہ سب عرب ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے یورپ کے تمام رہنے والوں کو فرنگی کہتے ہیں۔ اسی طرح عرب کے تمام باشندوں کو عرب سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یورپ میں بہت سی الگ الگ قومیں ہیں عربوں میں اگرچہ اس طرح علیحدہ علیحدہ قومیں نہیں ہیں۔ لیکن ان میں مختلف قوموں کے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم پاکستانیوں میں موجود ہیں۔ مثلاً وہ عرب جو مکہ معظمہ جیسے شہروں میں رہتے ہیں کبھی زمانہ میں خالص عربی النسل تھے۔ لیکن اب وہ ان تمام قوموں کے لوگوں سے خلط ملط ہو گئے ہیں جو ماقبل و ما بعد اسلام سے ہر سال حج کے لئے آتے ہیں اور جن میں سے بہت سے لوگ یہاں رہ کر شادیاں کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ باشندے جو ملک کے بطنی حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں وہ باہر کے لوگوں سے الگ رہے۔ اس لئے وہ بڑی حد تک غیر مخلوط کہے جا سکتے ہیں۔ بڑی حد تک اس لئے کہ وہاں کے اکثر باشندوں کی رگوں میں بھی اب ایک مدت سے حبشی خون شامل ہوتا جا رہا ہے +

عرب اقوام کو اپنے شجرۂ نسب سے خاص اُنس ہے وہ اپنے جدّ و مورث کا ذکر بڑے فخر سے کرتی ہیں۔

اصل کے اعتبار سے عرب کے تمام قبیلے تین قبیلوں کی شاخیں سمجھی جاتی ہیں اور وہ تین قبیلے یہ ہیں:

۱۔ بنی قحطان (بنی اولاد یا خاندان کو کہتے ہیں) یہ قبیلہ ہمیشہ یمن میں آباد رہا۔ اس شاخ کا اصل قبیلہ عاربہ ہے جو اپنے آپ کو خالص عرب کہتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ قحطان جو سام کا بیٹا اور حضرت نوح علیہ السّلام کا پوتا تھا۔ عربی زبان کا موجد ہے

۲۔ بنی عدنان۔ یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد سے ہیں انہیں مخلوط النسل کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جب یہ مکہ میں آ کر رہے تو ان میں سے کچھ نے یمن کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اس لئے ان کی اولاد کو متعاربہ (مخلوط) کے نام سے پکارا جانے لگا +

۳۔ بنی خزاعہ۔ یہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بھائی فروخ کی اولاد سے سمجھے جاتے ہیں یہ لوگ تجارت پیشہ تھے اور چونکہ اس قبیلہ کے افراد نے ایران وغیرہ کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ اس لئے اہلِ عرب اس کی شاخوں کو عجمی کہتے ہیں اور ناقابلِ اعتبار اور

فساد انگیز سمجھتے ہیں اور عزت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ یمن کے عربوں کو ان سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے ایرانی زبان کے الفاظ شامل کر کے عربی کو بھی مخلوط کر دیا ہے +

اقوام عرب میں یہ قبیلے اصل و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہی کی اولاد شاخ در شاخ سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے +

مشہور قبائل

اب ان قبائل کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاون یا مخالف کی حیثیت سے مختلف غزوات میں حصہ لیا +

قبائلِ عرب میں سب سے زیادہ ممتاز و معزز اہل قریش تھے۔ مکہ کا انتظام اور کعبہ کی خدمت و مجاوری انہی کے ہاتھ میں تھی۔ قریش کے مختلف کنبے مختلف خدمات انجام دیتے تھے۔ اہلِ عرب کا اگر کوئی مرجع و مرکز تھا تو وہ یہی کعبہ اور اس کا شہر مکہ تھا۔ اور اسی مرجعیت و مرکزیت کی وجہ سے قریش قبائلِ عرب میں ذی عزت اور ذی حیثیت سمجھے جاتے تھے۔ اور اسی وجہ سے مکہ کی تجارتی اہمیت قائم تھی۔ قریش کے مشہور خاندان یہ تھے :-

بنی ہاشم ، بنی اُمیّہ ، بنی نوفل ، بنی عبدالدار ، اسد ، عُدی ، مخزوم ، تیم ، جمح اور سہم ، ان میں سے حسب ذیل کے عہدے موروثی تھے جن کا حق خاندان کے سب سے بڑے فرد کو پہنچتا تھا +

بنی ہاشم کے پاس خانہ کعبہ کی کنجیاں رہتی تھیں اس کا سردار کعبہ کا نگہبان و محافظ ہوتا تھا اور وہی بیت اللہ کو کھول کر زائرین کو اندر جانے کی اجازت دیتا تھا۔ اس کے سپرد دوسری اہم خدمت ایام حج میں زائروں اور مسافروں کو پانی پلانا تھا اس زمانہ میں چونکہ پانی کی قلت تھی۔ اس لئے یہ خدمت بھی بڑی اہم تھی

بنی اُمیّہ۔ یہ جنگ کے وقت قریش کی علمبرداری کرتے تھے۔ اس عَلَم پر عقاب کا نشان ہوتا تھا۔ جب یہ میدان میں لایا جاتا تو یہ گویا اس امر کا اعلان ہوتا تھا کہ قبیلہ کے ہر اس شخص کو جو صحیح الاعضا اور تندرست ہے۔ اس کے تلے جمع ہو جانا چاہیئے۔

خاندان کا سردار جنگ میں فوج کا سالار اور قافلۂ تجارت کا قائد ہوتا تھا +

بنی عبدالدار - یہ دارالشوریٰ کے محافظ تھے۔ اسے دارالندوہ بھی کہتے تھے۔ اس میں چالیس سال سے زیادہ عمر کے لوگ اپنے اجتماعی مسائل پر ضروری صلاح و مشورہ کرنے کو جمع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اس میں شادی کی رسمیں ادا ہوتی تھیں۔ لڑکیوں کو سن تمیز کے وقت بلوغت کا لباس پہنایا جاتا تھا۔ یہیں اعلان جنگ ہوتا۔ میدان جنگ میں جانے سے پہلے قبیلے کے علم کو کھولا جاتا تھا اور یہیں سے لشکر جمع ہو کر دشمن کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوتا تھا +

بنی نوفل - خیرات کی رقم جمع کرتے تھے جس سے محتاجوں کی مدد کی جاتی تھی۔ اس کو افادہ کہتے تھے۔ فصل کے موقع پر ہر شخص اپنی آمدنی کا مقررہ حصہ بنی نوفل کے سردار کو دے دیتا تھا +

بنی تیم - یہ خون بہا اور تاوان وصول کرتے تھے یہ بھی ایک بڑی ذمہ داری تھی۔ کیونکہ اس زمانہ میں جھگڑے فساد بہت ہوتے تھے +

بنی جمح - یہ سفر یا جنگ پر روانگی سے قبل استخارہ کرتے تھے۔ بعض اوقات اہم معاملات کے سلسلے میں بھی استخارہ کیا جاتا تھا۔ یہ فال خاص قسم کے تیروں سے نکالتے تھے۔ اکثر استخارہ کی بنا پر لڑائی لڑی جاتی تھی یا ملتوی کر دی جاتی تھی۔

بنی سہم - مختلف بتوں پر بصورتِ زیورات یا نقد جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ یہ اس کا حساب اور نگرانی کرتے تھے +

انفرادی ذمہ داریوں کے علاوہ یہ سب خاندان اس بات کے بھی ذمہ دار ہوتے تھے۔ کہ کوئی شخص خانہ کعبہ میں لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ اور شور و غوغا کر کے اس کی بیحرمتی نہ کرے۔ اگر کسی قبیلے یا خاندان میں کوئی اندرونی جھگڑا فساد ہو جاتا تو باقی خاندانوں کے سردار آپس میں مل کر اسے دور کرنے کی کوشش کرتے اور متصادم فریق انکی مداخلت اور ان کے فیصلوں کا احترام کرتے +

معاش و معاشرت

تجارت کے علاوہ ان سب خاندانوں کا ذریعہ معاش بھیڑ بکریوں کا چرانا تھا۔

اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے گلّے چرانے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے دودھ، پنیر، کھجور اور اگر مل جاتی تو جَو کی روٹی پر گذر کرتے۔ جانوروں کا گوشت خاص غذا تھی۔ رہزنی، لوٹ مار اور فتنہ و فساد کو بُرا نہ سمجھتے تھے۔ انتقام پروری اور کینہ توزی عام شیوہ تھا۔ لڑکیوں کو عموماً پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے یا زندہ دفن کر دیتے تھے۔ بردہ فروشی ترقی پر تھی۔ خانہ جنگیاں معمولِ حیات کا درجہ رکھتی تھیں، شہوت پرستی ہنر، اور لازمۂ شرافت بن گئی تھی۔ عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح سمجھی جاتی تھیں۔ شراب خوری عام تھی اور اس سب پر مستزاد یہ کہ ان سب باتوں کو عیب اور بُرائی نہ سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے اور اپنی بداعمالیوں کو فخر سے بیان کرتے تھے۔ مگر ان کے ساتھ کھیل کود کے بھی شوقین تھے۔ گھوڑ دوڑ، تیر اندازی نیزہ بازی اور کشتی گیری کے مقابلے ہوتے تھے۔ ہر قبیلے کے الگ الگ بُت تھے۔ مذہب اور رسم و رواج کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے دوسرے مذہب والوں سے اختلافاتِ عقائد کی بنا پر لڑائیاں ہوتیں۔ سردارِ قبیلہ کو محترم و واجب الاطاعت سمجھا جاتا اور اس کا اثر و اقتدار اس کی ذاتی قابلیت پر منحصر ہوتا۔ لوگ ضابطہ و قانون کے نام سے ناواقف تھے۔ طاقت ور اور زبردست کی ہر بات جائز تھی۔ مکہ کے باہر ایامِ حج میں ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا۔ اس میں عرب کے گوشہ گوشہ سے لوگ آکر جمع ہوتے۔ کعبہ کی زیارت کرتے، اپنے اپنے بتوں کو پوجتے اور میلے میں خرید و فروخت کرتے۔ اس سے مکہ میں بڑی رونق ہو جاتی اور اس کی تجارت میں بڑی ترقی ہوتی +

دیہات کے لوگوں کے رسم و رواج اور عادات و خصائل شہر کے لوگوں سے الگ تھے۔ ان کی آزادی تمدّنی قیود سے ناآشنا۔ کشمکشِ حیات کی وجہ سے نہایت سخت جان اور بلا کے محنت کش، تھوڑی سی خوراک پر زندہ رہنے کے عادی، مصائب و شدائد کے خوگر تھے۔ خوراک کی طرح پوشاک بھی بہت معمولی اور سیدھی سادی تھی۔

یثرب (مدینہ)۔ اس کے نواح میں زمانۂ قدیم سے وہ یہودی آباد تھے جو شام سے مسیحیوں کے ظلم و تشدد کی وجہ سے بھاگ کر یہاں آ گئے تھے۔ ان کے تین گروہ تھے۔ ایک بنی نُضیر جو وادیٔ خیبر میں رہتا تھا۔ یہ تینوں زراعت پیشہ تھے +

اور سود کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ بہت سی زمینیں اور باغات ان کی ملکیت تھے۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی چھوٹے چھوٹے یہودی قبیلے آباد تھے۔ کچھ عرصہ بعد عرب کے قبیلہ قحطان کے خاندان اوس اور خزرج بھی یثرب آ گئے۔ یہودی اہلِ کتاب تھے اور یہ خاندان بُت پرست۔ ابتدا میں دونوں مل جل کر بسر کرتے رہے۔ مگر بعد میں مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اور یہودی آپس کے اتفاق اور دولت و ثروت کی وجہ سے ان پر غالب آ گئے۔ جب یہودیوں کی فتنہ پردازیاں اور ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو اوس اور خزرج نے بھی باہم متحد ہو کر یہودیوں کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دے کر مغلوب کر لیا۔ مگر یہ فتح فیصلہ کن نہ تھی۔ لہٰذا دونوں فریق برابر آپس میں لڑتے رہے۔ اسی قبیلۂ قحطان کے لوگ تھے جو مکّہ کے سالانہ میلے کے موقعہ پر آنحضرت صلعم کی زیارت سے مشرف ہو کر یثرب میں سب سے پہلے ایمان لائے اور اس طرح اسلام کا پیغام یثرب تک پہنچا اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور صلعم کو یثرب تشریف لانے کی دعوت دی +

بدوؤں کے امتیازی قومی خصائص

اب عرب کے صحرانشینوں کے امتیازی قومی خصائص بیان کئے جاتے ہیں، جو کسی قوم کے لوازمِ حیات اور اس کے خیالات و جذبات، اس کے عروج و زوال سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جن سے اس کے مذہب، فلسفۂ زندگی اور جہدِ حیات کے مختلف مظاہر و مدارج سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ترقی یا تنزل کے کس درجہ میں تھے +

انسان کی باطنی و ظاہری زندگی کا سارا تار و پود چند فطری خاصوں اور چند ان غیر شعوری صفتوں سے مرکب ہوتا ہے جو اسے پیدائشی طور پر ورثہ میں ملتی ہیں۔ اسی کو جبلت کہتے ہیں اور یہی جبلت اس کے جذبات و حسیات اور افعال و اعمال کے پورے دائرے کا تعیّن کرتی ہے۔ جس طرح افراد کی جبلتیں اور ان کا مزاج بھی مختلف ہوتا ہے۔ اور اس جبلت و مزاج کی ترکیب میں جہاں اور چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ وہاں ماحول کے موروثی اثرات کی کارفرمائی بھی بڑا دخل رکھتی ہے +

اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ دنیا کے جو خطے سرسبز و شاداب اور قدرت کے عطیوں سے مالا مال ہیں اور جہاں کسبِ معاش آسان ہے۔ وہاں کے لوگ طبعی طور پر آرام طلب، پست ہمت اور کاہل ہوتے ہیں۔ ان میں مصائب و شدائد کی برداشت کا مادہ کم ہوتا ہے اور جہد للبقا میں پیچھے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس جو خطے خشک اور بنجر ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں اور معیشت کا معاملہ سخت ہے۔ وہاں کے لوگ بڑے جفاکش، جری، حوصلہ مند، اور سخت جان ہوتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی کشمکش اور سعی و جہد میں بسر ہوتی ہے +

یوں تو عرب کے سارے باشندے دوسرے زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن صحرانشین بدو اپنے ہم وطن شہریوں سے بھی مختلف ہیں۔ انہیں شہری تمدن سے ہمیشہ نفرت رہی اور انہوں نے آزاد و بے قید صحرائی زندگی کو ہمیشہ ہر چیز پر ترجیح دی۔ ترک و اختیار اور بیزاری اور پسندیدگی کا یہ جذبہ بالکل فطری ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ عقلی و ذہنی قویٰ کے اعتبار سے ان میں کوئی نقص ہے یا کسی پست تر درجہ کی مخلوق ہیں اس میں شبہ نہیں کہ اگر ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا طول و عرض تمدنی ترقی کے کسی پیمانہ سے ناپا جائے تو وہ بالکل ابتدائی درجہ میں نظر آئیں گے۔ نیم وحشیانہ صحرائی زندگی نے جو محدود ترین دنیا بنا دی ہے۔ وہ اس سے ایک قدم بھی باہر رکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن ذہانت و ذکاوت کے اعتبار سے وہ دنیا کی تمام گلہ بان اور صحرا نورد قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ان کے عادات و رسوم وحشیانہ ہیں۔ لیکن افکار و خیالات کی دنیا وحشت و بربریت سے پاک ہے۔ جو حالت ان کی آج سے تین ہزار برس پہلے تھی وہی آج بھی ہے ان میں بجز مذہب کے کوئی ادنیٰ چیز بھی نہیں بدلی۔ شاداب و زرخیز خطوں میں مختلف قسم کے لوگ رہتے ہیں اور زراعت و فلاحت سے روزی پیدا کرتے ہیں مگر خشک بنجر اور ریتیلے صحراؤں میں صرف بدو رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ نہ کوئی رہتا ہے۔ نہ رہ سکتا ہے۔ بدوؤں کی زندگی کے مشغلے دو ہیں۔ ایک آپس میں لڑنا، دوسرا بھیڑ بکریوں کا پالنا۔ لڑنے میں بڑے بے باک جری، اور خونخوار، جب تک تاوان یا خون بہا کا تصفیہ نہ ہو جائے لڑنا ترک نہیں کرتے۔ لیکن جہاں جنگجو اور خونخوار ہیں۔ وہاں اطاعت شعار اور فرمانبردار بھی ہیں۔ اگر وہمی اور شکی ہیں تو ساتھ ساتھ مغرور بھی ہیں۔ فطرت سادہ و بے میل ہے۔

اعتقادات نہایت لچر اور بچوں کی طرح کہانیوں کے شوقین۔ لیکن جب کوئی خیال یا عقیدہ دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو کسی بڑی سے بڑی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے، دھن کے پکے، بڑے سے بڑا کام کرنے کے لئے تیار۔ ایک طرف آزاد و فیاض اور جسور، دوسری طرف مغلوب الغضب اور تنک مزاج۔ اعضا و جوارح چست و تندرست، جرأت و حوصلہ مندی میں بوڑھے جوانوں کے ہمقدم۔ کبھی کوئی بوڑھا بدو بھی گھوڑے پر رکاب سے سوار نہیں ہوتا ہر شخص جست لگا کر سوار ہوتا ہے۔ قوتِ برداشت میں بے مثل ہیں۔ صعوبتوں اور کلفتوں کے عادی، منتقم ایسے کہ عفو و رحم کے نام سے نا آشنا۔ مگر فیاض و مہمان نواز اتنے، کہ اگر دشمن بھی پناہ لینے آ جائے تو اس کے محافظ و مربی۔ وطن کی سالمیت اور خیالات کے استحاد نے نظر میں عزت کا ایک خاص معیار قائم کر دیا ہے۔ شرافت و آبرو کا وسیلہ تلوار اور مہمان نوازی ہے۔ اگر انہیں مجموعۂ اضداد کہا جائے تو بیجا نہیں۔ جذبۂ فیاضی و مہمان نوازی کے ساتھ لوٹ مار اور غارتگری، بے رحمی و سفاکی کے ساتھ صلہ رحمی، اور کشادہ دلی، تضاد و تناقص کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ماحول کے عوامل کو مد نظر رکھ کر نفسی تجزیہ کیا جائے تو کوئی بات بھی عجیب اور انوکھی نظر نہیں آئیگی ملک کے طبعی حالات اور ان کی سختیاں، پیداوار کی قلت، وسائل معاش کی کمی اور سیاسی نظم و ضبط کے فقدان نے مل کر جبر و قدر اور ترک و اختیار کی ایک ایسی اضطراری بھول بھلیاں بنا دی ہیں کہ جہد للبقا کی دوا دوش میں جائز و ناجائز صحیح و غلط اور حلال و حرام کی سا دی حدیں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو گئی ہیں۔ اگر یہ خلط ملط نہ ہوتیں تو عربوں میں یا تو صرف برائیاں ہی برائیاں ہوتیں یا صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں۔ لیکن ماحول کے اثرات دونوں صورتوں میں مہلک و تباہ کن تھے۔ اس لئے یہ لوگ متضاد صفات کا مجموعہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ضمیر کے فطری تقاضوں نے برائیوں کو اچھائیوں سے متوازن کرنے کی گنجائش پیدا کر کے شجاعت و مہمان نوازی اور فیاضی و وسیع القلبی وغیرہ کے اوصاف کو زندہ رکھا ہے +

بدوؤں کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ان کی آزادی ہے وہ شہروں اور قصبوں کے رہنے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی غیر ملکی حکومت انہیں زیر نہیں کر سکی۔ عرب مفتوح ضرور ہوئے۔ مگر ان کا ملک غلام بن کر نہیں رہا۔ انہوں نے اپنی

انفرادیت کو ہر دور اور ہر حال میں قائم رکھا۔ ان کا تمدن اُن کی زبان اور طریقِ زندگی ہمیشہ ہر بیرونی اثر سے پاک رہا +

اسلام کا اثر

اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ان عربوں نے جو کار ہائے نمایاں انجام دیئے اور جس تیز رفتاری سے ایک عالم کو مسخر کر کے رکھ دیا۔ اس کی وجہ جہاں اسلام کا جوش و ولولہ اور ایمان کی قوت و حرارت تھی۔ وہاں اس کے نفسی اسباب میں لڑنے مرنے کا وہی جذبہ شامل تھا جو ان میں صدیوں سے متوارث چلا آ رہا تھا۔ جرات و بے باکی اور شجاعت و تہور ان کا مایۂ خمیر تھا ہی۔ اسلام نے اس پر صیقل کر کے اور دنیوی و اُخروی زندگی میں موجبِ اجر و انعام قرار دے کر اسے جہاد و پیش قدمی کے ولولے میں بدل دیا۔ سخاوت اور وسعتِ قلبی سے سپاہیانہ شجاعت کے وہ جوہر نمایاں ہوئے کہ یورپ و امریکہ کی قوموں نے ان کو نمونۂ تقلید بنایا۔ مگر وہم اور حسد کی وجہ سے زیادہ دنوں تک جادۂ اعتدال پر قائم نہ رہ سکے اور خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ لیکن مختلف ملکوں کی سیاحت اور حالات کے تفصیلی مشاہدہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہے کہ عرب دُنیا کی شریف اور معزز قوموں میں سب سے زیادہ شریف قوم ہیں۔ عربوں کے قدیم تمدن کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ان تمدنوں کے سلسلے میں خاموش ہے۔ جنہیں حالیہ تحقیقات نے آثارِ قدیمہ کے گرد و غبار سے کھود کر نکالا ہے۔ یہ تمدن حضرت رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے بعید ترین ماضی کا تمدّن تھا۔ مگر آنحضرتؐ کے زمانہ میں اہلِ عرب اعلیٰ درجہ کی زبان اور شعر و ادب کے سرمایہ دار تھے۔ لیکن زبان و ادب کا یہ سرمایہ تھوڑی سی مدت میں دفعۃً پیدا نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ ان کے تمدنی شعور نے صدیوں کا عرصہ طے کر کے انہیں اس درجہ پر پہنچایا تھا وہ تقریباً دو ہزار سال سے تجارتی لین دین کی وجہ سے دنیا کی متمدن ترین قوموں سے ربط و ضبط رکھتے تھے اور اس قسم کا ربط و ضبط ہمیشہ قومی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ مگر عربوں نے اپنی اکتسابی صلاحیتوں سے قومی خمیر کے آب و گِل میں ایسی کِشتکاری کی کہ نفسی و عملی کردار کی دنیا میں اعلیٰ درجہ کی انفرادیت کے مالک بن گئے اور یہ انفرادیت فرد و اجتماع دونوں کی زندگی کا طغرائے امتیاز بن کر رہی +

فنِ حرب

اہلِ عرب پیدائشی جنگجو ہیں۔ مگر جس طرح زندگی کے دوسرے طریقوں پر ماحول کی چھاپ لگی ہوئی ہے اسی طرح ان کا طریقۂ جنگ بھی ملک کے طبعی حالات اور ان کے فطری تقتضیات کے مطابق ہے۔ وہ کبھی ایک جگہ جم کر نہیں لڑتے۔ ہمیشہ گریز پا جنگ کرتے ہیں۔ جسے آج کل گوریلا وار کہتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں شام و مصر کے مابین بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں عرب کبھی شامیوں کی طرف سے شریکِ جنگ ہوئے کبھی اہلِ مصر کی جانب سے۔ اسبابِ زندگی کی قلت کی وجہ سے چونکہ لوٹ مار کرتے تھے۔ اور اس میں دور دور تک نکل جاتے تھے۔ اس لئے گوشمالی کے لئے شہنشاہِ روم نے کئی دفعہ ان کے خلاف لشکر کشی کی۔ مگر ان کا طریقہ جنگ وہی رہا جو اب تک چلا آتا ہے وہی گریز پائی اور وہی دشمن کو ناگہانی حملوں سے پریشان کر کے تھکانا یا اگر شکست و ہزیمت کا سامنا ہوا تو ریگستان کے اندرونی علاقوں میں جا کر پناہ لے لینا۔ اس لئے جب کبھی کوئی باقاعدہ فوج حملہ آور ہوتی ہے تو عرب عموماً اس کی بار برداری یا چھوٹی چھوٹی ٹولیوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کی ایجاد سے پہلے بدو ریگستان میں خوفناک دشمن تھے اور باقاعدہ فوج کو اپنے اوپر کبھی حملہ نہ کرنے دیتے تھے۔ مادہ شتر پر سوار ہو کر بہت کم خوراک اور پانی پر طول طویل فاصلے نہایت تیز رفتاری سے طے کر لیتے تھے۔ اور لڑائی کے میدان میں اس تیز رفتاری سے منتشر ہونے کے بعد آناً فاناً متعینہ جگہ پر پھر جمع ہونے کے وصف ہی کی وجہ سے انہوں نے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا۔ شتر سواروں کی نہ تو علیحدہ بار برداری ہوتی تھی اور نہ رسد وغیرہ کا تردّد۔ ہر شتر سوار اپنے اونٹ پر چھ ہفتے کا سامان رکھتا تھا۔ جس میں کھجوریں اور نصف بوری آٹا ہوتا تھا عرب کے اونٹ انتہائی گرم موسم میں بغیر پانی پیے ۱۵۰ میل کی مسافت تین دن میں طے کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اونٹ یا گھوڑا ہی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ دوسری فوجوں کے مقابلے میں عرب کتنے طویل فاصلے کیسی عجلت و سرعت کے ساتھ طے کر لیتے ہیں اور نقل و حرکت میں یہ تیز رفتاری فوج کیلئے انتہائی مفید و کارآمد ہوتی ہے +

تجارت

پرانے زمانہ میں اہلِ عرب ایشیا کی سب سے بڑی تجارتی قوم تھے ان کا کاروبارِ تجارت مشرق بعید کے استوائی جزائر سے یورپ و افریقہ کے ملکوں تک پھیلا ہوا تھا اور اسی بنا پر ایشیائیوں کے تھوڑے بہت تعلقات یورپ و افریقہ کے ملکوں سے قائم تھے۔ عرب میں سوائے کھجور کے کوئی چیز ایسی نہیں تھی۔ جسے وہ دوسرے ملکوں کے بازاروں میں پیش کرتے اس لئے وہ ایشیا کا مال شام روم اور یورپ و افریقہ کے ملکوں میں لے جاتے تھے اور وہاں کا سامانِ تجارت ایشیا میں لاتے تھے۔ اس سامان میں مسالے، خوشبوئیں، عطریات، جواہرات، سامانِ تعیش اور لونڈی غلام بھی شامل ہوتے تھے۔ اس تجارت اور متمدن اقوام سے ربط و ضبط کی وجہ سے شہری عرب آرام و آسائش کی زندگی سے بخوبی واقف تھے اور اس کے جملہ لوازم رکھتے تھے یورپ والوں کا مدت تک یہ خیال رہا کہ مسالے عرب میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کی تجارت وہی کرسکتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیزیں ان کے بحری جہاز جزائرِ شرق الہند، چین اور لنکا وغیرہ سے لے کر آتے تھے۔ اور بری قافلے شام و روم اور مصر وغیرہ ممالک میں پہنچاتے تھے۔

مذہب و اعتقادات

قبل از اسلام عربوں کے مذاہب و اعتقادات میں بہت کچھ اختلاف تھا۔ زیادہ لوگ آفتاب اور ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔ کچھ کارخانۂ قدرت میں کئی خداؤں کو شریک سمجھتے تھے اور ان کے ناموں کے الگ الگ بُت بنا کر انہیں پوجتے تھے۔ اہلِ کتاب میں یہودی اور عیسائی تھے۔ یہودی اپنے آپ کو سب سے برگزیدہ اور فائق تر مخلوق سمجھتے تھے۔ انہوں نے تورات میں تحریف کرکے اسے بالکل مسخ کر دیا تھا۔ عیسائی کفارہ کے قائل اور باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیث کے ماننے والے تھے۔ مشرکوں اور بُت پرستوں کی سب سے بڑی عبادتگاہ اور مرکزِ مرجعیت کعبہ تھا اور اس میں ۳۶۰ بُت رکھے ہوتے تھے۔ جن کی پوجا اور زیارت کے لئے عرب ہر سال ملک کے دور دراز گوشوں سے آتے تھے۔ بتوں کی شکلیں ہر قبیلہ اور قوم کے معتقدات

کے مطابق ہوتی تھیں۔ ہُبل مشہور بت تھا اور بنی شیبان کا دیوتا۔ اس کی شکل درخت کے مشابہ تھی۔ پتھروں کے تراشے ہوئے کئی بُت کعبہ کے باہر کچھ فاصلے پر نصب تھے۔ ان کو انصاب کہتے تھے۔ ان کے معتقدین ان پر اونٹوں کی قربانی چڑھاتے تھے۔ مادہ اونٹنی چونکہ تیز رفتار ہوتی ہے۔ اس لئے قیمتی سمجھی جاتی تھی۔ مادہ بچہ پیدا ہوتا تو مالک خوش ہوتا اور اسے بُت کا عطیہ سمجھتا اور جب کسی اونٹنی کے متواتر دس مادہ بچے پیدا ہوتے تو اسے بت کی نذر کر دیا جاتا۔ اسے سائبہ کہتے تھے اور سائبہ ہونے کی حالت میں پھر مادہ بچہ دیتی تو یہ بچہ۔ بحیرہ کہلاتا تھا۔ اس کے کان چھید کر اسے بھی بُت کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ سائبہ اور بحیرہ کے بال کاٹنا، گوشت کھانا، سواری کرنا اور اس پر بوجھ لادنا حرام تھا سائبہ کا دودھ پینا بھی ممنوع تھا۔ البتہ مہمانوں کے سامنے بطور تبرک پیش کیا جا سکتا تھا +

جب قریش لڑکوں کا ختنہ یا نکاح کرنا چاہتے، یا میت کو دفن کرتے، یا کسی نسب پر شبہ ہوتا اور "صحیح" بات معلوم کرنا چاہتے تو ہُبل بت کے نذر سو درہم کرتے اور قربانی کے جانور پیش کرتے۔ اس کے بعد پانسہ ڈالنے والا اس آدمی کو جس کے لئے کوئی حکم یا اجازت حاصل کرنا ہوتی۔ ہبل کے سامنے بٹھا کر یوں عرض کرتے کہ "اے رب یہ شخص فلاں ابن فلاں ہے۔ ہم اس کے ساتھ یہ سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ آپ "حق" بات ظاہر کر دیجئے" اس کے بعد پانسہ ڈالنے والا پانسہ ڈالتا۔ پانسہ سے اگر یہ نکلتا کہ یہ تمہیں میں سے ہے تو وہ شریف و نجیب سمجھا جاتا اور اگر یہ نکلتا کہ غیر ہے تو اسے حلیف سمجھا جاتا اور اگر "مخلوط" تو اس کا نسب مشتبہ رہتا۔ اسی طرح دوسرے کاموں میں "حکم" اور "حق" بات معلوم کرتے۔ اگر "ہاں" نکلتا تو وہ کام ضرور کرتے۔ اگر "نہیں" نکلتا تو ایک سال تک اسے نہ کرتے اور اگلے سال پھر پانسہ ڈلواتے +

کئی قبیلے ایسے بھی تھے۔ جو ہندوؤں کی طرح تناسخ کے قائل تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی روح اس کے اچھے یا بُرے اعمال کے مطابق انسان یا حیوان کے قالب میں پھر اس دنیا میں آ جاتی ہے۔ مقتول کے خون کے انتقام کے متعلق یہ عقیدہ تھا۔ کہ جب تک بدلہ نہ لیا جائے مقتول کی روح اُلّو کے قالب میں آ کر انتقام کے لئے پکارتی پھرتی ہے +

قمار بازی اور شراب خواری عام تھی زنا کو عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ مائیں بیٹوں کو ترکہ میں ملتی تھیں۔ عورت کی حیثیت مویشی سے زیادہ نہ تھی۔ مرد کو اختیار تھا کہ وہ اس سے

جس طرح چاہے تمتع کرے۔ لڑکیوں کی پیدائش منحوس خیال کی جاتی تھی۔ جس قبیلے کے پاس اونٹ، گھوڑے، مویشی اور بھیڑ بکریاں جتنی زیادہ ہوتیں وہ اتنا ہی معزز سمجھا جاتا۔ اونٹ کا گوشت قربانیوں اور ضیافتوں میں کام آتا تھا۔ بالوں سے خیمے اور اوڑھنے کے کپڑے بنائے جاتے، اونٹنی کا دودھ مرغوب غذا تھی۔ اونٹ کی کھال سے خیمے، مشکیزے، اور ڈھالیں تیار کی جاتیں، مینگنیاں جلانے کے کام آتیں۔ چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر قبضہ کرنے کے لئے اکثر لڑائیاں ہوتیں۔ جو مدتوں تک جاری رہتیں۔ مثال کے طور پر جنگِ بسوس محض اس بنا پر چالیس سال تک متواتر لڑی گئی کہ بنی بکر کے ایک شخص نے اعلان کیا تھا کہ فلاں چراگاہ میرے قبیلے کی ہے۔ اس میں کسی دوسرے قبیلہ کا آدمی اپنا جانور نہیں چرا سکتا۔ بنی ثعلب کا ایک شخص کسی دوسرے قبیلے کا مہمان تھا اتفاق سے اس کی اونٹنی اس چراگاہ میں چلی گئی۔ بنی بکر کی ایک عورت نے جو چراگاہ کی محافظ تھی۔ اس کے تھن کاٹ کر اسے بھگا دیا۔ اس پر ۴۹۴ء میں لڑائی چھڑی تو ۵۳۴ء تک جاری رہی اور اس میں بہت سے قبیلوں نے حصّہ لیا۔ جب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی حمایت کو اٹھتا تو دونوں کے سردار جمع ہو کر باہمی امداد کی قسم کھاتے۔ اس رسم کو محالفہ کہتے تھے اور باہمی امداد کی قسم کھانے والے قبیلے حلیف کہلاتے تھے +

واقعۂ فیل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے ایک سال پہلے ۵۷۰ء میں حبش کے مسیحی بادشاہ نے اپنے سپہ سالار ابرہہ کو بھیج کر یمن فتح کر لیا اور وہاں ایک عالیشان گرجا تعمیر کرا کے عامۃ الناس کو حکم دیا کہ دینِ مسیحی اختیار کر کے گرجا میں عبادت کیا کریں۔ اس حکم کی تعمیل کرانے میں ابرہہ بڑی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ اور یمن کے علاوہ گردو نواح کے لوگ بھی اکثر عیسائی بن گئے تھے۔ مگر ابرہہ چاہتا تھا کہ سارا عرب عیسائیت اختیار کرے۔ جب اس نے دیکھا کہ عرب کے تقریباً سارے قبیلے کعبے کو اپنا دینی مرکز مانتے ہیں اور وہاں جا کر بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ تو اس نے اس مرکزیت کو ختم کرنے کی تدبیر سوچی اور مفتوحہ علاقوں کے جن باشندوں نے ابھی

تک عیسائی مذہب قبول نہیں کیا تھا انہیں حکم دیا کہ کعبہ کی زیارت کو نہ جائیں۔اس حکم سے بُت پرست عربوں میں ناراضگی پھیل گئی اور ان میں کچھ نے جوشِ غضب میں گرجا کی بے حرمتی کی۔اس بے حرمتی سے ابرہہ کو بت پرستوں کو سزا دینے اور ان کے مرکز خانۂ کعبہ کو مسمار کرنے کا بہانہ مل گیا۔چنانچہ اس نے ایک لشکرِ عظیم لے کر مکہ کی طرف کوچ کیا۔ اس لشکر کے ساتھ ہاتھیوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی۔ اس زمانہ میں ہاتھیوں سے وہی کام لیا جاتا تھا جو آج کل میدان جنگ میں ٹینکوں سے یا بڑے بڑے درختوں کو گرانے اور عمارتوں کو منہدم کرنے کے لئے بُل ڈوزروں - (Bulldozers) سے لیا جاتا ہے۔ابرہہ کا خیال تھا کہ کعبہ کے مسمار کرنے اور بُت پرستوں کی مرکزیت کا خاتمہ کر دینے سے مسیحیت کے فروغ کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائیگی۔ اہلِ مکہ نے ابرہہ اور اسکے لشکر کے آنیکی خبر سنی تو گھر بار چھوڑ کر آس پاس کی پہاڑیوں میں جا چھپے۔اس زمانہ میں قریش اور اہلِ مکہ کے سردار عبدالمطلب تھے جو بہت معمر اور معزز انسان تھے۔ابرہہ نے مکہ پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ مکہ والوں کے سارے مویشی پکڑ لئے تاکہ مجبور و بے بس ہو کر مزاحمت نہ کریں۔ان میں عبدالمطلب کے مویشی بھی تھے۔عبدالمطلب اپنے مویشیوں کو چھڑانے کے لئے ابرہہ کے پاس گئے۔ تو ابرہہ نے ان سے کہا کہ تمہیں اپنے مویشیوں کی فکر ہے کعبہ کی کوئی فکر نہیں جسے مسمار کرنے کے لئے میں آیا ہوں۔عبدالمطلب نے جواب دیا کہ مویشی تو میرے ہیں اس لئے میں انہیں چھڑانے آیا ہوں۔کعبہ خدا کا گھر ہے۔اس کی فکر خدا کو ہوگی۔ ابرہہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے ان کے مویشی چھوڑ دیئے۔اہلِ مکّہ کا خوف و ہراس اور خاموشی دیکھ کر اس نے سمجھا کہ وہ کعبہ کے گرانے میں مزاحمت نہ کریں گے۔چنانچہ دوسرے روز ہاتھیوں کا لشکر لے کر کعبہ کی طرف چلا۔لشکر کے آگے وہ خود سب سے اچھے ہاتھی پر سوار تھا تاکہ انہدام کا کام اپنے ہاتھی سے شروع کرائے۔مگر کچھ دور چل کر اس کا ہاتھی رک گیا اور آگے نہ بڑھا۔یہ دیکھ کر اس نے دوسرے فیلبانوں کو حملے کا حکم دیا۔اتنے میں آسمان پر ابابیلوں کی فوج نمودار ہوئی۔جنہوں نے اپنی چونچوں سے اس قدر سنگریزے گرائے کہ ابرہہ کے ہاتھیوں کا لشکر بدحواس ہو کر بھاگ گیا۔اس فوق العادہ واقعہ سے کعبہ کی عظمت و

تقدیس کی دھاک بیٹھ گئی اور بت پرستوں کو اپنے بتوں سے بے اندازہ عقیدت ہو گئی۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا۔ اہلِ مکہ نے اس سال سے نیا سنہ قائم کیا۔ اور اس سال کا نام عام الفیل رکھا +

یہاں اس واقعہ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے۔ تاکہ بتوں سے اہلِ مکہ کی عقیدت و شیفتگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغی دشواریوں کا اندازہ ہو جائے۔ اور یہ معلوم ہو جائے کہ جہاں ایک زبردست سالارِ مکّہ کے مشرکوں اور بت پرستوں کے جذبۂ شرک و بُت پرستی پر اپنی ساری قوت و سطوت کے مظاہرہ کے باوجود فتح نہ پا سکا۔ بلکہ واقعۂ فیل اس کی شدت و پختگی میں اور معین ہوا وہاں ایک یتیم بے زر اور تنہا انسان کامیاب ہوا۔ اور اس نے راہ کے سارے موانع و مشکلات پر قابو پا کر فتح حاصل کی +

حجاز کے گردوپیش کی دُنیا

جس وقت اسلام کا آفتابِ عالم تاب طلوع ہوُا۔ حجاز کے گردوپیش کی دنیا کئی بڑی بڑی سلطنتوں میں منقسم تھی۔ شمال مشرق میں ایرانیوں کا غلبہ تھا اور شمال مغرب میں رومیوں کا۔ ایران کے تخت پر نوشیروانِ عادل متمکن تھا۔ سلطنتِ روم کی عنانِ اقتدار ہرقلُ کے ہاتھ میں تھی۔ کسی زمانہ میں یہ سلطنتیں عروج پر تھیں سلطنتِ روم کی حدود شمالی افریقہ کے مغربی سواحل بحراوقیانوس تک پھیلی ہوئی تھیں ایشیائے کوچک، شام اور مصر سب ان کے قبضہ میں تھے۔ انہوں نے بابل کے جنوب میں دریائے فرات کے کنارے حیرہ نامی شہر آباد کیا تھا۔ جس کے محلات وقصور اور باغات ومال ودولت کی شہرت ساری دنیا میں تھی۔ سلطنتِ ایران میں مجوسیت کا غلغلہ بلند تھا، سیاسی اقتدار، عسکری طاقت اور اسبابِ راحت کی فراوانی کی بدولت دنیا کی ممتاز ترین قوم سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ایرانیوں اور رومیوں کی باہم آویزش اور مسلسل جنگ وجدال نے دونوں کو کھوکھلا کر رکھا تھا +

یورپ کے شمالی اور مغربی حصّے وحشی قوموں کی تاخت وتاراج کی جولانگاہ بنے ہوتے تھے۔ مصر اور افریقہ کے شمالی حصے گو رومیوں کے قبضے میں تھے۔ مگر ان کا اقتدار معمولی تھا۔ ان کے مظالم کی وجہ سے وہاں کے لوگ منحرف ہو چکے تھے۔ اندلس گاتھ قوم کے ہاتھ میں تھا۔ ان نیم وحشیوں نے اسے فتح تو کر لیا۔ لیکن امن وانتظام قائم نہ رکھ سکے۔ انہوں نے سلطنتِ روما سے مدد لی۔ مگر کچھ دنوں بعد اختلاف ہوگیا اور آخر کار گاتھوں کو وہاں سے نکلنا پڑا +

ہندوستان میں برہمنوں کا عروج تھا۔ لیکن پانچویں صدی عیسوی میں ایرانیوں نے ہندوستان کے مشہور راجہ چندر گپت کے خاندان کا خاتمہ کر کے ہن قوم کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس قوم کے سردار کا نام تورمان تھا۔ اس خاندان نے ۲۷ سال تک حکومت کی۔ اس کے بعد ہندو راجاؤں نے بغاوت کر کے اسے ملک بدر کر دیا۔ پانچویں صدی عیسوی میں سندھ کا ہندو راجہ بہت طاقتور تھا۔ اس کا دارالحکومت دریائے سندھ کے کنارے الور تھا۔ جو بہت خوبصورت اور بارونق شہر تھا۔ مورخوں نے اسے الدور اور اسرور لکھا ہے۔ اس کی سلطنت کی حدود کشمیر سے ایران کے صوبہ مکران تک پھیلی ہوئی تھیں۔ شمال میں کوہستان کرمان تھا۔ اور جنوب میں بحیرۂ عرب۔ نظم و نسق اچھا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے ساسانی بادشاہ نے مکران کے راستے سے حملہ کر کے سندھ کے راجہ کو شکست دی۔ مگر اس نے اپنا قبضہ قائم نہیں رکھا۔ بلکہ لوٹ مار کر کے واپس چلا گیا۔ اس لئے یہ علاقہ ہندو راجاؤں ہی کے قبضہ میں رہا۔ اس زمانہ میں یہاں کا تمدن عجیب رسوم کا مجموعہ تھا۔ عیاشی اور نفس پرستی شباب پر تھی۔ ایک عورت کے بیک وقت کئی کئی شوہر ہو سکتے تھے۔ اخلاقی حالت نہایت پست اور افلاس و جہالت عام تھی +

لیکن گرد و پیش کی دنیا کے حالات کی اس گوناگونی سے اہلِ عرب محفوظ تھے یونانیوں رومیوں اور ایرانیوں کی ہوسِ ملک گیری نے ایک عالم کو تہ و بالا کیا۔ شاہِ حبش کے اقتدار کی حدود یمن تک وسیع ہوئیں۔ مگر حجاز ان سب کی ترک تازیوں سے بچا رہا۔ اسے کوئی زیر نہ کر سکا۔ اہلِ حجاز کا یہ فخر بالکل بجا ہے کہ وہ غیر مذاہب اور غیر اقوام کی غلامی سے ہمیشہ آزاد رہے +

اب گرد و پیش کی اس دنیا کے مذہبی حالات پر نظر ڈالئے۔ سلطنتِ روم مسیحیت کا گہوارہ تھی اور ایران مجوسیت یعنی آتش پرستی کا۔ شام کا صدر مقام دمشق مسیحیت کا مذہبی و سیاسی مرکز تھا۔ مسیحیوں کا سب سے بڑا مقتدا الفیوس یہیں رہتا تھا۔ اس نے مسیحیت میں ایک نئے مذہب کی تلقین کی۔ شادی کو برائی قرار دیا۔ نکاحِ ثانی کو حرام کاری کہا۔ مجوسی آگ کو پوجتے تھے۔ نیکی اور بدی کے دو خدا مانتے تھے۔ اجرامِ فلکی کو کارخانۂ عالم پر قادر سمجھتے تھے۔ بت پرستی ہر جگہ عام تھی۔ عقل و شعور کا سارا سرمایہ

کسی نہ کسی بُت کی نذر تھا۔ شرفِ انسانی فہم سے بالاتر چیز تھی۔ عام اور محسوس بتوں کی خدائی سے اگر کچھ بچ رہا تھا تو وہ نسل رنگ اور خون کے بتوں کی خدائی کے لیے وقف تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں اس وقت کی دنیا مبتلا تھی۔ صرف حجاز ہی اندرونی طور پر مذہبی و روحانی عملی و اخلاقی اور سیاسی و اجتماعی طور پر پست حال نہ تھا۔ بلکہ اس کے گردوپیش کی ساری دنیا پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر مکہ کے ایک اُمّی نے دنیا کی اس تاریکی اور اس گمراہی کو دور کرنے کے لیئے یکہ و تنہا سارے آلام و مصائب کا مقابلہ کر کے اپنے نیک نہاد ساتھیوں کو اس سے نکال کر دنیا کا رہبر و رہنما بنا دیا اور نوعِ انسان کے لئے ابدی فلاح و سعادت کی راہ کھول دی۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم!

بانیٔ اسلام کا بچپن اور جوانی

فرانس کے مشہور دفاعی مبصر جومنی (Jomini) کا قول ہے کہ جو شخص جنگ کی سیاست کو سمجھنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ جنگ کی اصل دستاویزات کا غور سے مطالعہ کرے اور اس کے ساتھ اصولِ جنگ کو میدانِ جنگ میں جا کر سمجھے۔ کیونکہ فنِ جنگ محض ایک سائنس نہیں ہے بلکہ ایک خطرناک اور بھیانک ڈرامہ ہے۔ جس میں خون سے ہولی کھیلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ماضی بعید کے جنگوں کے مطالعہ سے ہم ایک حد تک صرف یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ "جنگ سے ہمارا مفہوم و مدعا کیا ہے" مگر سوال یہ ہے کہ اچھا سپاہی بننے کے لئے فنِ جنگ کے کون سے حصے کا مطالعہ مفید ہے؟ محض یہ پڑھ لینا کہ کون سی جنگ کن اصولوں پر لڑی گئی یا اس جنگ کی تاریخ کیا تھی۔ کچھ زیادہ مفید نہیں۔ جب لڑائیاں ایک ہی طرح ایک ہی جگہ اور ایک ہی نمونہ پر کبھی آج تک نہیں لڑی گئیں تو کیا ضروری ہے کہ ہم زمانۂ بعید کی لڑائیوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں؟

جنگ کے خونی ڈرامے کے ایکٹر انسان ہوتے ہیں اور تمام جنگی کارنامے انسانی فکر و نظر پر عمل کرنے ہی سے وجود میں آتے ہیں۔ اس لئے ہماری رائے میں اگر کوئی

شخص کسی جنگ کو صحیح طور سے سمجھنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ پہلے وہ اس انسان کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ جس نے وہ کامیاب جنگ لڑی اور جس کے جنگی کارنامے ہمارے سامنے نمونہ و مثال بن کر آئے۔ مقصد یہ ہے کہ پہلے ہمیں اس شخص یعنی اس جرنیل کی سوانحعمری کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس لڑائی کی تاریخ اسی جرنیل کی سوانحعمری کا زرین حصّہ ہے۔ اس طرح ہم اس جرنیل کو بحیثیت انسان بھی اچھی طرح سمجھ لیں گے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس میں ایسی کون سی خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ اتنا بڑا فاتح بنا۔ اس کے دل و دماغ کی صلاحیتوں کا عالم کیا تھا۔ اس میں یہ اولوالعزمی کب اور کیسے پیدا ہوئی یہ فطری و وہبی تھی یا حوادثِ زمانہ کی تخلیق۔ ذاتی اوصاف اور شخصیت کے مطالعہ سے ہمیں نہ صرف ایک مفید سبق ملے گا۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ نفسی نشوونما میں اس نے کیا مرحلے طے کیئے اور کس طرح طے کیئے اور اس کی اولوالعزمی و عالی حوصلگی کی صفات اس درجہ کو کیسے پہنچیں۔ مطالعہ کا طریقہ اور اس کا مقصد یہ نہ ہو تو وہ بالکل بیکار ہے۔ اس سے ہمت و حوصلہ میں ترقی اور فکر و نظر میں وسعت و بلندی پیدا نہیں ہو سکتی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے سوانحِ حیات اور ان کے جنگی کارناموں کی تاریخ عالم میں کوئی مثال نہیں۔ یہ وہ ہستی ہے۔ جس نے جنگ کے بعد مفتوح اقوام کو صحیح معنوں میں امن و اطمینان کی دولت سے بہرہ مند کیا۔ آپ کے سوانحِ حیات صرف دفاع میں نہیں زندگی کے ہر شعبہ میں اور زمانہ کے ہر دور میں رہبر کامل کا حکم رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کا مطالعہ کسی ایک حصّہ یا ایک پہلو سے نہیں۔ بلکہ اوّل سے آخر تک پورا کرنا چاہیئے۔ آئندہ صفحات میں ناظرین کے سامنے ان کا ایک جامع خلاصہ پیش کیا جائے گا۔

خاندان اور اجداد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاندانِ قریش کے سردار عبدالمطلب کے پوتے اور عبداللہ بن عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ قریش قوم کنانہ کی شاخ تھی۔ جس کا آغاز حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کی اولاد سے ہوتا ہے۔ عبدالمطلب ذاتی و نسبی شرافت و فضیلت کی بنا پر خانہ کعبہ کے متولی تھے۔ عرب کے قبائل آپ کی بہت عزت و تکریم کرتے

تھے۔ واقعۂ فیل آپ ہی کی تولیت کے زمانہ میں پیش آیا۔ کثیر الاولاد تھے۔ تیرہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ ابوطالب زبیر اور عبداللہ ایک بیوی سے تھے۔ اور دوسرے بیٹے حمزہؓ و عباسؓ اور ابولہب وغیرہ دوسری بیویوں سے۔ عبداللہ عقل و دانائی۔ متانت و بُردباری، خوش خلقی و خوبصورتی میں سب سے ممتاز و فائق تھے اور عبدالمطلب انھیں بہت چاہتے تھے۔ اہلِ مکّہ بھی ان کے پسندیدہ عادات و اخلاق کے گرویدہ تھے +

عبدالمطلب کا ننھیال یثرب میں تھا۔ وہیں پیدا ہوئے اور وہیں بچپن کا زمانہ گذرا۔ آپ کے چچا مُطلِب بن عبد مناف حُجّاج کی مہمانداری کے منصب پر فائز تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ منصب آپ کو ملا۔ تو آپ نے حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ کے کنویں چاہِ زمزم کو صاف کرایا اور کنویں سے جو دفینہ نکلا اس کا سونا پتروں کی صورت میں کعبہ کے دروازوں پر چڑھوادیا۔ ان کاموں کی وجہ سے اہلِ مکّہ اور عرب قبائل آپ سے بہت خوش ہو گئے اور غیر معمولی احترام کرنے لگے +

عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی مکّہ کے معزز قبیلہ بنی زہرہ کے رئیس وہب بن مناف کی لڑکی آمنہ سے کی تھی۔ آمنہ نجیب الطرفین ہونے کے علاوہ ذاتی شرافت، ذہانت اور حسنِ سیرت و صورت میں مکّہ کی تمام لڑکیوں میں ممتاز تھیں۔ شادی کے چند روز بعد عبدالمطلب نے عبداللہ کو ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام روانہ کیا اور واپسی میں یثرب سے کھجوریں لانے کی فرمائش کی۔ مگر اس سفر سے واپسی میں عبداللہ یثرب میں انتقال کر گئے۔ جب ان کے آنے میں دیر ہوئی تو عبدالمطلب نے اپنے لڑکے حارث کو خبر لانے کے لئے بھیجا۔ وہاں ان کو انتقال کی خبر ملی۔ عبدالمطلب کو سخت صدمہ ہوا۔ یہ واقعۂ رحلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے دو ماہ پہلے کا ہے۔ یعنی آپ دنیا میں بحالتِ یتیمی تشریف لائے +

ولادت و ما بعد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سنِ ولادت ۵۷۱ء تاریخ ۲۲ اپریل اور یوم دوشنبہ ہے۔ جس وقت عبدالمطلب کو پوتے کی پیدائش کی خبر ملی تو آپ خانہ کعبہ میں تھے بہت خوش ہوئے۔ ان کا بیان ہے کہ گھر جا کر میں نے زچہ خانہ میں بہو سے آواز دے کہ

کہا کہ بچہ کو مجھے دکھاؤ تو آمنہ نے جواب دیا کہ مجھے غیب سے ہدایت ہوئی ہے کہ تین دن تک کسی کو نہ دکھاؤں مگر اس جواب کی پروا نہ کرکے میں آگے بڑھا۔ اور بچے کو دیکھنا چاہا تو ایک مہیب شکل نے مجھے روک دیا اور کہا کہ اسے تین دن تک نہ دیکھو تین روز بعد عبدالمطلب پوتے کو گود میں اٹھا کر خانہ کعبہ میں لے گئے۔ اس کے لئے اپنے رب سے برکت حاصل کی اور محمدؐ نام رکھا۔

امرائے عرب کے دستور کے مطابق آپ کو دوسرے مہینے دودھ پلانے کے لئے حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا۔

حلیمہ سعدیہ کا بیان ہے کہ بچہ نہایت خوش اطوار حمیدہ خصائل اور صابر تھا۔ خود ایک طرف کا دودھ پیتا تھا۔ اور دوسری طرف کا میرے بچے عبداللہ کے لئے چھوڑ دیتا تھا۔ نویں مہینے میں بولنا شروع کر دیا اور دوسرے سال دودھ پینا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں اسے بی بی آمنہ کے پاس لائی۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور میرے اصرار پر انہوں نے دوبارہ اسے اپنے ساتھ لانے کی اجازت دے دی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر پانچ سال کی ہو گئی تو آپ اپنی والدہ کے پاس رہنے لگے۔ اُم ایمن جو بی بی آمنہ کی کنیز تھیں کہتی ہیں کہ آنحضرت صلعم بہت مسکین سیدھے سادے اور سلجھی ہوئی طبیعت کے بچے تھے۔ آپ نے کبھی بستر پر پیشاب یا پاخانہ نہیں کیا۔ پیاس لگتی تو خود پانی لے کر پی لیتے۔ کبھی ضد نہ کرتے۔ جو مل جاتا، وہ کھا لیتے، کوئی چیز خود نہ مانگتے۔ جب حضرت کی عمر چھ سال کی ہوئی تو بی بی آمنہ مجھے ساتھ لے کر اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے یثرب تشریف لے گئیں۔ ایک سال کے قیام کے بعد مکہ واپس آ رہی تھیں کہ ابوا کے مقام پر انتقال فرما گئیں اور میں حضرت محمدؐ کو لے کر ان کے دادا عبدالمطلب کے پاس آئی۔ عبدالمطلب کو بہو کے انتقال کا سخت صدمہ ہوا۔ آپ کی پرورش انہوں نے اپنے ذمہ لی۔ لیکن ان کی عمر کا جام بھی لبریز تھا۔ حضرت آٹھ ہی سال کے تھے کہ انہوں نے بھی داعیٔ اجل کو لبیک کہا مگر مرنے سے پہلے انہوں نے اپنے بیٹے اور حضرت صلعم کے چچا ابوطالب کو بلا کر ان کی تربیت و پرداخت ان کے سپرد کر دی۔ ابوطالب نے آپ کے ساتھ اپنی اولاد سے زیادہ محبت و شفقت کا سلوک کیا۔ ہر وقت ان کا خیال رکھتے۔ جب کبھی بچوں کا

ذکر آتا تو اپنے بھتیجے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے اوصافِ حمیدہ خوش ہو ہو کر بیان کرتے اور ان کے آداب و اخلاق، راست گوئی اور صفائی و پاکیزگی کی بیحد تعریف کرتے +
عبد المطلب کے بعد ابو طالب قریش کے سردار اور خانہ کعبہ کے متولی مقرر ہوئے۔ آپ کی سرداری و بزرگی کو بھی سب مانتے تھے۔ جن دنوں مکہ میں یہ واقعات رونما ہو رہے تھے۔ عرب کی ہمسایہ ایرانی اور رومی حکومتوں میں کچھ اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ ۵۷۹ء میں ایران کے بادشاہ نوشیروان کا انتقال ہوا۔ اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ہرمز چہارم تخت پر بیٹھا۔ مگر وہ بد اطوار ظالم اور عیاشں تھا۔ اس لئے رعایا نے بغاوت کردی قیصرِ روم موقعہ کا منتظر تھا۔ اس نے ایران پر حملہ کر دیا۔ ادھر ہرمز رومیوں سے مصروفِ جنگ تھا کہ شمال سے تاتاریوں نے چڑھائی کر دی۔ ایران میں ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا ہرمز کے جرنیل بہرام نے جس نے رومیوں اور تاتاریوں کو شکست دی۔ ہرمز کے خلاف سازش کر کے اسے تخت سے اتار دیا اور جب رعایا نے اس کے بیٹے پرویز کو اس کی جگہ تخت نشین کیا تو بہرام نے اس کی بھی مخالفت کی پرویز بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور موریس کی مدد سے دوبارہ تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد دونوں سلطنتوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے +

شام کا سفر

اس زمانہ میں ابو طالب نے تجارت کی غرض سے شام جانے کی تیاری کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی عمر دس سال تھی۔ آپ کو بھی جانے کا شوق ہوا، اور اصرار کر کے ابو طالب کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ جب یہ قافلہ شام میں بصریٰ کے کوہستان سعید کے دامن میں پہنچا۔ تو وہاں اس نے پڑاؤ ڈالا۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب تھا۔ دور دور کے قافلے یہاں آ کر ٹھہرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں کی حکومت انصاف پرور تھی۔ اس لئے مختلف مذاہب کے بہت سے لوگ رومیوں کی ظلم آفرینیوں سے تنگ آ کر وہاں رہنے لگے تھے۔ ان میں ایک عیسائی راہب بحیرہ بھی تھا۔ جسے وہاں کافی رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ مہمان نوازی کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس نے ایک وسیع مسافر خانہ بنوایا ہوا تھا۔ جس میں عام طور پر مسافر قیام

کرتے تھے۔ ابو طالب کا قافلہ اس راہب کے گرجا کے پاس ٹھہرا۔ جس وقت اہل قافلہ اپنے اپنے اونٹوں کے کجاوے کھول رہے تھے تو راہب ان کے پاس آیا۔ ابو طالب اس سے پہلے بھی گرجا کے پاس کئی دفعہ ٹھہرے تھے لیکن اس سے پہلے نہ وہ کبھی آیا۔ اور نہ کوئی التفات کیا۔ اس دفعہ وہ قافلے والوں سے خوب ملا۔ اور ہر ایک کو غور سے دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو دیکھ کر چونک پڑا اور بہت دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد ابو طالب سے پوچھا یہ کون ہے۔ ابو طالب نے کہا یہ میرا لڑکا ہے اور یہ کہہ کر بھتیجے کے اوصاف بیان کئے اور کہا اسے جو دیکھتا ہے پسند کرتا ہے۔ بوڑھے راہب نے کہا، مجھے ان صاحبزادے میں خاص شان نظر آتی ہے۔ جب تمہارا قافلہ آ رہا تھا تو شدت کی دھوپ تھی۔ اور میں نے اپنے دریچہ سے دیکھا کہ آسمان پہ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا برابر ان پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ اس کے بعد اس نے حضرت سے پوچھا۔ آپ کا مذہب کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ میرے بزرگ تو بتوں کو پوجتے ہیں۔ مگر میں جس چیز کی جستجو میں ہوں وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی اور ابھی تک کہیں نہیں ملی ہے۔ میرا دل بتوں کو سجدہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نے آج تک ان کے سامنے سر نہیں جھکایا +

راہب یہ سن کر بہت خوش ہوا اور بالقصد کہا، ایسا معلوم ہوتا ہے تم نے یہود کی آسمانی کتاب پڑھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ میں اُمّی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ سب غلط راستہ پر ہیں اور میں اسی وجہ سے بُت پرستی کو گمراہی سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ معلوم نہیں ہے۔ یہ کہہ کر حضرت اونٹ چرانے چلے گئے +

یہ گفتگو کر کے راہب گرجا میں واپس آیا اور بہت سا کھانا پکوا کر قافلہ والوں کے پاس پھر گیا۔ اور ان سے درخواست کی کہ ان صاحبزادہ کو بلائیں۔ جب آپ آ گئے، تو اس نے ابو طالب سے کہا، آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ مگر اسے تو یتیم ہونا چاہیئے۔ ابو طالب نے کہا۔ بیشک آپ درست کہتے ہیں۔ یہ یتیم ہے۔ اور میرے بھائی کا بیٹا ہے۔ ابھی یہ بطنِ مادر ہی میں تھا کہ یتیم ہو گیا۔ اس کے بعد راہب نے ابو طالب کی اجازت سے آنحضرتؐ کی پشت کھول کر دیکھی تو اسے وہ نشان بھی نظر آیا

جو اس نے اپنی کتابوں میں مہرِ نبوت کے متعلق پڑھا تھا۔ اسے دیکھ کر راہب نے کہا۔ اس لڑکے کو گھر واپس لے جاؤ۔ اور یہودیوں سے اس کی پوری حفاظت کرو۔ تاکہ وہ اس کی ان علامتوں اور نشانیوں کو نہ دیکھنے پائیں۔ ورنہ وہ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ یہ بہت عظیم الشان انسان ہوگا۔ چونکہ یہودی اس کے دشمن ہیں۔ لہٰذا شام میں اس کا قیام مناسب نہیں +

جہالت کا دور دورہ

یہاں مختصراً یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جہاں جہلائے عرب بت پرستی اور ستارہ پرستی وغیرہ میں مبتلا تھے اور ضلالت کی تاریکیاں انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھیں۔ وہاں یہود و نصاریٰ بھی اپنے مذاہب کی اصل سے بہت دور جا پڑے تھے اور ان کی دینی کتابیں تحریف و تصرف سے مسخ ہو کر من گھڑت افسانوں کا مجموعہ بن گئی تھیں۔ راہب اور پادری اپنے اپنے عقاید کی تبلیغ کر رہے تھے۔ مثلاً شام کے دارالحکومت دمشق میں لینوس راہب کی پیشوائی قائم تھی۔ موصل میں اسقف جیروم اپنے مذہب کی اشاعت میں مصروف تھا۔ عموریہ میں پطرس کا کلیسا علیحدہ تھا۔ بصریٰ میں بحیرہ کا مذہبی اقتدار تھا۔ اس طرح دینِ مسیح مختلف راہبوں اور پادریوں کے انفرادی اعتقادات میں تقسیم ہو چکا تھا۔ لوگ توحید کے معانی سمجھنے سے قاصر تھے۔ سیاسی تقسیم کے اعتبار سے عرب کے شمالی حصہ اور شام پر قیصرِ روم کا قبضہ تھا۔ ساحلِ بحیرۂ قلزم کے برابر مکہ کے جنوب میں ساحل سمندر تک شاہِ حبش کا اقتدار تھا یہ بادشاہ عیسائی تھا۔ دریائے دجلہ و فرات کی وادی میں ایرانیوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ آتش پرست تھے +

شام سے واپس آنے کے بعد آنحضرت پانچ سال تک ابو طالب کے زیرِ پرورش رہے۔ اس زمانہ میں قریش کے دو قبیلوں کنانہ اور ہوازن میں چار دفعہ لڑائیاں ہوئیں جنہیں حروبِ فجار کہتے ہیں۔ ان لڑائیوں کی آخری فیصلہ کن لڑائی میں آنحضرت صلعم بھی اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شریک ہوئے۔ مگر نہ کسی پر ہاتھ اٹھایا اور نہ کسی کو نقصان پہنچایا۔ اس میں ہوازن کو شکست ہوئی۔ عرب اس

واقعہ کو یوم شرب کے نام سے یاد کرتے ہیں +

معاش کی جدوجہد

ابو طالب کثیر العیال تھے۔ مکہ میں کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ قحط کے زمانہ میں بڑی صعوبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب آنحضرتؐ کی عمر پندرہ سال ہوئی۔ تو ایک دن آپؐ کے چچا نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر تم تیار ہو تو کہیں ملازمت کی کوشش کروں۔ آپؐ نے فرمایا چچا جان میں بالکل تیار ہوں۔ ابو طالب آپ کو لے کر خدیجہ بنت خویلد کے پاس گئے۔ یہ مکہ کی بڑی مالدار تاجرہ تھیں عنفوانِ شباب میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ باپ بھی بہت سا مال و دولت چھوڑ کر وفات پا چکا تھا۔ خدیجہ اس دولت کی تنہا مالک تھیں۔ کاروبارِ تجارت کے علاوہ اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریاں بھی بکثرت تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد رؤسائے مکہ میں سے بہتوں نے ان کے پاس شادی کے پیغام بھیجے۔ مگر انہوں نے قبول نہیں کئے۔ ابو طالب کے تعارف کرانے پر حضرت خدیجہؓ نے جو آپ کی دیانت اور شرافت کا شہرہ سن چکی تھیں۔ آپؐ کو اپنے قافلۂ تجارت کا کارندہ مقرر کر دیا۔ خدیجہ کے تجارتی کارندے کئی تھے اور ان سب کا سردار میسرہ نامی آزاد کردہ غلام تھا۔ چونکہ وہ آنحضرتؐ کی محنت و دیانت سے بہت متاثر تھیں۔ اس لئے انہوں نے میسرہ کو بطورِ خاص تاکید کی کہ وہ محمدؐ کا خیال رکھے اور قافلہ کی واپسی پر ان کے متعلق مفصل رپورٹ پیش کرے +

جب قافلہ شام پہنچا تو وہاں اس نے ایک منزل پر نطورا نامی عیسائی راہب کے گرجا کے پاس قیام کیا۔ آنحضرت ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ راہب آپ کو دیکھ کر فوراً آ گیا۔ اور بولا کون نوجوان ہے جو اس درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ میسرہ نے جواب دیا یہ سردارِ قریش کا بیٹا ہے اور سردارِ قافلہ۔ راہب نے کہا۔ یہ سردار قافلہ ہی نہیں ہے۔ کسی زمانہ میں ساری دنیا کا سردار ہوگا۔ میسرہ کو اس پر تعجب ہوا۔ اس نے اس کی وجہ دریافت کی۔ راہب نے کہا، اس درخت کے نیچے نبی کے سوا آج تک کوئی نہیں بیٹھا۔ ان کی آنکھیں اور دوسری نشانیاں بتا رہی ہیں کہ یہ ہماری کتاب کے لکھے ہوئے حالات کے مطابق نبیٔ آخر الزمان ہوں گے۔ افسوس اس

وقت میں زندہ نہ ہوں گا۔ کاش میں ان کی خدمت کر کے نجات حاصل کر سکتا۔ اس کے بعد راہب نے میسرہ کو تاکید کی کہ ان کا خیال رکھنا اور ان سے جدا نہ ہونا۔

قافلہ کا سامانِ تجارت چند روز میں ہاتھوں ہاتھ کئی گنا منافع سے فروخت ہو گیا اس سفر میں کئی اور واقعات ایسے ہوئے جن سے تمام اہلِ قافلہ آنحضرت صلعم کے گرویدہ اور ان کی صداقت شعاری و دیانتداری کے ثناخواں بن گئے۔ واپسی پر جب مکہ تھوڑی دور رہ گیا تو قافلہ والوں نے طے کیا کہ حضرت محمد صلعم اپنی سواری کو دوڑا کر آگے جائیں اور خدیجہ کو سب سے پہلے اس کثیر منافع کی اطلاع دیں۔ روایت ہے کہ اس وقت خدیجہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑی تھیں کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اونٹ پر بھاگتا ہوا آ رہا ہے اور بادل کا ایک ٹکڑا ابر اس پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ انہوں نے اپنے دربان کو بھیجا کہ دریافت کرو یہ آدمی کون ہے اور کہاں سے آ رہا ہے؛ جب وہ آپ سے ملا تو آپ نے کہا کہ میں انہی کا کارندہ ہوں۔ اہلِ قافلہ کی تجویز پر خدیجہ کو منافع کی خوشخبری سنانے سب سے آگے آ رہا ہوں۔ جب قافلہ کے باقی لوگ بھی آ گئے۔ تو خدیجہ نے میسرہ اور دوسرے کارندوں سے آپ کے متعلق سوالات کئے۔ سب نے انتہائی تعریف کی اور میسرہ نے عیسائی راہب کی بیان کی ہوئی سب باتیں بھی کہیں۔ خدیجہ کے دل میں راہب کی باتوں اور نصیحتوں کا بہت اثر ہوا۔ پھر انہوں نے واپس آتے وقت بادل کو سایہ کئے ہوئے خود دیکھا تھا۔ آنحضرت صلعم کے متعلق ان کے خیالات کی ایک نئی دنیا تعمیر ہونے لگی۔ کچھ دنوں انہوں نے اپنے خیالات بالکل پوشیدہ رکھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ انہوں نے آپؐ کو باقاعدہ پیغام نکاح بھیجا۔ آپ نے کہا۔ مجھے اس معاملہ میں اپنے چچا کی اجازت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ خدیجہؓ نے اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے ہاتھ ابو طالب کے پاس پیغام کے ساتھ تحائف بھی روانہ کئے ابو طالب کو عمر کے تفاوت کی وجہ سے تامل ہوا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک پچیس سال تھی اور خدیجہ کی چالیس سال۔ مگر ابو طالب کی بیوی کے مشورہ سے نسبت طے ہو گئی۔ ابو طالب مع اعزہ و اقربا آنحضرت کو لے کر خدیجہ کے مکان پر گئے۔ جہاں نکاح ہوا اور ابو طالب نے خطبہ پڑھا +

یہ ہے پچیس سالہ حیاتِ مبارک کا ایک سرسری خاکہ۔ مگر اس پر کسی تبصرہ سے

پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ دس سال کی عمر سے ۲۵ سال تک کی عمر کے ان حالات و واقعات کی اہمیت کیا ہے۔ آپ کی آئندہ زندگی اور اس زندگی کے مشن پر ان کا کیا اثر مترتب ہؤا اور اس وقت کے تجربات کی مدد سے آئندہ آپؐ نے کیا کام سرانجام دیئے۔ مختصر طور پر اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ آپ نے دس سال کی عمر میں اس سرزمین کو پہلی بار دیکھا۔ جس پر آپ کو آئندہ چل کر فیصلہ کن لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ پھر دوبارہ اس وقت دیکھا۔ جب شعور و بلوغ کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس کے تمام راستوں، منزلوں، پہاڑوں، اور ریگستانوں سے بنفس نفیس تفصیلی واقفیت حاصل کی۔ دفاع کے لئے اس قسم کے تجربات اور زمین کے طبعی حالات سے ایسی واقفیت نہایت ضروری و کار آمد تھی +

۲۔ پندرہ سال کی عمر میں آپؐ نے جنگِ فجار میں شریک ہو کر جنگ کے طریقوں اور اصولوں کا عملی تجربہ حاصل کیا۔ ایک روشن خیال، عالی دماغ، اولوالعزم اور ذہین و فطین نوجوان کے لئے یہ تجربہ نہایت مفید ثابت ہوا +

۳۔ اس عمر میں آپ نے عرب کے جھلستے ہوئے ریگستان میں متواتر کئی سال تک محنت و مشقت کی زندگی بسر کر کے صبر و برداشت اور قناعت کی تربیت حاصل کی۔ اور حیوانوں کی نگہداشت اور مویشی چرانے کی اہمیت کو صحیح طور پر سمجھا۔ صحرا کے سردار کے لئے یہ تربیت بہت ضروری اور کار آمد ہے +

۴۔ قافلہ کی سرداری کا تجربہ حاصل کر کے فوج کی سالاری کا اہم اصول سیکھا آپ کو قافلہ کے نظم و ضبط اور ضروریات سے پوری واقفیت ہو گئی۔ اس طرح آپ نے مخلوط قسم کے لوگوں کی سرداری کر کے سپہ سالاری کی ذمہ داریوں کو پوری طرح سمجھ لیا +

۵۔ آپ کی سچائی، ایمانداری، ہمدردی، جفاکشی اور دلیری کا سکہ دور و نزدیک کے سب لوگوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ سپہ سالار کے لئے یہ خوبیاں ازبس ضروری ہیں۔ ماضی و حال کے تمام بڑے بڑے فوجی مبصر و دفاعی ماہر اس پر متفق اللفظ ہیں۔ کہ فوج کے سالار میں یہ اوصاف لازمی ہیں۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس عمر میں علم و تجربہ اور ذاتی اوصاف و محامد کے اعتبار سے سپہ سالاری کی اعلیٰ ترین خوبیاں رکھتے تھے اور آپ کی بیدار مغزی و دور بینی نے اس علم و تجربہ کو آپ کا بہت بڑا معین و مددگار بنا دیا تھا۔

شادی کے بعد

آنحضرت صلعم کے نکاح میں آنے کے بعد حضرت خدیجہ نے اپنا تمام زر و نقد اور ساری منقولہ و غیر منقولہ جائداد اپنے عزیزوں اور بزرگوں کو مطلع کر کے آنحضرتؐ کے حوالہ کر دی۔ آنحضرتؐ نے اپنی زوجہ حضرت خدیجہؓ کی مرضی سے اسے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ جتنے غلام اور کنیزیں تھیں سب آزاد کر دی گئیں اور حضرت صلعم اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ درویشانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر

سنہ ۶۰۵ء میں مکہ میں بڑی کثرت سے بارش ہوئی جس کی وجہ سے خانہ کعبہ کی بنیادیں پھٹ گئیں۔ لہذا تمام قبائل نے مل کر فیصلہ کیا کہ اسے دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ بحر احمر میں ایک جہاز تباہ ہو گیا تھا۔ قریش نے اس کی لکڑی خرید کر اس سے کعبہ کی چھت بنانے کا سامان کیا۔ کعبہ میں ایک اندھا کنواں تھا جس میں لوگ نذرانے ڈال جاتے تھے اس روپے کو نکال کر اس سے تعمیر کی ضرورتیں پوری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر جب کبھی تعمیر شروع کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا۔ جسے بدشگونی سمجھ کر ملتوی کر دیا گیا۔ آخر جب تعمیر کا وقت آیا۔ تو اس کا کام سارے قبیلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور اس تقسیم کار کو سب نے منظور کر لیا۔ مگر حجر اسود کو ہٹانے اور ہٹا کر اس کی جگہ رکھنے کے سوال پر جھگڑا ہو گیا۔ ہر قبیلہ اپنی فوقیت و استحقاق جتا کر اس فخر سے خود مفتخر ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ جھگڑا بڑھ گیا۔ اور قبائل لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ آخر کار مکہ کے ایک معمر شخص کے مشورہ پر یہ طے پایا کہ کل علی الصبح جو شخص باب بنی شیبہ کی طرف سے خانہ کعبہ میں پہلے داخل ہو اسے حکم بنایا جائے اور وہ جو کچھ فیصلہ کرے اس پر عمل کیا جائے۔ اتفاق سے دوسرے دن علی الصبح اس دروازے سے جو شخص داخل ہوا وہ آنحضرتؐ

تھے۔ آپ امین کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ کی صداقت و دیانت کو سب مانتے تھے۔ آپ کو دیکھ کر سب خوش ہو گئے اور کہنے لگے امین آگیا۔ اس کا فیصلہ ہمیں منظور ہے۔ آپ نے جھگڑے کو اس دانائی و خوش اسلوبی سے طے کیا کہ سارے قبائل مطمئن ہو گئے۔ آپ نے پہلے ایک چادر بچھوائی۔ پھر اپنے ہاتھوں سے حجرِ اسود اٹھا کر اس پر رکھ دیا۔ اس کے بعد قبائل کے نمائندوں سے کہا کہ چادر کو پکڑ کر حجرِ اسود کو اٹھاؤ سب نے اٹھایا۔ جب اس مقام پر پہنچا۔ جہاں اس کو لگانا مقصود تھا۔ تو آپ نے اپنے ہاتھوں سے اسے وہاں رکھ دیا اور اس طرح ایک بڑے جھگڑے کو ختم کر دیا +

ریاضت و استغراق

اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر پینتیس سال تھی۔ زیادہ وقت ریاضت و استغراق میں بسر ہوتا۔ شہر سے باہر غارِ حرا میں مسلسل کئی کئی دن قیام فرماتے اور اس حقیقت کی جستجو میں مستغرق رہتے جس کی لگن دل کو ہر وقت بے قرار رکھتی۔ ماہ و سال اسی طرح گذرتے رہے۔ یہاں تک کہ ۶۱۱ء کو ماہ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو جبکہ عمر مبارک چالیس سال تھی۔ حضرت جبرئیلؑ آپؐ کے پاس غارِ حرا میں تشریف لائے اور پارچہ پر لکھی ہوئی ایک تحریر پیش کر کے فرمایا کہ اسے پڑھو۔ حضرت نے جواب دیا میں اُمّی یعنی پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر جبریل نے آنحضرتؐ کو بغل میں لے کر اس زور سے دبایا کہ تکلیف اور خوف سے آپؐ گھبرا گئے۔ اس کے بعد جبریل نے پھر فرمایا کہ پڑھو۔ آپؐ نے ڈرتے ڈرتے پڑھا اِقْرَأْ، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ ...... الخ اس کے بعد جبریل چلے گئے۔ آپ پر اس واقعہ کی ہیبت اتنی طاری ہوئی۔ کہ وہاں سے مکان پر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھا دو انہوں نے کمبل اڑھایا اور حال دریافت کیا تو آپؐ نے تردد کے ساتھ خوف کی وجہ بیان کی اور کہا کہ میرے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر آفت سے محفوظ رکھے گا۔ آپ صادق و امین اور رحمدل ہیں۔ دوسروں کی مصیبت میں کام آتے ہیں۔ مسکینوں اور محتاجوں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نبی ہوں گے۔ اس کے بعد آپؐ کو

ساتھ لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ عیسائی تھا اور اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم۔ اس نے حضرت خدیجہؓ کا بیان سُنکر کہا، خدیجہ اگر یہی واقعہ پیش آیا ہے جو تم بیان کرتی ہو تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ یہ جبریلؑ تھے اور یہ وہی فرشتہ ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے تھے۔ لہٰذا میرا علم یہ یقین دلاتا ہے کہ یہ ایک امت کے نبی ہوں گے۔ لیکن اظہار رسالت اور دعوۃ الی الحق پر آپ کو سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا ؛

آغازِ اسلام

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ کی وحی کے ذریعہ آپ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے اور یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کی آیت سے رسالت عطا ہوئی۔ روایت ہے کہ ایک روز آنحضرت استراحت فرما رہے تھے کہ جبریل آئے اور آواز دی کہ "اٹھو اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور نجاست سے الگ رہو۔ لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ اور اپنے پروردگار کی بزرگی بیان کرو"۔ جبریلؑ نے حضرت کو وضو کرنا سکھایا اور نماز پڑھائی۔ اس کے بعد آپؐ مکان پر تشریف لائے۔ حضرت خدیجہ کو وضو کرنا سکھایا اور نماز پڑھائی۔ اس طرح حضرت خدیجہ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد آپؐ کے چچازاد بھائی علیؓ ایمان لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی ؛

اب گویا اسلام کی دعوت کا کام شروع ہو گیا اور آنحضرت صلعم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنا کر اسلام کی طرف بلانے لگے۔ ابتدائی زمانہ میں جب نماز کا وقت آتا۔ تو حضرت اپنے نومسلم رفیقوں کو لے کر مکہ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے اور مشرکین کی مخالفت کے خوف سے چھپ کر نماز پڑھتے۔ مگر اس کی خبر لوگوں کو بہت جلد ہو گئی۔ صدائے توحید سے مشرک و کفار پریشان تھے۔ اس لئے انہوں نے آنحضرت کے خلاف دریدہ دہنی شروع کر دی۔ بعض لوگ اظہارِ افسوس کرتے اور کہتے کہ بڑا نیک کردار، راست گفتار اور دیانتدار آدمی تھا۔ مگر غاروں میں ریاضت کرکے دماغ درست نہیں رہا۔ عرب مشرک و بت پرست تھے یا کافر بے دین۔ اس لئے توحید و رسالت کی آواز انہیں بہت ہی عجیب و غریب معلوم ہوئی۔ موروثی عقاید اور موروثی عادات و اطوار کی مخالفت کا جو ردعمل

ہونا چاہیئے وہ قدرتی طور پر ہوا اور پوری شدّت و غلظت کے ساتھ ہوا۔ جب تک دعوت کا دائرہ محدود رہا۔ کفار و مشرکین کی مخالفت نے بھی شدّت اختیار نہیں کی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق علانیہ تبلیغ شروع ہوئی تو یہ مخالفت بھی سارے حدود و قیود سے آزاد ہوگئی۔ دریدہ دہنی، بدزبانی اور غوغا آرائی میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ لیکن چونکہ ابو طالب قریش کے سردار اور خانہ کعبہ کے محافظ و متولی تھے اور سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ اس لئے کسی کو آنحضرت صلعم کے نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ مگر علانیہ تبلیغ کے ساتھ شرک و بت پرستی کی جتنی مخالفت ہوتی تھی۔ کفار اتنے ہی جزبز ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ابو طالب سے شکایت کی کہ اپنے بھتیجے کو کعبہ کے خداؤں کے خلاف تقریریں کہنے سے روکو۔ لیکن اس شکایت کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابر تبلیغ فرماتے رہے اور کفار حق کی آواز کو روکنے میں کسی طرح کامیاب نہ ہوئے۔ تین سال اسی طرح گذر گئے۔ آنحضرت صلعم شادی و غم کے موقعوں پر بازاروں میں۔ مکہ کے سالانہ میلے میں غرض ہر جگہ لوگوں کو الٰہ کا پیغام سناتے اور کفار و مشرکین آپ پر آوازے کستے دیوانہ قرار دیتے، شور و غل مچاتے، استہزا کرتے۔ ۶۱۳ء میں آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اہلِ قریش کو جمع کیا۔ سب نے آپ کی صداقت و امانت کو تسلیم کیا۔ لیکن جونہی توحید کی آواز سنی برہم ہو کر چلے گئے۔ ایک طرف یہ مخالفت تھی جو تیزی سے معاندت میں بدل رہی تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ کفّار ابو طالب کی وجہ سے آنحضرت صلعم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن جس مسلمان پر بس چل جاتا تھا۔ اسے سخت اذیت دیتے تھے۔ مخالفت اور معاندت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان میں ابو طالب کی پوزیشن بڑی نازک تھی وہ نہ قوم کے خلاف جانا چاہتے تھے اور نہ آنحضرتؐ کی جدائی گوارا کر سکتے تھے۔ انہیں آپ سے محبت ہی نہیں تھی۔ بلکہ آپؐ کی خوبیوں کی وجہ سے احترام بھی کرتے تھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ان پر شکایتوں کا اثر نہیں ہوتا تو سردارانِ قبائل نے مل کر طے کیا کہ مسلمانوں کو سخت عذاب دیا جائے۔ مسلمانوں پر پہلے ہی کافی ظلم و تشدد ہو رہا تھا۔ اس فیصلے کے بعد جب عافیت کی کوئی توقع نہ رہی تو آنحضرت

نے انہیں حبشہ چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اس مشورہ پر مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ چھپ کر حبشہ چلا گیا۔ کفار نے یہ دیکھا تو وہاں بھی تعاقب کیا اور نجاشی شاہ حبشہ کے دربار میں اپنے آدمی بھیج کر مطالبہ کیا کہ یہ لوگ فسادی اور قوم کے مجرم ہیں۔ انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن اس میں بھی ناکام ہوئے۔

اس ناکامی سے جوش انتقام اور بھڑکا۔ انہوں نے مسلمانوں کا مقاطعہ کر دیا اور آنحضرتؐ کا سر قلم کرنے کے لئے انعام کی ایک خطیر رقم مقرر کی جس کے لئے عمر تیار ہوئے۔ مگر قتل کرنے کی بجائے وہ خود مسلمان ہو گئے۔ جب یہ حربے ناکام ہوئے تو کفار نے لالچ دینا شروع کیا اور کہلا بھیجا کہ محمدؐ کو اگر خواہش ہو، تو زر و دولت جمع کر دیں، اقتدار کی آرزو ہو تو اپنا سردار بنا لیں۔ اور اگر کسی بڑی جگہ شادی کرنا چاہیں تو حسین ترین عورت سے رشتہ کرا دیں۔ مگر آنحضرت صلعم کو ان چیزوں سے کیا واسطہ؟ آپؐ نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ ابو طالب نے قریش کی معاندت دیکھ کر بنی ہاشم سے استعانت کی درخواست کی۔ بنی ہاشم مدد دینے کو تیار ہوئے تو قریش نے ان کا بھی بائیکاٹ کر دیا۔ یہ واقعہ ۶۱۶ء کا ہے۔ بالآخر جب حالات بہت نازک ہو گئے اور قریش کی چیرہ دستیوں سے امان کی کوئی صورت ممکن نظر نہ آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لئے ابو طالب اپنے پورے خاندان کو لے کر پہاڑ کی ایک گھاٹی میں چلے گئے۔ جو بعد میں شعب ابی طالب کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس گھاٹی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابو طالب اور سارے اہل خاندان نے تین سال انتہائی عسرت و پریشانی میں بسر کئے۔ قریش نے کھانے پینے کا سامان تک بند کر دیا تھا۔ جب کھانے کو کچھ نہ رہا تو درختوں کی جڑوں پتوں اور سوکھے ہوئے چمڑے کو چبا چبا کر وقت گذارا۔ لیکن آنحضرت صلعم کی تبلیغ اسلام کا سلسلہ قطع نہ ہوا۔ جو قبائل کعبہ کی زیارت کو آتے یا میلوں اور بازاروں میں جمع ہوتے۔ آپ ان کے پاس جاتے، اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے اور شرک و بت پرستی ترک کر کے موحد و مسلم بننے کی تلقین فرماتے۔ تین سال بعد اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کیا کہ قریش نے دوسرے قبائل کے ساتھ مقاطعہ کا جو معاہدہ کیا ہے۔ اس کی تحریر کو دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کا

تذکرہ ابو طالب سے کیا۔ ابو طالب نے معاہدہ کی تحریر طلب کی تو مقاطعہ کے عہد کے الفاظ صاف نہ تھے۔ اسی وقت معاہدہ چاک کر دیا گیا اور بنی ہاشم گھاٹی سے باہر نکل آئے ؛

شعبِ ابی طالب کے مصائب کے زمانہ میں آنحضرتؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ نے رحلت فرمائی۔ اس کے بعد جب مقاطعہ کے شدائد کا خاتمہ ہوا اور آنحضرت معہ اہل و خاندان مکہ واپس آ گئے تو کچھ دنوں بعد ابو طالب کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال سے مشرکین کے حوصلے اور بڑھ گئے اور آنحضرت صلعم کو طرح طرح سے ایذا پہنچانے لگے ؛

مکہ میں ایذا رسانی کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ آپ طائف کے لوگوں کو حق کا پیغام پہنچانے کے لئے طائف تشریف لے گئے۔ مگر کفار نے آپؐ کے پیچھے پیچھے اپنے چند با اثر آدمیوں کو بھیج دیا۔ جن کے ورغلانے سے طائف والوں نے نہ صرف آپ کے ساتھ استہزاء کیا۔ آپؐ کو جھوٹا کہا اور پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ نہایت بدسلوکی سے پیش آئے۔ اور جب واپس تشریف لانے لگے۔ تو اوباشوں نے اتنے پتھر مارے کہ آپؐ لہولہان ہو گئے ؛

نبوت کے گیارہویں سال مکہ میں اسریٰ کا واقعہ پیش آیا۔ آپؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ؛

تبلیغِ اسلام آپ کی زندگی کا واحد نصب العین تھا۔ کفار و مشرکین کی شر انگیزیوں کے مقابلہ میں ابو طالب کی ذات عالمِ اسباب میں حفاظت کا بڑا ذریعہ تھی۔ ان کے انتقال کے بعد کوئی روک ٹوک نہ رہی اور دشمنانِ اسلام اپنے مذموم ارادوں میں بہت دلیر ہو گئے۔ لیکن آنحضرت کے پائے ثبات و استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔ تبلیغ کے سلسلہ میں ایک دن آپؐ یثرب کے قبیلہ اوس اور خزرج کے کچھ لوگوں کے پاس تشریف لے گئے جو مکہ کے قریب عقبہ میں مقیم تھے اور کعبہ کی زیارت کو آئے تھے۔ آپؐ نے ان کو خدا کا پیغام پہنچایا۔ اور اسلام کی خوبیاں سمجھائیں وہ مسلمان ہو گئے۔ دوسرے سال یثرب سے کچھ اور لوگ آئے۔ آپؐ نے ان میں بھی تبلیغ کی وہ بھی مسلمان ہو گئے اور نہ صرف مسلمان ہوئے۔ بلکہ آپؐ کو یثرب آنے کی دعوت دی۔ اور حق کی حفاظت و حمایت کا اعلان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی دعوت قبول فرمائی۔ جب یہ نو مسلم

یثرب واپس آئے تو انہوں نے وہاں کے لوگوں میں اسلام کا چرچا کیا اور آنحضرتؐ کے اوصاف و محامد بیان کیئے اس سے یثرب کے دوسرے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی خوبیاں جاگزین ہونے لگیں اور حلقہ بگوشان اسلام کا دائرہ روز بروز بڑھنے لگا۔

اہل مکہ کو جب یثرب میں اسلام کی ترقی و اشاعت کی خبر ہوئی تو انہوں نے اسلام کو بیخ و بن سے مٹانے کا فیصلہ کر لیا اور سرکردہ لوگوں نے مل کر یہ طے کیا کہ آنحضرتؐ کو قتل کر دیا جائے اور نہ صرف یہ کہ قتل کر دیا جائے۔ بلکہ قتل کرنے کا پورا منصوبہ بنا کر اس پر عمل کرنے کے لیئے آدمیوں کا انتخاب بھی کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی جو لوگ ایمان لے آئے تھے ان کو ہر ممکن طریقہ سے مبتلائے عذاب کرنا شروع کر دیا۔ جب مسلمانوں کا مکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا تو آپ نے انہیں ہجرت کر کے یثرب چلے جانے کی ہدایت فرمائی۔ اس پر آہستہ آہستہ ایک سو خاندان یثرب چلے گئے۔ جب انہیں یہ خبر ہوئی۔ کہ سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علیؓ اور ابوبکرؓ کے تمام مسلمان یثرب پہنچ چکے ہیں تو کفار نے اپنے منصوبہ پر عمل کرنے میں تعجیل سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ اور ایک دن رات کے وقت آپ کے مکان کا محاصرہ کر کے مقررہ کفار تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے۔ مگر آنحضرت اس محاصرہ سے نکل کر اور ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر تین دن تک غار ثور میں چھپے رہے۔ کفار کو یہ ناکامی بہت شاق گذری۔ انہوں نے آپ کی گرفتاری کے لئے لوگوں کو بڑے بڑے انعامات کے لالچ دیئے اور چاروں طرف سراغرسان دوڑائے۔ مگر ناکام رہے۔ جب آنحضرتؐ نے میدان صاف دیکھا تو تین دن بعد دشوار گذار راستہ طے کرتے ہوئے ۲ر جولائی ۶۲۲ء کو یثرب پہنچ گئے۔

یثرب والوں پر آپ کی آمد کا بڑا اثر ہوا۔ انہیں آپؐ کی سچائی، سادگی، ایمانداری، انصاف پسندی، اولوالعزمی، دیانت و وفاشعاری اور ہمدردیٔ خلائق کو بالکل قریب سے دیکھنے اور آپ کی عظمت و علوئے مرتبت کا صحیح اندازہ لگانے کا موقعہ ملا۔ سیرت و کردار مبارک کے محاسن کو جو بھی دیکھتا۔ گرویدہ ہو جاتا اور ایمان لے آتا۔ اسلام کا حلقہ تیزی سے بڑھنے لگا۔ قبائل کی دیرینہ عداوتیں دور ہو گئیں۔ مہاجرین و انصار بھائی بھائی بن گئے کہ دمہ کے امتیازات مٹ گئے۔ زندگی سر تا سر رحمت بن گئی۔ یثرب اب تک یثرب تھا۔ آنحضرتؐ کے تشریف لانے کے بعد مدینۃ النبی

ہو گیا۔ جو آج تک مدینہ کے نام سے مشہور ہے۔

سرِّ دلبراں در حدیثِ دیگراں

اب سے

خوش تر آں باشد کہ سرِّ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

کے مصداق ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی مستشرق کے وہ تاثرات پیش کیے جاتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب "تمدنِ عرب" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق قلمبند کیے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ فرانس مذہبی اعتبار سے بہت قدامت پسند ہے۔ وہاں ابھی تک رومن کیتھولک مذہب رائج ہے اور یہی وہ ملک ہے یہاں سے صلیبی جنگ کا غلغلہ بلند ہوا تھا اور یہی آخر تک ان جنگوں کا مذہبی وسیاسی مرکز بنا رہا۔ وہ لکھتا ہے:۔

"اب ہم عرب مورخین کے اخبار کو سامنے رکھ کر حضرت کی پرائیویٹ زندگی اور ذاتی خصائل کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ابوالفدا اپنے معاصرین کے بیانات کی بنا پر رقمطراز ہے۔

حضرت علیؑ جنابِ رسالتمآب کے اولین پیرو ہیں۔ آپ کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ حضرت کا قد میانہ تھا۔ سر مبارک بڑا اور ریش مبارک گھنی تھی۔ جسم مضبوط اور توانا تھا۔ چہرہ مبارک بھرا ہوا اور رنگ سرخی مائل سفید تھا۔ پیشانی اور ریش مبارک کے چند سفید بالوں سے آپ کے سن کا مشکل سے اندازہ ہو سکتا تھا۔ خصائصِ روحانی کی بنا پر آپ تمام عالم پر فائق ہیں۔ کثرتِ عبادت نے فضول کلام سے متنفر کر دیا تھا۔ اکثر اوقات آپ خاموش رہتے۔ چہرہ سے اعلیٰ درجہ کی نیکی ٹپکتی تھی۔ مزاج میں بے حد خلق اور انصاف تھا۔ اجنبی اور دوست، قوی اور کمزور سب پر یکساں نظر فرماتے تھے۔ غربا ومساکین سے خاص محبت تھی۔ جس طرح غربا کو افلاس کی وجہ سے ذلیل نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح امراء کی قدر مال و دولت کی وجہ سے نہیں کرتے تھے۔ صحابہ اور ملاقاتیوں کی خاطر اس درجہ منظور تھی کہ صحابہ کو کبھی سخت جواب نہ دیتے اور ملاقاتیوں کی بات انتہائی توجہ وتحمل سے سنتے اور جب تک وہ نہ اُٹھتے خود بھی اُٹھنے کا قصد نہ فرماتے۔ اسی طرح جب کوئی مصافحہ

کرتا۔ تو آپ اپنا ہاتھ کبھی پہلے نہ کھینچتے۔ جب کوئی شخص کسی معاملہ پر گفتگو کرتا تب بھی آپؐ کی عادت یہی تھی کہ خود پہلے علیحدہ نہ ہوتے۔ اکثر صحابہ سے ملنے خود تشریف لے جاتے اور ان کی مزاج پرسی فرماتے۔ اپنی بکریوں کا دودھ خود دوہتے۔ اپنے کپڑے خود ہی کر پہن لیتے۔ مساکین کو جمع رکھتے جو اہلِ صفہ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ وہ بے خانماں عرب تھے۔ جن کا کوئی گھر در نہ تھا۔ رات کو مسجدِ نبوی میں سو رہتے اور دن کو وہیں اٹھتے بیٹھتے۔ مسجد کا چبوترہ ان کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ جس وقت کھانا تناول فرماتے۔ تو ان میں ایک دو کو اپنے ساتھ کھلاتے اور باقی کو صحابہ پر تقسیم فرما دیتے تاکہ انہیں وہاں سے آذوقہ ملے"؂

ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہانِ فانی سے اس طرح رحلت فرمائی کہ ایک مرتبہ بھی پیٹ بھر کر نانِ جویں نہیں کھائی۔ اکثر ایسا ہوا کہ دو دو مہینے تک چولہا نہیں جلا اور آپ کی غذا صرف خرما اور پانی رہی۔ بعض اوقات بھوک کی شدت پیٹ پر پتھر باندھ کر سہنی پڑی؂

اس بیان میں دوسرے عرب مورخین کی روایت سے اتنا اور اضافہ ہونا چاہیئے کہ حضرت کو اپنے نفس پر بے انتہا کنٹرول تھا۔ آپ غور و فکر کے نہایت درجہ عادی، بہت کم سخن اور ارادوں میں نہایت مضبوط تھے۔ سادگی حیرت انگیز تھی۔ جسم اطہر کو نہایت پاک و صاف رکھتے۔ اپنا ذاتی کام کبھی اس وقت بھی کسی دوسرے سے نہیں کرایا۔ جب صاحب مال و متاع ہوئے تھے۔ محنت کشی کی صلاحیت بے پایاں تھی جس درجہ جسبت و مستعد تھے اسی قدر صابر و شاکر بھی تھے۔ آپ کا غلام اٹھارہ سال تک آپ کی خدمت میں رہا اس کا بیان ہے کہ اس مدت میں آنحضرتؐ کبھی ایک دفعہ بھی خفا نہیں ہوئے جنگ میں نہایت جری تھے۔ خطرہ سے کبھی پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ مگر بلا وجہ اپنے آپ کو خطرہ میں بھی نہ ڈالتے تھے۔ تہور و جسارت جو عیر مآل اندیشی کا نتیجہ ہوتی ہے آپؐ میں نہ تھی۔ آپ نہایت درجہ دور اندیش تھے؂

حضرت کی وفات کے بعد آپ کے مساعی کے ثمرات یہ تھے کہ ساری عرب قوم متحد ہو چکی تھی جو ایک مذہب پر قائم اور ایک خلیفہ کی تابع فرمان تھی۔ اس بات کی تحقیق کہ آیا یہ نتیجہ وہی تھا جو حضرت نے حاصل کرنا چاہا تھا۔ بالکل فضول ہے۔ سچ یہ

ہے کہ ہم ان اسباب وعلل سے جن سے تاریخ انسانی کے واقعات ظہور میں آتے ہیں اس قدر کم واقف ہیں کہ عام مورخین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جو نتائج بڑے لوگوں کی کوششوں سے حاصل ہوئے ہیں وہ وہی ہیں جو ان کے مدِنظر رہے۔ لیکن آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمومی قاعدہ بالکل غلط ہے۔

بہر نوع اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت نے عرب میں وہ نتائج پیدا کئے جو قبل از اسلام کوئی دوسرا مذہب (جن میں یہود و نصاریٰ شامل ہیں) پیدا نہ کر سکا حضرت نے عربوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ اس کا اندازہ اس جواب سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو حضرت عمرؓ کے قاصد نے شاہِ ایران کو حضرت کے احسانات کے بارے میں دیا تھا۔ اس نے کہا۔

"اے بادشاہ ہم ایسی ذلیل حالت میں تھے کہ ہم میں سے بعض لوگ اپنا پیٹ کیڑے مکوڑے اور سانپ بچھو کھا کر بھرتے تھے۔ بعض لڑکیوں کو اس وجہ سے مار ڈالتے تھے کہ انہیں اپنے کھانے میں شریک نہ کرنا پڑے۔ جہالت اور بت پرستی کی تاریکی میں پھنسے ہوئے بغیر قانون و بے لگام ہمیشہ ایک دوسرے کی دشمنی پر کمربستہ رہتے تھے۔ لوٹ مار اور آپس میں ایک دوسرے کو تباہ کرنا ہمارا کام تھا۔ یہ ہماری پہلی تصویر تھی۔ لیکن اب ہم ایک نئی قوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک ایسا شخص پیدا کیا جو خاندانی شرافت اور فہم و ادراک میں سارے عرب میں فائق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نبی اور رسول بنایا ہے اور اسی کے ذریعے ہمیں بتایا کہ میں ہوں الٰہ واحدٌ صمدٌ خالق کون و مکان، میرے رحم نے تمہارے لئے ایک ہادی بھیجا ہے تمہیں راہِ راست پر لانے کے لئے جس راہ کی وہ ہدایت کرتا ہے وہ تمہیں اس عذاب سے بچا لے گی جو میں نے آخرت میں کافروں اور گنہگاروں کے لئے مقرر کیا ہے اور تمہیں میرے عرش کے سامنے مقامِ آسایش تک پہنچا دے گی۔ اس تعلیم نے ہمارے دلوں پر بتدریج اثر کیا اور ہم نے اپنے پیغمبر کی ہدایت کو قبول کیا۔ ہم مانتے ہیں کہ ہمارے پیغمبر کا کلام اللہ کا کلام ہے اور اس کے احکام اللہ کے احکام ہیں۔ جس مذہب کی تعلیم اس نے دی وہی سچا مذہب ہے۔ اس نے ہمارے شعور کو چمکایا، ہم میں اخوت پیدا کی اور ہمارے لئے اپنی فہم خداداد سے قوانین مقرر کئے۔

اگر اشخاص کی وقعت وفضیلت کا اندازہ انکے کاموں سے کیا جاتا ہے تو ہم کہینگے کہ حضرت تاریخ الرجال میں بہت بڑے آدمی گذرے ہیں۔ قدیم مورخین نے مذہبی تعصب کی بنا پر ان کے کاموں کی پوری وقعت نہیں کی۔ لیکن فی زمانہ مورخین (نصاری) انصاف پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ موسیو بارو تعلیمی سینٹ ہیلیئر جو اس وقت کے سربرآوردہ مورخین میں سے ہیں۔ آنحضرتؐ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:۔

"حضرت محمدؐ اپنے زمانہ کے عربوں میں سب سے زیادہ فہیم، سب سے زیادہ باخدا اور سب سے زیادہ رحم دل انسان تھے۔ آپؐ نے جو کچھ اقتدار حاصل کیا۔ اپنی ذاتی فضیلت کی بنا پر کیا اور آپؐ نے جس مذہب کی اشاعت کی وہ ان اقوام کے لئے جنہوں نے اسے قبول کیا۔ ایک نعمتِ عظمیٰ بن گیا"

یہ اوصاف جنہیں غیروں نے بھی تسلیم کیا ہے لفظ بلفظ اس لئے نقل کر دیئے گئے ہیں تاکہ ان کا مقابلہ ان اوصاف وخصائل سے کیا جا سکے جو دنیا کے بڑے بڑے فوجی مبصرین کے خیال کے مطابق ایک فوجی جرنیل میں ہونے چاہئیں۔ آنحضرتؐ کے اوصافِ حمیدہ کا مزید ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے بغیر آپؐ کے غزوات کی اہمیت اور آپ کی شخصیت کی عظمت صحیح طور سے ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔

آنحضرتؐ نے بہ حیثیتِ پیغمبر جس مذہب کی اشاعت کی وہ بہت سادہ مگر نہایت شاندار مذہب ہے اور اسے دو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کیا جاتا ہے جو جامعیت کے اعتبار سے معانی کی ایک دنیا اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ۔ یہی اختصار و سادگی اسلام کی جان اور وحدانیت کا نشان ہے۔ اور یہی اسلام اور مسلمانوں کی قوت وعظمت کا سرچشمہ۔ اس سے تمدنی فلاح کے جو سوتے پھوٹتے ہیں۔ وہ حیاتِ انسانی کی پوری کائنات کو سیراب و شاداب کرتے چلے جاتے ہیں۔

تقدیر

زندگی عمل اور عمل پیہم کا نام ہے اور اسلام اس عمل کا بہترین ضابطہ پیش کرتا ہے۔ لیکن کچھ قصور فہم اور کچھ تعصب و غلط نمائی کے جذبے سے عقیدۂ تقدیر کو

نصرانی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے جواز میں ہم پہلے مشہور عیسائی راہب و مصلح لوتھر کی کتاب اصلاحِ مذہب عیسوی" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"اقوامِ عالم کی ساری مذہبی کتابوں میں تقدیر کا مسئلہ موجود ہے۔ قدمائے روم و یونان نے اس کا نام قسمت رکھا تھا۔ اور اسے ایسی قوت فرض کیا تھا جو ساری چیزوں کی سرتاج تھی اور جس کی اطاعت انسانوں اور دیوتاؤں دونوں پر لازم تھی۔ جن واقعات کو قسمت مقرر کر دیتی تھی وہ ہمیشہ وقوع میں آتے تھے۔ مذہب اسلام نے تقدیر کو اس سے زیادہ وقعت نہیں دی ہے۔ جو اس نے دوسرے مذاہب میں پائی ہے۔ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں، کہ اسلام نے اتنی بھی وقعت نہیں دی ہے۔ جتنی آج کل دوسرے علماء کے مذاہب نے دے رکھی ہے"۔

لوتھر کی یہ نقاطی وضاحت اس الزام کا ایک حد تک جواب ضرور کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس سے اسلام کے عقیدۂ جبر و قدر (تقدیر) کی تشریح نہیں ہوتی:

بقول لوتھر تقدیر یا قسمت کا عقیدہ دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہے اور اسے جمود و بے چارگی اور بے عملی کا جواز بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اس تصور اور اس عقیدہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ سرے سے اس کی نفی کر کے اعلان کرتا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ انسان کو وہی ملتا ہے۔ جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ جہد و عمل مشروط بہ تسلیم و رضا اس کی ساری تعلیم کا لُبِّ لباب ہے۔ فرد سے لے کر اجتماع تک سب پر ایک ہی قانون حاوی ہے۔ اگر جمود و بے عملی ہے تو اس کے نتائج اس کے مطابق ہوں گے۔ اور جہد و عمل ہے تو اس کے مطابق۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ سعی و جہد نہ ہو اور حالات و نتائج حسب مراد بر آمد ہوں یا اپنی حالت بدلنے یا ترقی کرنے کی خود کوئی کوشش نہ کریں۔ راہ کی مشکلات کے خوف سے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں اور ہماری حالت بدل جائے۔ وہ کہتا ہے خدا اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا۔ جس کو خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔ پھر بھی نہیں۔ مایوس ہونا، یا ہمت ہار کر بیٹھ رہنا اس کے یہاں کفر ہے۔ ناکامیوں اور آلام و مصائب کا کیسا ہی ہجوم ہو۔ وہ ساعی اور شاکر و صابر رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونے سے روکتا ہے اور کہتا ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

اگر تقدیر کے معنی یہی ہوتے جو عام طور پر سمجھے جاتے ہیں یا جذبۂ غلط نمائی کی بنا پر پیش کئے جاتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی میں اس کا نمونہ ملنا چاہیئے تھا۔ آنحضرتؐ اسلام کے بانی، اس کے شارع اور اس کے سب سے بڑے عالم و عامل تھے لیکن ہر شخص حیاتِ مبارک کے موٹے موٹے واقعات پر سرسری نظر ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ آپ کو کیسے کیسے ابتلاء سے گذرنا پڑا، کیسے کیسے دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور تبلیغ اسلام میں کیسے کیسے موانع پیش آئے۔ پھر آپ نے کس کس طرح ان پر کامیابی حاصل کی، کس صبر و برداشت اور تحمل سے کام لیا اور کیسی کیسی صعوبتیں اٹھا کر الہٰ کا کلمہ بلند کیا۔ اگر تقدیر کا مفہوم وہی تھا جو پیش کیا جاتا ہے تو آنحضرت کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ان مصائب و شدائد کو برداشت کرتے۔ اپنوں اور غیروں کی دشمنیاں مول لیتے۔ جان کو خطرے میں ڈالتے، مفروضہ عقیدہ تقدیر کے مطابق جو کچھ ہونے والا تھا وہ ہو رہتا اور اگر ضرورت ہوتی تو بہ حیثیت پیغمبر و رسول آپ اللہ تعالیٰ سے "تقدیر" کو بدلوا لیتے۔ نہ زہرہ گداز تکلیفیں اٹھانی پڑتیں۔ نہ کوئی دشمن بنتا، نہ ہجرت کرنی پڑتی، نہ جہاد و غزوات کی نوبت آتی ۔

لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ جہد و سعی اور تدبیر ہی ہر کام کی مدار علیہ اور ہر کامیابی کو مستلزم ہے جو کوشش کرے گا۔ ہاتھ پیر ہلائے گا اور سعی و جہد عمل میں لائے گا وہی کامیاب ہوگا اور اپنے مقصد کو پہنچ کر رہے گا۔ اسلام میں سعی و جہد اور عملِ صالح کی تلقین تسلیم و رضا کے ساتھ مشروط ہے۔ کوشش و عمل کا سر رشتہ انسان کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے اور نتیجہ کا اللہ تعالیٰ کے۔ وہ کہتا ہے تم حرکت کرو۔ سعی و جہد عمل میں لاؤ اور نتیجہ کا معاملہ خدا کے سپرد کر دو۔ اسی کا نام تسلیم و رضا ہے اور اسی کو مشیتِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تم عالمِ اسباب میں ہو۔ ان سے کام لینا اور جد و جہد کرنا تمہارا کام ہے۔ اسے بار آور کرنا اور نتیجہ دینا خدا کا۔ اسے خدا پر چھوڑ دو۔ یہ زندگی کی خوش کامی اور خوشگواری کا کتنا بڑا راز ہے۔ اگر حرکت و عمل ہی زندگی ہے تو اسلام نے اس کو بہتر و برتر بنانے کا کیسا گر سکھایا ہے۔ اور اس کی تلخیوں اور ناکامیوں کا بار ہلکا کر کے اسے کس طرح خوشگوار بنایا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آنحضرت غزوات میں فن حرب و سیاست کی ماہرانہ تدبیریں اختیار کرنے کے بعد آخر میں بارگاہِ ایزدی میں سر بسجود ہو کر دعائیں نہ فرماتے۔

اور اس کی نصرت و اعانت طلب نہ کرتے۔ پھر جب مسلمان مصائب سے گھبرا کر کہنے لگے تھے کہ اللہ کی مدد کب پہنچے گی تو یہ تسکین بخش فرمانِ الٰہی نہ آتا کہ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

کتاب کی غرض و غایت کے مطابق مسئلۂ تقدیر کی یہ تشریح غالباً کافی ہے اور یہ بھی ہم نے اس لئے ضروری سمجھی کہ آنحضرت اور آپ کے خلفاء کی فوق العادہ کامیابیوں اور غزوات و سرایا میں مٹھی بھر مسلمانوں کے کثیر التعداد کفار و مشرکین پر فتح و غلبہ کو بہت سے لوگ آج بھی تقدیر کی کرشمہ کاری سمجھتے ہیں اور ملت کی موجودہ پستی و پسماندگی کو بھی تقدیر ہی کی تہی دامنی سے وابستہ کرتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرت صلعم اور آپ کے جانشینوں کی پاک زندگیاں سرتاسر عمل تھیں اور چونکہ سرتاسر عمل تھیں اور فکر و عمل کے سارے قویٰ مستعد و مضبوط اور دل خلوص وللّٰہیت سے معمور تھے۔ اس لئے الٰہ تعالیٰ کی نصرت بھی ان کے شاملِ حال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کام کبھی فرشتوں سے نہیں کرائے۔ میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے لڑنے کے لئے کبھی فرشتے نہیں بھیجے۔ اور انہوں نے کبھی ملک فتح نہیں کئے۔ یہ سب کام آنحضرتؐ نے کئے۔ آپؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والوں نے کئے اور انہوں نے کئے۔ جو فہم و فراست، تدبر و دانائی، دور بینی و مآل اندیشی، جرأت و حوصلہ مندی، اولوالعزمی و عالی ظرفی، شجاعت و دلیری، محنت و جفاکشی، خوش خلقی و سادگی، ہمدردی و انصاف پروری، اخوت و رواداری، اور تحمل و بردباری کی صفات سے متصف تھے اور جنہوں نے میدانِ جنگ میں مہارت فنِ حرب اور سیاست و موقع شناسی سے کام لیا۔ الٰہ کا قانون ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ وہ کبھی نہیں بدلتا۔ نہ اگلوں کے لئے بدلا۔ نہ پچھلوں کے لئے بدلیگا اس نے اپنی رحمتِ کاملہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ زندگی، اس کے عمل اور اس کی کامیابیوں کا بہترین نمونہ پیش کر کے دکھا دیا۔ اس کی تقلید کرنا زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کی متابعت کرنا اور دل و دماغ دونوں کی آنکھیں کھول کر کرنا یہ ہمارا کام ہے۔

اپنے زمانہ کی کوئی مثال لے لیجئے۔ ماضی کے کسی بڑے آدمی کے سوانحِ حیات پر نظر ڈال جایئے۔ شہرت و ناموری اور بڑائی کی وجہ کیا ہے؟ کیوں وہ دوسروں سے ممتاز

بنا؟ کیوں دوسروں نے اسے اپنا مطاع اور رہنما بنایا؟ اس وجہ سے کہ اس نے اپنے اندر چند صفات پیدا کر کے انہیں ترقی دی۔ دل و دماغ کی صلاحیتوں کو صحیح طریقہ سے بروئے کار لایا۔ اس لئے دوسروں سے بلند ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی بات مانی، نہ مانی تو اپنی طاقت سے منوائی۔ سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ عزت و عظمت ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ عروج و اقتدار کی مسند بچھ گئی اور وہ سب کچھ ہو گیا جو ہو سکتا تھا۔ قائدِ اعظم لینن۔ ہٹلر۔ مسولینی۔ گاندھی وغیرہ کی شخصیتیں اور ان کے کردار کے ابواب ابھی کل ہی بند ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی تقدیر خود بنائی وہ اپنی قوموں کے محسن و مطاع بنے اور بامِ عروج پر پہنچ کر جریدۂ عالم پر اپنا دوام ثبت کر گئے۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اتنی بھی نسبت نہیں۔ جتنی زمین کو آسمان سے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوعِ انسان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ حیاتِ مبارک از اوّل تا آخر ایک نمونہ اور ایک سبق ہے آپ کے فیضِ ہدایت و تربیت سے بادیہ نشینانِ عرب دنیا کے لئے رحمت و برکت بنے عقل و فراست اور علم و عمل کے ایسے چشمے پھوٹے کہ ساری دنیا سیراب ہو گئی۔ مگر اب قافلۂ ملت گم کردہ راہ ہے اور نجاح و فلاح کے واحد راستہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھٹک رہا ہے۔ اے کاش یہ پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے۔ اے کاش یہ سارے راستوں سے منہ موڑ کر اور ساری رہنمائیوں سے قطع تعلق کر کے پھر اسی ذاتِ رحمت صفات سے کسبِ فیض کرے جس کے فیضان سے انسانیت نے امان پائی مسلمان قوموں کی راہبری پر مامور ہوئے۔ کشور کشائی ان کی میراث بنی اور عزت و سربلندی طرۂ امتیاز :

۱۔ ہجرت دفاعی نقطۂ نظر سے

پچھلے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنِ ولادت سے ہجرت تک کے واقعات مختلف کتبِ تاریخ و سیرت سے اخذ کر کے ملخصاً پیش کئے گئے ہیں اب حیاتِ مبارک کے اس حصہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو عموماً تاریکی میں رہا ہے۔ گو ہمارا حال اس ریزہ چین کا سا ہے جو سنار کی دکان پر اس لئے جھاڑو دیا کرتا ہے کہ اسے سونے چاندی کے کچھ ذرات مل جائیں کبھی وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام اسی طرح حالات و واقعات کے انبار میں سے ہم نے بھی کام کے موتی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اصل کام یہ ہے کہ حشو و زوائد اور حکایت آرائی سے پاک کر کے انہیں علت و معلول کے منطقی ربط کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ آنحضرت کی زندگی کا وہ پہلو پوری طرح سامنے آجائے جو عام و خاص سب کی نظروں سے مخفی رہا ہے اور جس پر غور کرنے اور جسے روشنی میں لانے کی غالباً کسی نے کبھی کوشش نہیں کی ؛

غزوہ اور عام جنگ میں معناً کوئی فرق نہیں صرف اصطلاحی فرق ہے۔ غزوہ اس لڑائی کو کہتے ہیں جو آنحضرتؐ نے لڑی اور جس میں بہ نفسِ نفیس قاید و سالارِ لشکر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک فرق اثر و نتیجہ کا بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ غزوات کے بعد لوگوں کو امن و عافیت، آرام و اطمینان اور خوش حالی و فارغ البالی میسر آئی اور عام لڑائیاں اپنے جلو میں ہمیشہ تباہ کاریاں، بدحالیاں، اخلاقی رذائل اور افلاس و پریشانی لاتی ہیں ؛

پھر غزوات کے ساتھ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں آنحضرت کو ہمیشہ فتح ہوئی اور کفار و مشرکین کو ہمیشہ شکست۔ ادھر فوجوں کی کثرت، سامانِ حرب و ضرب کی

بہتات مال و دولت کی افراط۔ ادھر تعداد قلیل، فوج ساز و سامان سے غیر آراستہ محض خدا پر توکّل۔ اکثر سامانِ رسد بھی نہایت معمولی، دشمن ڈینگیں مارتے ہیں۔ برسوں تیاریاں کرتے ہیں۔ بڑی سے بڑی جمعیت پیدا کرتے ہیں مگر خاسر و ناکام رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نتائج کا یہ تفاوت کوئی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں۔ کیا افسانہ و حکایت کی طرح انہیں پڑھ کر یونہی نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ کیا تبلیغ اسلام کی راہ کے موانع کو دور کرنے اور دشمنوں کے جارحانہ عزائم کا مقابلہ کرنے کے لئے جنگ و پیکار کے یہ معرکے آنحضرت کے مشن میں سنگِ میل کی حیثیت نہیں رکھتے۔ کیا ان میں فوق العادہ کامیابیاں آپ کی شجاعت و حوصلہ مندی، تدبر و سیاست اور فنِ جنگ میں مہارت کی دلیل نہیں ہیں۔ لیکن سہو کہئے یا غفلت و بے شعوری کہ دوسرے تو درکنار خود مسلمان مورخوں، اور سیرت نگاروں نے حیاتِ مبارک کے اس پہلو کو افسانہ و حکایت بنا کر اس طرح پیغمبرانہ تصرف و اعجاز نمائی قرار دیا ہے کہ اس پر غور و توجہ کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ یوں آپ کے ہر قول و عمل کو واجب التسلیم کہا جائے گا۔ مگر مابعد ہجرت کی پوری زندگی اور اس زندگی کی جد و جہد کے جزئیات اور ان کی بصیرت کے معاملہ کو دیکھیئے تو میدان صاف اور کامل سکوت و بے خبری نظر آئے گی اسے نہ حدیث میں شامل کیا جائے گا نہ موعظت و حکمت میں، یہاں تک کہ سیرت و تاریخ کے اوراق بھی خالی نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کو اس کا خیال بھی نہیں۔ کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا یہ آخری و اہم ترین دور جو کفار و مشرکین اور معاندینِ اسلام کی ریشہ دوانیوں اور دشمنانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنے، امورِ مملکت کا انتظام و انصرام فرمانے اور میدانِ جنگ میں کفار کے لشکروں کو ہزیمت دینے میں گذرا۔ وہ حکمت و سیاست اور فنِ جنگ میں ماہرانہ قیادت کے اعتبار سے اتنا ہی اہم ہے۔ جتنے اقوال و اعمالِ مبارک کے دوسرے مجموعے۔ جس طرح دینی و دنیوی فلاح کے لئے ان سے بہتر کوئی ضابطہ نہیں۔ اسی طرح تاریخِ عالم میں اس کی بھی کوئی مثال نہیں۔ اس کوتاہی کے اظہار سے نعنت و عیب چینی مقصود نہیں۔ ہمیں اپنی بے بضاعتی و کم نظری کا احساس ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی نئی چیز پیش نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ آنحضرتؐ کو ہادیٔ برحق اور مطاعِ مطلق سمجھتے ہیں تو حیاتِ نبوی کے

ایک بڑے بلکہ سب سے بڑے عملی پہلو کو فراموش کر کے عقیدت و پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ زندگی کا یہ پہلو سرتا سر عمل و جہد کا پہلو ہے اور اس میں اصول سے لے کر جزئیات تک ہر چیز اپنی جگہ مکمل و مرصع حالت میں موجود ہے۔ آپ کو کسی کی طرف دیکھنے اور کسی کے خوان "قیادت" و "مہارت" سے ریزہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات حمیدۂ صفات کے علاوہ دنیا میں کہیں صحیح قیادت و مہارت نہیں مل سکتی۔ دھوکہ نہ کھائیے! اصول، طریق کار اور جزئیات عمل سب وہی ہیں جو پہلے تھے۔ صرف وسائل، الفاظ اور نام بدل گئے ہیں:

واقعۂ ہجرت اور مورخین کا سکوت

بہر حال اس سلسلے میں پہلی کوشش یہ ہے۔ اس میں خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کا ہونا مستبعد نہیں۔ بہت سے واقعات ایسے ہو سکتے ہیں جو ہم تک نہیں پہنچے۔ مگر اس کوشش سے یہ ممکن ہے کہ تحقیق و جستجو کا ذوق پیدا ہو جائے اور واقعات عہد سعادت کے تمام موتی ایک ایک کر کے منظر عام پر آجائیں۔ مسلمان مورخین کی اس کوتاہی کا شکوہ پروفیسر کے ہتی نے بھی کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "آنحضرتؐ کے اوائل عمر، بن شعور اور دعوتِ اسلام کی جدو جہد کی مفصل و مربوط تاریخ نہیں ملتی۔ گو قرآن مجید کے حالات موجود ہیں مگر اس پر اسلامی مورخین کے تبصروں سے ہم محروم ہیں۔ آج بھی ہمارے سامنے یہ سوال درپیش ہے کہ حضرت محمدؐ جیسے اولوالعزم انسان جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبوّت سے سرفراز فرمایا مکہ سے مدینہ کیوں گئے"۔ پروفیسر موصوف کے الفاظ نہایت شائستہ ہیں اور ان سے شک و ریب کی اس کسک کا پتہ چلتا ہے جو کسی انصاف پسند اور مہذب غیر مسلم کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ورنہ حریفوں کا طعنہ تو یہ ہے کہ حضرت ہمت ہار کر چلے گئے اور اسے بالاعلان فلائیٹ (Flight) یعنی فرار کہتے ہیں۔ کیا یہ الزام صحیح ہے؟ اب تک جو جواب دیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ فرار نہیں ہجرت ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کی گئی اور اس کے نتائج و فوائد یہ یہ مرتب ہوئے۔ مگر حریف اس کا جواب ایمان و عقیدہ سے یا مابعد ہجرت کے حالات سے نہیں، ہجرت سے پہلے کے ٹھوس واقعات اور منطقی دلائل سے چاہتے ہیں۔ اگرچہ بعض غیر مسلم مورخین نے انصاف کو

راہ دینے اور تعصب و عناد کی سطح سے بلند ہونے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان سے کسی صحیح وکالت یا منطقی استدلال کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ پروفیسر ہتّی نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ہجرت کا منصوبہ محض مکہ سے بھاگ جانے کے لئے نہ تھا۔ بلکہ دو سال کے مسلسل غور و خوض کا نتیجہ تھا۔ فاضل پروفیسر اس سے آگے کچھ نہ لکھ سکا اور وہ لکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہمیں گلہ اس سے نہیں مسلم مورخوں سے ہے جو اس باب میں بالکل خاموش ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی اس پہ تاریخی و واقعاتی اعتبار سے تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی +

اسبابِ ہجرت

اسبابِ ہجرت کو سمجھنے کے لئے آپ کے مقصدِ حیات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ آپؐ کی زندگی کا مشن ایک اور صرف ایک تھا یعنی اعلائے کلمۃ الحق اور دعوتِ اسلام +

اس کام میں ابتداءً جو دشواریاں پیش آئیں اور یوماً فیوماً جس رفتار سے بڑھتی رہیں۔ ان کا مختصر حال آپ پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں۔ یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کفار و مشرکین نے آپ کی مخالفت میں جو اس درجہ شدت اختیار کی۔ اس کی اصل وجہ کیا تھی اور یہ کیوں تھا کہ ایک متنفس کے مقابلہ میں پوری قوم کی قوم کمربستہ ہوگئی اور جوں جوں آپ کی آواز بلند تر ہوتی گئی۔ ان کی پریشانیاں بڑھتی گئیں حتّٰی کہ انہوں نے اپنے جملہ وسائلِ قوت واثر سے کام لے کر اسے زندگی و موت کا سوال بنا لیا +

اس کے جواب کے لئے اگر آپ اسلام کی سطحی تعریف سے گزر کر ذرا گہرائی میں اترنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام حیاتِ انسانی کی پوری کائنات کا استحالہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ اکل و شرب نشست و برخاست، بات چیت، لین دین، جائز و ناجائز، حرام و حلال غرض تمدن و معاشرت اور اخلاق و معاملات سے لے کر عبادات تک ہر چیز میں وہ اسے اوجِ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے اور اس کی فطرت کو اعتدال کے سانچہ میں ڈھال کر فضائل و محامد کا ایسا رنگ چڑھانے کے لئے آیا ہے کہ مرضاتِ الٰہی اس کی زندگی کے ہر تار و پود میں جاری و ساری اور اس کا وجود اور اس

وجود کی ساری دلچسپیاں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی اطاعت شعاری کے لئے وقف ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی تعلیم کے مقاصد یہ ہیں کہ:۔

۱۔ آدمی حیوان سے انسان بنے۔

۲۔ انسان سے بااخلاق انسان بنے۔

۳۔ بااخلاق انسان سے باخدا انسان بنے۔

لیکن یہ مقاصد اہلِ عرب کی زندگی کے نہج اور موروثی رسم و رواج کے بالکل برعکس تھے۔ اہلِ عرب کو یہ گوارا نہ تھا کہ وہ انہیں بے چون وچرا چھوڑ دیں۔ وہ اپنی خواہشات کو دنیا کی تمام اخلاقی پابندیوں پر مقدم سمجھتے تھے۔ اس میں جو سدِ راہ ہوتا اسے اپنا بدترین مخالف گردانتے۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل ان کے نزدیک موت و زیست کا سوال تھا آزادی عربوں کا مایۂ خمیر ہے اپنے ہی لوگوں میں سے کسی کی دعوت پر لبیک کہنا اور موروثی عقیدوں اور معبودوں کو چھوڑ کر اسے مذہبی پیشوا اور دینوی سردار بنا لینا ناممکن تھا۔ سردار ہمیشہ خاندان کا بزرگ ہوتا تھا اور معبود پتھر یا لکڑی کا تراشیدہ بُت۔ بزرگ کے بجائے کسی نوعمر کو سرداری کا منصب تفویض کرنا بھی ناممکن تھا اور بتوں کی پرستش چھوڑنا بھی ناممکن۔ لہٰذا دعوتِ اسلام ایک ایسی دعوت نظر آئی جس کی مخالفت خاندانی سرداروں اور بزرگوں کے لئے بھی ضروری تھی۔

پھر یہ دعوت قدیم رسم و رواج اور مذہب و معتقدات ہی پر حملہ نہ تھی۔ اخلاقی و تمدن کے پورے ڈھانچے کیلئے چیلنج تھی۔ حالانکہ یہ عربوں کا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تھا، مذہب و معتقدات اور تمدنی ورثہ سے ان کی عزت و وجاہت ہی قائم نہ تھی معاش کا دامن بھی وابستہ تھا۔ مکہ کے بُت خانے اور ان بت خانوں کے رسم و رواج نہ صرف اہلِ مکہ کے مختلف خاندانوں کا وسیلۂ قدر و منزلت تھے۔ بلکہ ذریعۂ معاش و آمدنی بھی تھے۔ ان کی زیارت کے لئے لوگ ملک کے دور و دراز گوشوں سے آتے تھے اور ان کی مدارات و تواضع سے اہلِ مکہ خوب روپیہ پیسہ پیدا کرتے تھے۔ سالانہ زیارت کے موقعہ پر مکہ میں ایک بڑا میلہ لگتا تھا۔ جس سے نہ صرف مکے والوں کی تجارت کو فروغ ہوتا تھا۔ بلکہ گھر بیٹھے خورد و نوش کا جملہ سامان بھی مل جاتا تھا۔ مکہ میں نہ زراعت تھی نہ صناعت بتخانوں کی شہرت و مرکزیت کی وجہ سے ایشیائی ممالک کے تجار دور دراز ملکوں سے مال لے کر

آتے اور مکے کے تاجر اسے خرید کر یورپ، افریقہ کے ملکوں کو لے جاتے تھے۔ یہ ایک سربستہ راز تھا۔ جسے اہلِ مکہ نے نہایت ہوشیاری سے محفوظ رکھا تھا۔ یورپ، افریقہ والے مدّت دراز تک یہ سمجھتے رہے کہ گرم مسالے ہاتھی دانت اور چائے وغیرہ خاص عرب کی پیداوار ہیں۔ یہ راز اسوقت تک راز رہا۔ جب تک اہلِ یورپ سمندروں کو عبور کر کے ہندوستان اور چین وغیرہ ممالک نہ پہنچے +

مکے کے تجار کو یقین تھا کہ اس نئے مذہب سے کعبہ کے بتخانے کی مرکزیت، اہمیت معرضِ خطر میں پڑ جائے گی اور اس کے معرضِ خطر میں پڑنے سے تجارت کو نقصان پہنچے گا اور اس کے ساتھ قریش کی سرداری اور وقار و منزلت بھی ختم ہو جائے گی تجارت کے جانے سے نہ صرف مال و دولت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بلکہ سامانِ خوراک بھی میسر آنا مشکل ہو جائے گا +

گویا اہلِ مکہ کو حالات کے یکسر منقلب ہو جانے کا اندیشہ تھا اور اس انقلاب میں انہیں سرتاسر نقصان و تباہی نظر آ رہی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے نہ صرف تمدنی اخلاقی اور مذہبی بنیادیں کھوکھلی ہوں گی۔ بلکہ خاندانی حقوق و وقار اور نسبی تفوق و امتیاز کا بھی خاتمہ ہو جائے گا نسبی فخر ان کی قومی خصوصیت تھی۔ اخوّت و مساوات بے معنی الفاظ تھے۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق کا ختم ہونا ذلّت کی موت کے مرادف تھا۔ اہلِ مکہ کی معاشی زندگی کا دار و مدار بت خانوں کی مجاوری پر تھا یا تجارت اور سودی کاروبار پر۔ لیکن اسلام سود کو حرام قرار دے رہا تھا۔ اس سے انہیں بھوکوں مر جانے اور معاشی تباہی پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ اسلام لڑکیوں کے حقوق دے رہا تھا وہ حیران تھے کہ اسے اختیار کر کے اقتصادی نظام اور خاندان کا معاشی شیرازہ کس طرح قائم رکھا جا سکے گا۔ بردہ فروشی کے خاتمے اور غلام و کنیز کے حقوق تسلیم کر لینا گویا اپنے پیروں میں خود کلہاڑی مارنا تھا۔ دیانت و امانت عرب جیسے مفلس و قلاکش علاقے کے لئے عجیب و غریب چیز معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ وہ قرآن کے جملہ احکام سے واقف نہ تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ان کے پاکیزہ اخلاق و عادات، ان کی صداقت شعاری و امانت داری ان کا رفق و خلوص اور حسنِ سلوک انہیں اپنے موروثی عادات و خصائل اور اخلاق و اطوار کے بالکل متضاد نظر آتا تھا +

غرض یہ اور اسی قسم کی باتیں اور اندیشے تھے۔ جن کی وجہ سے اہلِ مکّہ آنحضرت صلعم کے انتہائی مخالف اور دشمن بن گئے۔ نبی کریمؐ نے اس طوفانِ مخالفت کا جواب صبر و استقلال سے دیا۔ آپؐ نے اور آپ کے ساتھیوں اور جان نثاروں نے قلبی و روحانی اذیتیں سہیں۔ جسمانی تکلیفیں برداشت کیں۔ سب و شتم اور استہزاء کے نشتروں کو سہا۔ مقاطعہ کی مصیبتیں اٹھائیں۔ مگر اپنے حوصلے پست نہ ہونے دیئے۔ جب مکّہ میں رہنا ناممکن ہو گیا اور کفار نے آپ کو قتل کرنے اور مسلمانوں کے قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا۔ تو آپ نے پورے غور و خوض کے بعد مکّہ سے ہجرت کر کے یثرب تشریف لے جانے کا پروگرام بنایا۔ پہلے آپ نے اپنے صحابہ کو ہجرت کا حکم دیا تاکہ ان کی مدد سے اسلام کا پیغام باہر پہنچے۔ مگر خود تشریف لے جانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن اس میں کامیابی نظر نہ آئی تو مجبوراً آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ آپ نے اس پر مدت تک غور فرمایا۔ لیکن عمل کے معاملہ کو ملتوی فرماتے رہے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی۔ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ مرکزِ عمل مکہ سے مدینہ منتقل فرمادیں۔ اسی کا نام ہجرت رکھا گیا یہ لفظ گو سادہ ہے مگر دفاعی سیاست کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ غور کیجئے کہ ایک اولوالعزم پیغمبر جس کی پشت پر تائیدِ الٰہی ہو۔ جسے دعوتِ حق دینے پر مامور کیا گیا ہو۔ کیا امرِ الٰہی سے منہ موڑ کر اور میدان دشمنوں کے ہاتھ میں دے کر فرار اختیار کر سکتا ہے؟ اگر نہیں کر سکتا اور عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی تو کیا ہجرت کے معنی فرار و ہزیمت ہو سکتے ہیں؟ کفار کے اعتراضات و سوالات کیا ہیں۔ یہی نا کہ حضرت نے جو کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ اپنے آپ کو اس کا اہل نہ پا کر میدان دشمن کے سپرد کر کے چلے گئے یا جب وہ نبوت سے سرافراز ہو چکے تھے تو انہوں نے خانہ کعبہ کو بت پرستوں کے قبضہ میں چھوڑنا کیوں گوارا کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کیوں نہ کی؟ یہ اور اسی قسم کے اور سوالات ہیں جو ہر شخص اپنی فہم کے مطابق سوچنے کا حق رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر کفار طعنہ زن ہیں یا مخالفوں کی سمجھ میں واقعۂ ہجرت نہیں آتا تو ان کو سمجھانا ہمارا فرض ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرض ہے کہ ان سے ایسی باتیں نہ کہیں جن کے سمجھنے سے وہ عاری ہیں یا جنہیں باور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر کرتے یا کر سکتے تو یقینی بات تھی کہ پھر شک و اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہتی وہ ہمارے ہم خیال ہی ہوتے۔ لہٰذا ہمیں چاہیئے کہ

عقل و درایت کی روشنی کے ساتھ وہ اسباب پیش کریں جو ان کی سمجھ میں آجائیں۔اس طرح ممکن ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ وہ خود دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔

دفاعی اہمیت

پہلے ہم ہجرت کی دفاعی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے :۔

جرمنی کے شہرۂ آفاق دفاعی ماہرین جنرل کلازویٹز اور لیوڈنڈارف کا قول ہے کہ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ لہٰذا قوموں کو اپنا مفاد یا اپنا نظریہ جنگ کر کے منوانا پڑتا ہے"۔ فنِ جنگ کا فرانسیسی امام نپولین، انگریز ماہر لیڈل ہارٹ اور جنرل فلر، برطانوی فیلڈ سروس ریگولیشن (قواعدِ میدانِ جنگ) فرانسیسی جرنیل فواور ڈیگول اور امریکی ماہر جنرل آئزن ہاور وغیرہ سب اس معاملہ میں متفق اللفظ ہیں۔ امریکہ کے جرنیل پیٹن نے ۴۵-۱۹۳۹ء کی جنگ میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ جب وہ جنگ کے سلسلے میں امریکہ سے افریقہ گئے اور امریکہ سے فرانس لڑنے گئے تو فنِ جنگ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کی بجائے قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کا مطالعہ بہت ہی مفید اور سبق آموز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے معلّم تھے، وہ ان پر نازل ہوا تھا، ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا ان سے بہتر قرآن کا سمجھنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپؐ کو خدا کا پیغام پہنچانا تھا اور اس پر عمل کر کے دنیا کے لئے مثال قائم کرنا تھی۔ آپ نے مکہ کو مستقر بنا کر اسلام کی روشنی پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ صبر و برداشت اور تحمل و استقامت کا ایسا ثبوت دیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ قلبی، روحانی اور جسمانی ہر قسم کی انتہائی تکلیفیں سہیں۔ کفار کی ستم ایجادیوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی برداشتہ خاطر نہ ہوئے۔ لیکن جب اصل مقصد میں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو آپؐ نے اپنا مستقر بدل کر تبلیغ اسلام کی راہ کے موانع کو دور کرنے کا فیصلہ کیا۔

دفاعی مرکز

جب قومیں اور حکومتیں اپنی بداعمالیوں میں حد سے گذر جاتی ہیں اور ظلم و جور ان کا شیوہ بن جاتا ہے تو انہیں راہِ راست پر لانے کے لئے دفاعی سیاست سے

کام لیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مظلوم قوم یا مظلوم لیڈر دفاعی سیاست کو کام میں لانے سے پہلے بہت سی باتوں کو سوچتا ہے اور ان میں سب سے زیادہ اہم سوال مستحکم دفاعی مرکز کا ہوتا ہے۔ دفاعی مرکز کی اہمیت کا اندازہ برطانوی جنرل ٹوکر کے اس تبصرہ سے کیجئے جو اس نے اپنی کتاب "پیٹرن آف وار" میں صلیبی جنگوں پر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"اگر صلیبی نائٹ دمشق کی دفاعی اہمیت کو سمجھ لیتے اور اس شہر کو دفاعی مرکز بنا کر صلاح الدین غازی کو اس کے استعمال سے محروم کر دیتے تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ صلاح الدین صلیبی لشکر کو تباہ و برباد نہ کر سکتا۔ اور اس طرح دنیا میں اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ بد قسمتی سے صلیبی لشکر کے جرنیلوں نے دمشق کی اہمیت کو نہ سمجھا اور اس کی وجہ سے اسلامی جھنڈا پھر دنیا کے ملکوں میں لہرانے لگا۔"

برطانیہ کے مشہور دفاعی ماہرین جنرل ہیملے (Hamley) اور جنرل کیگیلی (Kiggell) اپنی کتاب "آپریشن آف وار" میں دفاعی مرکز کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"اگرچہ منظم اور تربیت یافتہ فوج دشمن پر کامیابی کے لئے بہت ہی ضروری ہتھیار ہے۔ مگر طاقتور فوج اس انجن یا مشین کی طرح ہے جسے کامیابی سے چلانے کیلئے کئی اصولوں پر کاربند رہنا پڑتا ہے۔ مثلاً دشمن سے لڑنے، آگے بڑھنے، حملہ کرنے، کسی شہر کو فتح کرنے یا بچاؤ کی لڑائی لڑنے کے لئے ضروری ہے کہ فوج یکجا ہو کر یا یکجہتی سے لڑ سکے یعنی فوج کے مختلف حصے ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے ایک ہی منصوبے کے ماتحت لڑیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ہر قسم کا سامانِ جنگ اور سامانِ رسد یعنی ہتھیار اور بار برداری کے ذرائع ہر وقت موجود ہوں اور جیسے جیسے سامان خرچ ہوتا جائے۔ فوراً ساتھ ساتھ کمی پوری ہوتی رہے۔ اس کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ پہلے سے ایسے دفاعی مرکز چن لئے جائیں۔ جہاں سے یہ سامان بوقت ضرورت حاصل کیا جا سکے یہ مرکز ایسے محفوظ ہوں کہ دشمن انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس طرح ایک قابل جرنیل اس پر بھی غور کر لیتا ہے کہ اس کا حریف و مقابل جرنیل اس قسم کا سامان

کہاں سے حاصل کرے گا۔ اور کس طرح کرے گا۔ آیا وہ اسے اپنے ساتھ اٹھا کر لائیگا یا گرد و نواح کے علاقہ سے جمع کرے گا۔ تاریخ عموماً ان حالات پر تبصرہ نہیں کرتی۔ لیکن یہ بہت اہم و ضروری ہیں +

یہ اقتباس نہایت اہم اور غور طلب ہے۔ اس کو سمجھنے کے بعد ہی ہجرت کے منصوبے کی صحیح اہمیّت کا احساس ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک اقتباسات اور پیش کیے جاتے ہیں۔ مشہور برطانوی جرنیل ہرڈ اپنی کتاب "ڈائرکشن آف وار" میں دفاعی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"جو قوم آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اسے اپنے دفاع و تحفظ کے لئے ہر وقت لڑائی کے لئے تیار رہنا چاہیئے ..... اگر وہ تیار نہیں رہے گی۔ تو آزادی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی اسے جلد ہی غلامی کا طوق پہننا پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ایسی قوم کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں +

آج کل سیاسی آزادی اور تمدّنی و معاشرتی زندگی کا مدار صرف اس پر ہے کہ قوم کے پاس کافی تعداد میں مضبوط، منظم، تربیت یافتہ اور جدید آلاتِ حرب سے مسلح فوج موجود ہے یا نہیں ......"

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

دشمن کے خلاف جنگ کرنے کے مقاصد یہ ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اسے شکست دے کر مفتوح بنانا +

۲۔ اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ اپنے حقوق و مطالبات سے ہمارے حق میں دستبردار ہو جائے +

۳۔ قوم کے دفاع یا قومی مفاد کا تحفظ +

۴۔ یا کسی دوسرے ملک کی مدد +

۵ اپنے ملک یا اس کے کسی حصّہ کی حفاظت +

ان حالات میں دشمن کو شکست دینے سے اس کے باشندوں پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ دشمن کو چار و ناچار جنگ بند کر کے صلح کرنی پڑتی ہے۔ لیکن وہ شرائطِ صلح کو اس وقت تسلیم کرتا ہے۔ جبکہ :-

۱- اس کی فوج تباہ و برباد ہو جاتی ہے +
۲- اس کی تجارتی حالت خراب وخستہ ہو جاتی ہے +
۳- یا اس کی قومی زندگی کی دوسری اشد ضروریات مثلاً صنعتوں کے لئے ضروری سامان، سامانِ رسد اور دوسرا خام سامان ملنا بند ہو جاتا ہے +

اس لئے ضروری ہے کہ پہلے دشمن کی جنگی طاقت کو ختم کیا جائے تاکہ دشمن کو اپنے ملک کے اندر لڑائی لڑنے پر مجبور کیا جا سکے اس سے دشمن کے باشندوں پر دوہرا بوجھ پڑے گا۔ یعنی ایک اپنی فوج کے لئے تمام ضروری سامان مہیا کرنے کا دوسرے ہماری فوجی ضرورتوں کا۔ کیونکہ ہماری فوج بھی مفتوحہ علاقہ سے بہت کچھ سامان لے سکے گی"

اس کے بعد اور آگے چل کر لکھتے ہیں:-

زمانۂ امن کی دفاعی سیاست کے منصوبے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب ہم دشمن سے جنگ کریں تو جہاں تک ممکن ہے فتح یقینی امر ہو...... اس مقصد کے لئے سامانِ حرب سامانِ رسد اور وسائل نقل وحمل کا مکمل انتظام ضروری ہے۔ پھر یہ چیزیں ایسی جگہ جمع کی جائیں جہاں دشمن انہیں نقصان نہ پہنچا سکے۔ نہ ان پر قبضہ کر سکے۔ یہ جگہ یا یہ دفاعی مرکز ایسے مقام پر ہونا چاہیئے جہاں سے لڑ کر دشمن کو شکست دی جائے تو وہ فیصلہ کن ہو۔

دوسرے لفظوں میں دفاعی مرکز سے وہ مقام یا مقامات مراد ہیں۔ جہاں سے لڑنے کے لئے سامانِ جنگ فراہم کیا جا سکے۔ یہ مقامات اپنے ملک کے کسی حصہ میں یا مددگار ملک میں ہو سکتے ہیں۔ مثلاً دونوں عالمگیر لڑائیوں میں جزائرِ برطانیہ یورپ میں اتحادی فوجوں کے دفاعی مرکز تھے مگر سامان دنیا کے مختلف گوشوں سے آتا تھا۔ اس لئے اتحادی فوجوں پر ان کی حفاظت بھی لازم تھی۔ مگر خصوصی طور پر اس سے وہ جگہ یا جگہیں مراد ہوتی ہیں جو میدانِ جنگ سے قریب تر ہوتی ہیں اور جہاں تمام اقسام کا سامانِ جنگ جمع کر کے لڑائی کے میدان میں (فوجوں کو) بھیجا جاتا ہے۔ مثلاً جاپان کے خلاف جنگ میں اتحادیوں کا پہلا دفاعی مرکز سنگاپور تھا پھر برما ہوا اور بعد ازاں ہندوستان۔ پھر جب جاپانیوں کو شکست ہوئی اور وہ پسپا ہوئے تو یہ مرکز بھی برابر آگے بڑھتا رہا۔ تاکہ میدانِ جنگ کی فوجوں سے قریب تر رہے۔"

اس مرکز سے سامانِ رسد، آلاتِ حرب اور وسائلِ نقل وحمل کے علاوہ فوجی دستوں

حجاز کے راستے

نمبر ا

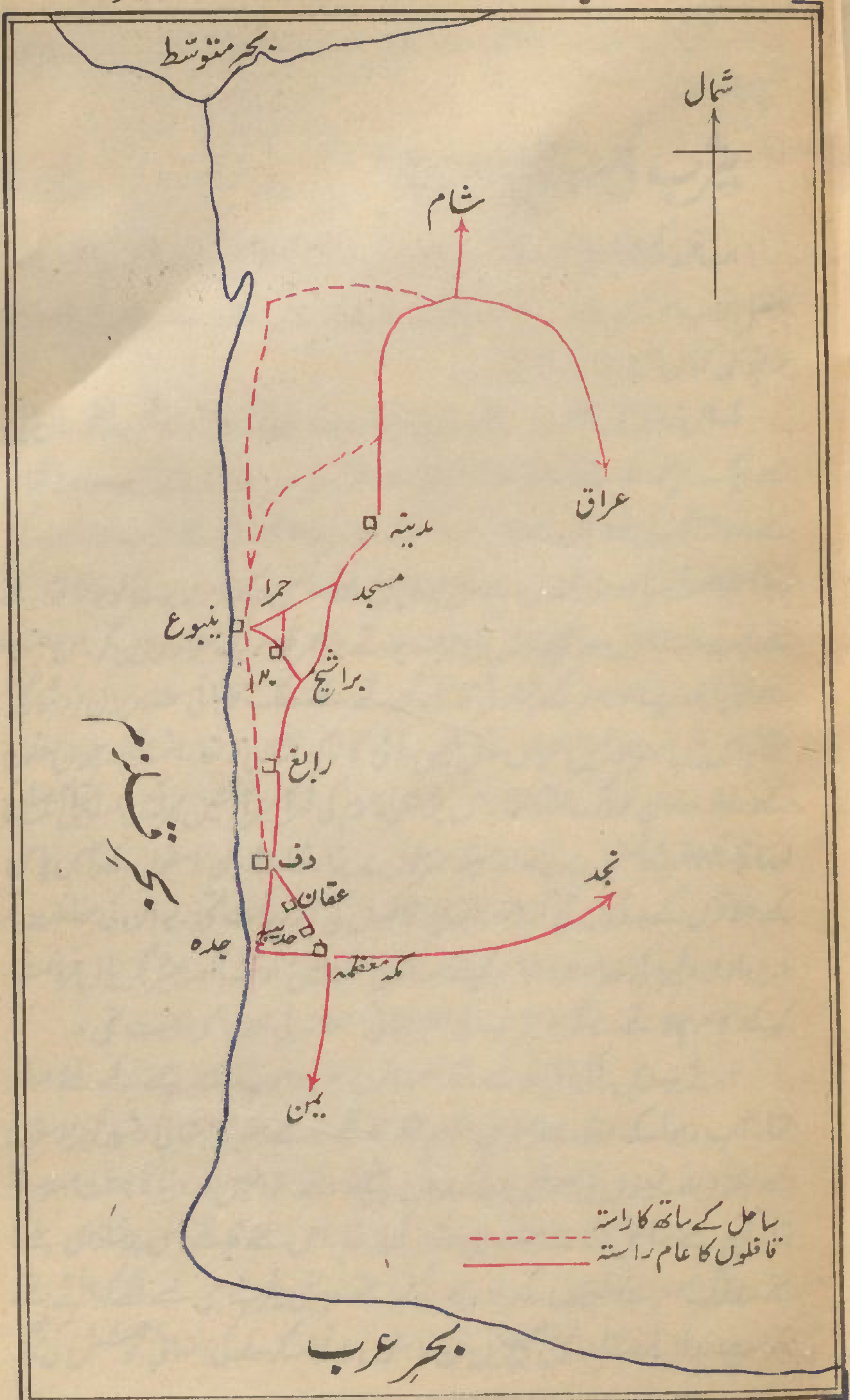

کی کمک بھی بھیجی جاتی ہے تاکہ ان سے زخمیوں اور مرے ہوئے جوانوں کی کمی کو پورا کیا جا سکے۔

یثرب کی دفاعی اہمیت

اب غور کیجئے کہ یثرب (مدینہ) میں اس قسم کی دفاعی خصوصیتیں موجود تھیں یا نہیں! اس کا مفصل جواب سرزمینِ حجاز کے جغرافیائی تبصرہ کے باب میں موجود ہے۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں:۔

۱۔ اس زمانہ میں قافلوں کے مشہور ترین اور سب سے بڑے راستے تین تھے۔ ان میں سے ایک بحرِ متوسط سے آتا تھا، دوسرا شام سے اور تیسرا مصر سے۔ اس طرح ایک راستہ شام سے دومۃ الجندل اور وہاں سے عراق کو جاتا تھا۔ دوسرا دومۃ الجندل سے یثرب ہوتا ہوا مکے کو جاتا تھا اور تیسرا دومۃ الجندل سے ینبع اور وہاں سے ساحل کے برابر برابر مکے کو جاتا تھا۔ مکے سے پھر یہ راستے عراق اور خلیج فارس کی طرف جاتے یا بحرِ قلزم کے متوازی یمن کو۔ ان راستوں سے ایشیا، یورپ اور مصر کے تجارتی قافلے گذرتے تھے۔ ملک کا باقی حصّہ ویران و دشوار گذار تھا۔ اس میں صحرا اور عمیق وادیاں حائل تھیں۔ پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ انسان و حیوان دونوں کے لئے سامانِ خوراک عنقا تھا۔ اس پر مستزاد سموم کی قہر آمیز آتشیں ہوائیں اور ریتیلی آندھیاں۔ لہٰذا قافلے مقررہ راستوں پر چلتے اور معینہ منزلوں پہ پڑاؤ ڈالتے۔ ان راستوں کے آس پاس کے علاقوں کے بدوؤں کی گذر بسر کا ذریعہ قافلوں کی آمد و رفت تھی۔ یہ ان کی حفاظت و باربرداری وغیرہ کی خدمت انجام دیتے اور اون، کھالیں، اونٹ اور بھیڑ بکریاں فروخت کر کے کام چلاتے۔ یہ گویا یثرب کی جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی اہمیت تھی۔

۲۔ یثرب میں پانی افراط سے تھا نخلستانوں میں دھوپ سے بچنے کے لئے سایہ تھا۔ آب و ہوا کے لحاظ سے بہترین مقام تھا۔ قافلے والے جب انتہائی دشوار گذار راستوں سے ہفتوں اور مہینوں کی صعوبتیں اٹھا کر وہاں پہنچتے تھے تو انہیں وہ دنیا کا بہشت معلوم ہوتا تھا۔ ینبع سے ساحل کا راستہ بہت ہی دشوار گذار تھا۔ اس لئے قافلے اس پر شاذ ہی چلتے تھے۔ جو لوگ مصر سے کشتیوں کے ذریعے آتے تھے وہ بھی یثرب ہی سے مکے کو جاتے تھے حکومتِ روما نے ۲۴ سنہ قبل مسیح میں ان راستوں پر قبضہ کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر

وہ کامیاب نہ ہوئی، اور عرب کو فتح نہ کر سکی +

۳۔ یثرب میں اشیائے خوردنی نہ صرف مقامی باشندوں کے لئے کافی تھیں بلکہ اہلِ قافلہ یہاں سے اپنے لئے کھجوریں، آٹا اور دوسری چیزیں بطور زادِ راہ لے جاتے تھے +

۴۔ مکّے کے قریب عقبہ کے مقام پر یثرب کے قبائل اوس و خزرج کے چیدہ لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپؐ کو یثرب تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کو آپؐ نے قبول فرما لیا تھا جب یہ لوگ مکے سے روانہ ہونے لگے تو مشرکینِ مکّہ ان کے ایمان لانے اور آنحضرت کو یثرب میں مدعو کرنے پر سخت برہم ہوئے اور ان میں سے کچھ آدمی اس فکر میں اُن کے پڑاؤ کی طرف گئے تاکہ انہیں اسلام سے منحرف کر کے پھر اپنے مذہب میں واپس لے آئیں۔ وہاں جا کر معلوم ہوا تو قافلہ جا چکا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی ایک لشکر جمع کیا تاکہ یثرب پہنچنے سے پہلے اسے روک کر تبدیلِ مذہب پر مجبور کریں اور اگر یہ لوگ نہ مانیں تو زبردستی انہیں اپنے دین میں واپس لے آئیں۔ چنانچہ یہ لشکر تیزی سے منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھا اور یثرب پہنچنے سے پہلے اسے راستے میں جا لیا۔ اہلِ یثرب تعداد میں تھوڑے تھے۔ اس لئے وہ جم کر نہیں لڑے اور یثرب کی طرف بھاگ گئے۔ اہلِ مکہ نے بالقصد ان کا تعاقب نہ کیا تاکہ یثرب والوں سے جنگ نہ چھڑ جائے +

مکے والوں کی اس حرکت سے مدینہ کے چند بڑے قبیلے قریش کے خلاف ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے یہ بہترین موقعہ تھا۔ آپؐ ان قبائل کو جنگ میں قریش کے خلاف استعمال کر سکتے تھے۔ یہ قبیلے عرب کے قدیم رواج کے مطابق بدلہ لینے کا عہد کر چکے تھے آنحضرت نے اہلِ عرب کی اس موروثی کمزوری کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ ہجرت کا سیاسی پہلو تھا +

۵ یثرب کے بڑے قبائل اوس اور خزرج تھے۔ ان میں مدت سے عداوت چلی آتی تھی اور بارہا خونریزیاں ہو چکی تھیں۔ یہود جو یہاں شام سے آ کر آباد ہوئے تھے وہ ان کی باہمی دشمنی سے فائدہ اٹھاتے تھے اور اقتصادی برتری کا جال پھیلا کر انہیں برابر لڑاتے اور اپنی پوزیشن کو محفوظ و مستحکم بناتے رہتے تھے۔ اگرچہ یہ آپس میں لڑتے لڑتے تھک گئے تھے۔ مگر ایک دوسرے کی سرداری اور برتری کو قبول کرنے

کے لئے تیار نہ تھے۔ آپؐ نے لڑکپن اور عنفوانِ شباب کے زمانہ میں جو سفر کئے تھے ان سے آپؐ پر تمام مقامی حالات منکشف ہو چکے تھے۔ ان کے جھگڑوں کا ایک بڑا علاج یہ تھا کہ کوئی اہل و استعداد مند غیر یثربی نمودار ہو اور وہ اس کی سرداری پر متفق ہو جائیں۔ آنحضرت اپنے مخالفین میں بھی صادق و امین مشہور تھے۔ لہٰذا آپ کے لیئے یہ پوزیشن ہر اعتبار سے مناسب تھی۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ دونوں قبائل کے بارہ خاندانوں کے سردار آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کو اپنا مطاع تسلیم کر چکے تھے۔ تو کسی اختلاف رائے کا امکان ہی نہ تھا۔ ہجرت کے اقدام کا یہ ایک اور سیاسی پہلو تھا+

۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اہلِ یثرب سے ننہالی رشتہ تھا۔ اس وجہ سے آپ کو اپنے منصوبہ میں کامیابی کی امید تھی+

۷۔ یثرب کے یہود باقی قبیلوں کے خلاف تھے اور ان میں خانہ جنگیاں ہوتی چلی آتی تھیں۔ ابتدا میں یہود غالب ہو گئے تھے مگر اب ان کی حالت مفتوح کی سی تھی۔ لہٰذا جب انہوں نے آنحضرتؐ کی دعوتِ توحید کا حال سنا تو انہیں توقع ہوئی کہ وہ اہلِ کتاب کا ساتھ دیں گے اور بت پرستوں کے خلاف ہمارے معین و مددگار ہوں گے۔ لہٰذا وہ آنحضرت کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ ان کے بڑے بڑے خاندان یثرب کے نواح مثلاً خیبر وغیرہ میں رہتے تھے۔ یثربی یہود سے مفاہمت ہونے کے بعد کم از کم ان خاندانوں کی غیر جانبداری ضرور یقینی تھی+

۸۔ ان سہولتوں کے ساتھ یثرب کو مرکز بنانے سے دشمنوں کو یہ نقصان پہنچ سکتا تھا۔ کہ:۔

(ا) انھیں (مکہ والوں کو) تجارت کے لئے دوسرا لمبا راستہ اختیار کرنا پڑے گا سامانِ خوراک اور پانی کی قلت کا سامنا ہوگا۔ اور نقل و حمل کی دشواریاں بڑھ جائینگی+

(ب) مکہ والوں کو یثرب کی کھجوریں اور غلہ نہ مل سکے گا اور یہ چیزیں یثرب کے مقابلہ میں دوسری جگہوں پر بہت گراں تھیں+

(ج) اگر قریش اہلِ یثرب سے مخاصمت نکالیں گے تو انہیں دشوار گزار راستوں سے آنا پڑے گا اور سامانِ رسد، پانی، نقل و حمل کے ذرائع اور چارہ وغیرہ ساتھ لانا پڑیگا۔ ان حالات میں وہ یثرب پر دفعۃً حملہ نہیں کر سکتے۔ انہیں کافی تیاری کرنی پڑے گی۔

اور اس پہ زرِ کثیر صرف ہوگا۔ چونکہ اہل تجارت روپے کے پجاری ہوتے ہیں اس لئے مکہ والوں کو کافی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے گا+

(د) شکست کی صورت میں ان کی فوج تباہ ہو جائے گی۔ قریش ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے ماور ان کا ضد و عناد پر قائم رہنا نا ممکن ہو جائے گا+

ہمارے مقصد کے لئے یہ اسباب و وجوہ کافی ہیں۔ انہیں ہم اس بات کی دلیل میں پیش کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے اپنے دفاعی منصوبہ کا نام ہجرت رکھا تھا۔ اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ دشمنوں کو غلط فہمی ہو اور وہ یہ سمجھیں کہ آنحضرتؐ میدان چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ صحابہ کرام کو اس کا علم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسلامی سنہ واقعۂ ہجرت سے شروع کر کے اس کی اہمیت کا اعلان کیا۔ دنیا میں کسی قوم نے آج تک اپنی شکست یا کمزوری کی دائمی یادگار قائم نہیں کی۔ یہ انسانی نفسیات کے خلاف ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کی تازہ مثال لیجئے، ہٹلر کی ذاتی کمزوری کی بنا پر شکست خوردہ و محصور اتحادی فوج ڈنکرک سے بچ کر انگلستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی، اور برطانوی حکومت نے اس کامیابی کی تعریف بھی کی۔ مگر جب وزیر اعظم مسٹر چرچل سے ڈنکرک کے یادگاری تمغہ کے لئے کہا گیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اگر منافقین کے ہاتھوں ہماری تاریخ برباد نہ ہو جاتی تو یقین تھا کہ واقعہ ہجرت کے متعلق آنحضرتؐ کے منصوبہ کی کوئی شہادت ضرور ملتی+

بہر حال ہم اپنے بیان کی تائید میں زمانۂ جدید کے ماہرینِ دفاع کے افکار و آراء پیش کر چکے ہیں۔ تاکہ ان کو سامنے رکھ کر حضرت صلعم کی قابلیت کا اندازہ کیا جا سکے۔ اور یہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرتؐ دفاعی سیاست کے کتنے بڑے ماہر تھے۔ ہجرت در اصل مکّے کی ناکہ بندی کے لئے تھی جسے آج کل کی اصطلاح میں بلاکیڈ (Blockade) کہتے ہیں۔ اس کی تائید ہجرت کے بعد مدنی زندگی کے ایک ایک واقعہ سے ہوتی ہے اور یہ سارے واقعات اس کا بیّن ثبوت ہیں کہ ہجرت کا منصوبہ نہایت محتاط غور و خوض کے بعد تیار کیا گیا تھا۔ چونکہ اس کے بعد آپ نے کفار و مشرکین سے دفاعی جنگ کی لہذا اس تیاری اور منصوبہ کا نام دفاعی سیاست یا دفاعی حدیث رکھا گیا ہے+

دفاعی سیاست جن اجزاء و عناصر سے عبارت ہوتی ہے۔ اس کا کچھ حال موجودہ زمانہ

کے دفاعی ماہرین کی مستند کتابوں کے حوالوں سے پیش کیا جا چکا ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجئے۔ پھر عمل و نتیجہ کے اعتبار سے انہیں ان حالات و واقعات پر منطبق کر کے دیکھیئے جو ہجرت کے بعد پیش آئے۔ جنرل برڈ "ڈائرکشن آف وار" میں لکھتے ہیں :-

"جب کوئی حکومت جنگ کرنے کا فیصلہ کرے تو اسے چاہیئے۔ کہ مالی و معاشرتی حالات کا نہج ایسا قائم کرے کہ اپنے ملک کا معاشی نظام تو بحسن و خوبی جاری رہے مگر دشمن کے سیاسی وقار کو کمزور اور تجارتی اقتدار کو ختم کر دے"

مابعد ہجرت کے چند واقعات بطور مشتے نمونہ از خروارے یہ ہیں :-

اندرونی استحکام

یثرب تشریف لانے کے بعد آپؐ نے مسجد نبوی تعمیر کی تاکہ سب مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر علانیہ نماز پڑھ سکیں، آپس میں مبادلۂ افکار کر سکیں اور آپؐ کے مواعظ و نصائح سے مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ مسجد نبوی کے یہی مواعظ و خطبات تھے۔ جن میں آنحضرت صلعم نے آزادی کے ساتھ کھل کر وحدانیت و رسالت کا اعلان کیا۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت فرض قرار دی۔ مسلمانوں کو ان کے حقوق و فرائض سے آگاہ کیا گیا اور اجتماعی زندگی کی پوری شیرازہ بندی کی گئی +

۲- انصار و مہاجرین میں اخوت و مساوات قائم کی۔ مہاجرین کی آبادکاری کی تکمیل فرمائی اور مل کر رہنے کے اصول و ضوابط بنائے +

۳- اپنے اور اپنے جملہ متبعین کے حقوق و فرائض کا تعین کر کے ان کو تحریری صورت میں لایا گیا۔ تاکہ کجراہی و گمراہی کا احتمال نہ رہے +

۴- ہجرت کے دوسرے سال شعبان میں بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ بنایا۔ یعنی یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اسلام کا مرکز ثمانہ کعبہ ہے۔ گویا مکے سے آپ جس دفاعی مقصد کو لے کر تشریف لائے تھے۔ اس کا اظہار اس وقت فرمایا۔ جب دفاعی مرکز مضبوط ہو گیا۔ کیونکہ اب آپؐ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے قابل ہو گئے تھے +

حَرَم

آنحضرتؐ کے دفاعی منصوبہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایئے کہ آپؐ نے مدینہ (یثرب) کے حدود قائم کر کے اس کو حَرَم قرار دیا۔ اسے آج کل کی اصطلاح میں کھلا شہر (Open city) کہتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شہر کے اندر اور اس کے گرد و نواح میں اہلِ شہر مخالفین سے جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ مثلاً پہلی عالمگیر جنگ میں ٹرکی اور برطانیہ کی حکومتوں نے بیت المقدس کو کھلا شہر یا حَرَم قرار دیا تھا۔ البتہ ۱۹۳۹-۴۵ء کی عالمگیر جنگ میں جس میں جنگ کے بین الاقوامی اصول و قواعد کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن (جرمنی) نے فرانس کے دارالحکومت اور مرکزی شہر پیرس پر اس کی درخواست کی وجہ سے گولہ باری نہیں کی۔

حَرَم کا اصول اسلام سے پہلے بھی رائج تھا اور نہ صرف عرب میں بلکہ یونان اور ہندوستان وغیرہ میں بھی اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ یہ اصول نیم مذہبی اور نیم سیاسی تھا۔ مذہبی اس لئے کہ ان مقامات سے تقدیس و احترام کی کوئی بات منسوب ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہاں کی ہر چیز مقدس سمجھی جاتی تھی۔ درخت قطع و برید سے محفوظ رہتے تھے جانوروں کی ایذا رسانی اور شکار ممنوع ہوتا تھا۔ وہ ہر شخص کے لئے مامن تھے۔ آنے جانے والے حفظ و امن اور پناہ میں رہتے تھے۔ خواہ وہ کیسے ہی مجرم کیوں نہ ہوتے جنگ اور خونریزی نہ ہوتی تھی۔ ان حالات میں حرم کی سیاسی اہمیت کسی وضاحت کی محتاج نہیں رہتی۔ گویا حَرَم اپنے حدود کے اندر ایک مملکت ہوتا۔ جس کے رسوم و ضوابط اس سے مختص ہوتے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی مثال روم کا شہر ہے جو پاپائے روم کے زیرِ اقتدار حَرَم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو حیثیت روم کی آج ہے وہی حیثیت مکہ کی تھی اور قریش اس پر اپنا کنٹرول رکھتے تھے۔ حرم کی تقدیس و احترام کا سیاسی فائدہ قریش کو پہنچتا تھا۔ آنحضرتؐ نے حَرَم مکہ کے متوازی مدینہ کو حَرَم بنا کر اہلِ مدینہ کو بھی وہی پوزیشن دے دی جو اہلِ مکہ کو حاصل تھی اور اہلِ مدینہ بھی اپنے آپ کو تمام خطرات سے اسی طرح محفوظ سمجھنے لگے۔ جس طرح اہلِ مکہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مکہ والوں نے حَرَم

مدینہ کے تقدیس و احترام کی خلاف ورزی کی تو اہل مدینہ بھی حرم مکہ کے احترام کی پابندی سے آزاد ہوں گے۔ اگر اہل مکہ مدینہ پر حملہ کریں گے تو اہل مدینہ بھی مکّہ پر حملہ کر سکیں گے۔ یہ ایسی دور بینی اور ایسی حکمت عملی تھی کہ اس نے واقعات کے رخ کو بدل کر مسلمانوں اور ان کی چھوٹی سی مملکتِ مدینہ کو مکّہ کے ہم پایہ بنا دیا۔ اگر آنحضرت صلعم اس حکمت عملی سے کام نہ لیتے تو حسب ذیل مشکلات و موانع کا سامنا کرنا پڑتا:۔

اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ کی حفاظت کے لئے کافی فوج رکھنی پڑتی۔ اس کے بغیر آپ دشمن کے مقابلے کے لئے مدینہ سے باہر نہ جا سکتے لہٰذا دفاعی طاقت کمزور ہوتی اور مشکلات میں اسی نسبت سے اضافہ۔

دُوم مکہ کو کسی وقت بھی فتح نہ کر سکتے۔ کیونکہ حُرم کی وجہ سے وہ محفوظ و مامون تھا اور اگر کرتے تو عرب کے تمام قبائل ان کے خلاف ہو جاتے اور غیر جانبداری کے معاہدوں کو توڑ دیتے۔ مدینہ کو حرم قرار دے کر آنحضرت صلعم نے مکہ والوں کو بہت کمزور کر دیا۔ ہجرت سے پہلے کی تاریخ کا باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ قریش کی وہ آزادی و بے باکی جس سے وہ مسلمانوں پر اور آنحضرتؐ پر ظلم و جور کے پہاڑ توڑتے تھے یک قلم ختم ہو گئی۔ اب اگر اہل مکہ مدینہ کے حدود کے اندر اس کی حرمت کی خلاف ورزی کریں گے تو آپ بھی جوابی کارروائی کرنے میں آزاد ہوں گے۔ آپ نے حرم کے واضح حدود متعین کئے۔ ان کے آثار اب تک موجود ہیں +

آنحضرتؐ کی اس تدبیر کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ شام جانے والے تجارتی قافلوں کے لئے آپؐ سے اجازت لینا ضروری ہو گیا۔ حدودِ حرم کے تعین کے بعد کوئی قافلہ حضرتؐ کی اجازت کے بغیر مدینہ سے ہو کر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ پابندی کفار و مشرکین کے قافلوں پر بڑی شاق تھی۔ لہٰذا انہوں نے دوسرے راستے اختیار کئے۔ انھیں روکنے کے لئے آپؐ نے مختلف اوقات میں مختلف فوجی دستے روانہ کئے اور خود بھی اس قسم کی مہم پر تشریف لے گئے۔ چنانچہ آپؐ کے ایک دستے سے کفار کی مڈبھیڑ بھی ہوئی +

تجربات و شواہد

اب یہ دیکھئے کہ دفاعی سیاست کی دنیا میں اس کارروائی کی اہمیت کیا ہے۔ اور

ماضی وحال کے بڑے بڑے ماہرینِ دفاع اپنے افکار و تجربات کی بنا پر اس باب میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

کلاز وِیٹز اور مالٹک جرمن کے مسلّمہ اور شہرۂ آفاق دفاعی مبصر ہیں۔ جن کا لوہا ساری دنیا مانتی ہے۔ کلاز وِیٹز لکھتا ہے:۔

"دشمن سے نبرد آزما ہونے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لڑائی کا مقصد و مدعا حاصل کیا جائے، دفاعی سیاست مختلف لڑائیوں کا منصوبہ تیار کرتی ہے اور ان لڑائیوں کے میدان بھی حتی الامکان اس نظر سے منتخب کر لیتی ہے کہ مختلف مہموں اور لڑائیوں سے دفاعی مقصد حاصل ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ لڑائیاں ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں"۔

مالٹک کہتا ہے:۔

"دفاعی سیاست کے منصوبے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سپہ سالار ان ذرائع کو، جو اس کی حکومت اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ حکومت کے مقصدِ دفاع کے حصول کے لئے کام میں لائے"۔

ولیسن کی رائے میں "دفاعی سیاست کے معنی دشمن کے وسائل اور سلسلۂ آمد و رفت اور نقل و حرکت کا صحیح مطالعہ کرنا ہیں"۔

نپولین اسی نظریہ کو دوسری طرح پیش کرتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ "دفاعی سیاست میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ سپہ سالار مخالف کی فوج کے سلسلۂ آمد و رفت اور اس کے ذرائع و وسائل پر قبضہ کر کے اسے بے بس کر دے"۔

مدینہ کو حرم بنا کر اہلِ مکہ کے تجارتی راستوں پر قبضہ کرنا اور ان کے قافلوں سے تعارض کرنا آنحضرتؐ کی دفاعی سیاست کے اہم ترین اجزا تھے۔ ان سے آپ اہلِ مکہ کی معاشی زندگی پر قابض ہو گئے تجارت و آمد رفت کے سلسلوں کو تباہ کرنا گویا انہیں برباد کرنا تھا۔

دفاعی سیاست کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ دشمن کو کبھی حقیر و بے چارہ نہ سمجھا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اصولِ حیات اور افکار و خیالات کو صحیح طور پر سمجھ کر اسے اس طرح جانچا جائے کہ وقت پر اس کی چالوں کا خاطر خواہ توڑ

کیا جا سکے۔ بے بسی و بے چارگی سے مایوسی پیدا ہوتی ہے اور مایوس و دل شکستہ قوم پست حوصلگی کے باعث جلد ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو جنگ کا فیصلہ جانی نقصان کی کثرت و قلت سے تو شاذ ہوتا ہے۔ عموماً ناامیدی ہی قوم کو شکست دیتی ہے اس حقیقت کو ہجرت کے دفاعی منصوبہ پر منطبق کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا۔ کہ ہجرت کے تین سال کے اندر ہی گردن فرازان مکہ پر مجبوری و بے بسی و شکستہ دلی کا غلبہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور ان کی جمعیت میں انتشار و کمزوری کے آثار پیدا ہونے لگے تھے +

تین نعمتیں

اس کارروائی سے اہلِ ایمان ایک طرف ہو گئے اور اہلِ کفر و طغیان ایک طرف مسلمانوں میں کسی قسم کا تفریق و امتیاز نہ تھا۔ سب ایک۔ سب بھائی بھائی، اور سب برابر ہو گئے، سب کا فائدہ اور نقصان ایک ہو گیا۔ سب کے فکر و عمل کا نہج ایک بن گیا۔ جمعیت و شیرازہ بندی سے قوت پیدا ہوئی اور قوت نے عمل کی راہیں کھول دیں اب مسلمان علیحدہ قوم تھے اور کفار و مشرکین علیحدہ۔ خون، قبیلہ اور خاندان کے تمام رشتے منقطع ہو گئے۔ حالات جس رفتار سے بڑھ رہے تھے۔ ان میں تصادم ناگزیر تھا۔ کفار مسلمانوں کی آزادی و ترقی کو خاموشی سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لہذا آنے والے حالات کے مقابلہ کے لئے آنحضرتؐ نے ہجرت کے پہلے ہی سال "نیشنز ایٹ وار" کے اس اصول کی عملی تعلیم دی۔ جس کی حکمت و افادیت یورپ پر پہلی دفعہ ۱۹۱۴ء۔۱۸ء کی جنگ میں منکشف ہوئی۔ نیشنز ایٹ وار (Nations-at-War) اور جہاد ایک ہی اصول اور ایک ہی مقصد کے دو نام ہیں +

بہر حال اس وقت مسلمانوں کو تین بڑی نعمتیں حاصل ہو چکی تھیں۔

۱۔ قرآن مجید یعنی اسلامی تعلیم جو عقبیٰ کے علاوہ دنیا کی ساری کامیابیوں اور سعادت اندوزیوں کی ضامن تھی :-

۲۔ اخوت و مساوات

۳- جہاد (Nations-at-War)

تیاری اور اصولِ جنگ

جب ان نعمتوں کی برکت سے مدینے کی چھوٹی سی مملکت ہر پہلو سے مکمل و منظم ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے قبائل کی جانب توجہ فرمائی اور ان کو جانچنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ مجاہدین کی عسکری تربیت بھی فرماتے رہے۔ گویا ایک اچھوتی اور مہذب قومیت کا قیام عمل میں لانے کے بعد اسے مجاہد بنانا شروع کر دیا۔ عرب حیوان سے انسان اور بااخلاق انسان بن چکے تھے۔ اب آپ انہیں باعلا انسان بنا رہے تھے۔ قرآن نے ان کے لئے جو اصولِ جنگ وضع کئے۔ انہیں مسلمان فخر کے ساتھ ہمیشہ مہذب دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ جنگ کی اجازت اس حکم کے ماتحت ہے۔ "کہ ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن کے ساتھ جنگ کی گئی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم ہوا۔" (قرآن) گویا جنگ اپنے تحفظ اور دفعِ ظلم کے لئے کرو تاکہ ظالم اپنے ظلم میں ترقی نہ کرے اور کسی دوسری قوم کو ظلم سے مٹا نہ دے۔ گویا مسلمان کے لئے جنگ کرنا محض مظلوم کی حمایت کے لئے مناسب قرار دیا گیا+

مگر اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ دوسرے مذاہب کے عبادتخانوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب کے بزرگوں اور پیشواؤں کی عزت و تکریم کی تاکید کی گئی تاکہ مجاہدین دفعِ ظلم کے جوش میں حد سے نہ گزر جائیں +

مالِ غنیمت کے متعلق حکم آیا۔ "اے نبیؐ لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ فرما دیجئے کہ مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ تمہاری خواہشات کو اس میں دخل نہیں۔ تمہارا کام اللہ سے ڈرنا، آپس میں سلوک رکھنا اور اللہ و رسول کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ جنگ میں ہمت و حوصلہ قائم رکھنے کی تاکید میں فرمایا گیا۔ جب تم میدانِ جنگ میں کافروں کے مقابل ہو تو پیٹھ نہ دکھاؤ...... جو کوئی لڑائی کے دن پیٹھ پھیرے گا۔ وہ اللہ کے غضب کا مورد ہو گا۔ اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا+

دفعِ ظلم کے لئے لڑنے یعنی جہاد کرنے کو زندگی کہا گیا اور اس کی اہمیت اس طرح واضح کی گئی +

"اے ایمان والو اللہ اور رسول کا حکم مانو۔ جس وقت تمہیں اس کام کی طرف بلائے جس میں تمہاری زندگی ہے......"

فتح و کامیابی کے لئے خشیتِ الٰہی کو لازمی قرار دیا گیا اور ارشاد ہوتا ہے:۔

"اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تمہیں فیصلے کی چیز دے گا اور تمہارے گناہ دور کر دے گا اور بخش دے گا"

جہاد کب تک کیا جائے اس کے متعلق حکم ہوا:۔

اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ شرک کا غلبہ نہ رہنے پائے اور سارا دین اللہ کا ہو جائے"

غنیمت کی تقسیم کے متعلق ہدایت کی گئی کہ اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ باقی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اس طرح نظم دفاع کے لئے سورۃ انفال میں حسب ذیل احکام وارد ہوئے:۔

"اللہ اور رسول کا کہنا مانو، آپس میں جھگڑے نہ کرو۔ ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"

دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔

"دشمن سے لڑنے کے لئے سامانِ حرب اور اپنی سپاہیانہ طاقت کو ہر وقت تیار رکھو تاکہ دشمنوں پر تمہارا رعب قائم رہے"

جہاد کا مقصد صرف دفع ظلم ہے اس میں حد سے تجاوز کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ چونکہ اسلام امن و سلامتی کا پیغام اور دنیا کے لئے سرتاسر رحمت ہے۔ اس لئے قرآن ہدایت کرتا ہے کہ:۔

"اگر دشمن صلح پر مائل ہو تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ گویا یہ نہ ہو، کہ اپنی طاقت کے زعم میں حد سے بڑھنے لگو اور دشمن صلح چاہے تو تم صلح نہ کرو"

یہ قرآن کے منصوص احکام ہیں۔ ربطِ مطلب کے لئے لفظی ترجمہ کی من و عن پابندی نہیں کی گئی۔ بہر حال یہ ہے وہ بنیاد جس پر اسلام نظامِ دفاع کو استوار کرتا ہے اور جس میں جائز و ناجائز اور ممنوع و مستحسن کی حدیں واضح طور پر متعین کر دی گئی ہیں۔ آنحضرت صلعم نے اس دفاعی ضابطہ کے ساتھ مجاہدین کی تربیت فرمائی اور اس تربیت نے مٹھی بھر بادیہ نشینانِ

عرب کو وہ قوت وعظمت عطا کی کہ بڑائی اور طاقت کی ساری قدریں بدل گئیں اور ایک ایک مجاہد فی سبیل اللہ سینکڑوں ہزاروں دشمنانِ خدا و رسولؐ پر بھاری ہوگیا +

لڑنے والی فوج کے لئے سامانِ حرب وضرب بلاشبہ بہت ضروری ہے اس کے بغیر جنگ کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔ لیکن حسنِ کردار اور خوبیٔ اخلاق کے بغیر سامانِ حرب کی کثرت بھی سودمند نہیں ہوتی۔ یہ ضابطۂ جنگ، نصرتِ الٰہی کی یہ بشارتیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی کمانڈ، حق کی فتح وسربلندی اور باطل پرستوں کے خسران وناکامی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی تھی۔ چنانچہ دنیا نے اس کی اعجاز نمایاں دیکھیں اور نہ صرف عہدِ نبوت میں دیکھیں۔ بلکہ مسلمانوں نے اپنی اصل ومعنویت کی طرف جب بھی معاودت کی اور کتاب وسنت کو جب بھی منہاجِ عمل بنایا۔ نتائج اتنے ہی حیرت انگیز برآمد ہوئے +

۲۔ آنحضرت صلعم بحیثیتِ سپہ سالار

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں حقیقتیں کبھی نہیں بدلتیں۔ جنگ و تصادم آفرینشِ انسان کے بعد سے برابر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس سے کوئی زمانہ اور کوئی دور خالی نہیں رہا۔ جنگ و جدال اس کی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کی پوری تاریخ اسی جنگ و جدال اور جہد و پیکار کی مسلسل داستان کا نام ہے تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ اسلام نے اس کی فطرت کے اس خاصہ کو نظر انداز کر کے اسے ایک گلّہ پر چپت کے بعد دوسرا گلّہ پیش کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ اس کی کامل تہذیب اور اس کے اختیارات کی تحدید کر کے "کلّہ بہ کلّہ" جواب دینے کی اجازت دی ہے اس اجازت کے منصوص احکام اس باب کے جزوِ اول میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ جنگ و تصادم کا یہ وہ ضابطہ ہے۔ جس سے بہتر و صحیح تر اور جس سے زیادہ مفید و نتیجہ خیز ضابطہ نہ کبھی دنیا کے سامنے آیا ہے نہ آ سکتا ہے۔

اس کے ساتھ فنِ حرب اور سیاستِ دفاع کے چوٹی کے ماہرین و مبصرین کے وہ افکار و آرا بھی بیان ہو چکے ہیں۔ جو لوازمِ کامیابی سے لے کر قائدِ لشکر کے ذاتی اوصاف و خصوصیات تک پر حاوی ہیں۔ اسی ذیل میں آنحضرت صلعم کے حمیدہ خصائل آپ کی ذہانت و دور بینی، تدبر و مآل اندیشی، صبر و استقامت تحمل و بردباری، نیکوکاری و انصاف پسندی۔ رفق و خلوص اور انسانی ہمدردی کی صفاتِ عالیہ کے اوج و کمال کا ذکر بھی آ چکا ہے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجاہدین کی تربیت کتنے اعلےٰ پیمانے پر کی اور آپ کے ذاتی کمالات مسلمانوں کی اس تربیت میں کیسے کیمیا اثر ثابت ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان کی تائید میں دنیا کے چند چیدہ ماہرینِ دفاع کے ضروری تبصروں کا خلاصہ پیش کر دیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دنیا نے صدیوں کے تجربات کے بعد دفاعی تیاریوں کے جو اصول وضع کئے ہیں وہ کیا ہیں اور یورپ و امریکہ جو اپنے آپ کو ترقی

کے نقطۂ کمال پر فائز سمجھتے ہیں اپنی فوجوں کی تربیت کن اصولوں پر کرتے ہیں۔
ان کا لب لباب یہ ہے:۔

۱۔ فوج کی جنگی قابلیت کا انحصار چند نہایت ضروری امور پر ہے اور وہ یہ ہیں کہ "سپہ سالار کو اعلیٰ خصائل کا حامل، شخصی طور پر قابلِ تعظیم اور حکومت کی اہلیت کا مالک ہونا چاہیئے اس کے دل و دماغ عزم و اعتماد، عقل و شعور، استقلال و سلامت روی اور انصاف پروری و اعتدال پسندی کی خوبیوں سے متصف ہوں۔ اسے زندہ دل، جفاکش، اور بے خوف و بے باک ہونا چاہیئے۔ اسی طرح مصائب کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا، غور و خوض کا عادی اور مردم شناس ہونا لازمی ہے تاکہ وہ اپنے آدمیوں اور دشمن کو صحیح طور پر سمجھ سکے +

۲۔ فوج کی تربیت اعلےٰ پیمانہ پر ہونی چاہیئے۔ فوجی تربیت کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ فوج قابلیت سے لڑ سکے۔ یہ تربیت سپہ سالار سے ادنیٰ سپاہی تک سب کے لئے لازمی ہے تاکہ زمانۂ امن میں افسر اپنے ماتحتوں کو سکھا سکے اور دورانِ جنگ میں سالاری کر سکے اور سپاہی اس کے احکام کو آسانی سے سمجھ سکیں +

فوجی تربیت کا اولین و لازم ترین اصول نظم کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جسمانی و دماغی تربیت کی جاتی ہے۔ جسمانی تربیت سے سپاہی سخت جان بنتا ہے اور دماغی تربیت سے احکام کی تعمیل عقلمندی سے کرتا ہے۔ اس طرح اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ نظم کے بغیر فوج بھیڑوں کا ریوڑ ہے +

۳۔ نظم و ترتیب سے فوج ایک اعلےٰ درجہ کا ہتھیار بن جاتی ہے۔ جسے سپہ سالار دشمن کے خلاف کامیابی سے استعمال کر سکتا ہے۔ ترتیب سے مراد فوج کو ٹولیوں میں تقسیم کرنا اور مختلف ٹولیوں کے مختلف فرائض مقرر کر کے ان کو سمجھانا اور سکھانا ہے۔ مثلاً سوار فوج کو اس کی ذمہ داریوں سے پوری طرح آگاہ کرنا اور ان کو روبہ عمل لانا، پیدل کو اس کے لڑنے کا طریقہ سکھانا اور نقل و حمل کی ٹولی کو اس کے فرائض کا پابند بنانا وغیرہ۔ پھر ان سب کو مل کر یکجہتی و تعاون سے جنگ کرنا +

۴۔ آلاتِ حرب کا عمدہ ہونا اور ان کا صحیح استعمال۔ کامیاب جنگ کے لئے ضروری ہے کہ فوج کے پاس حسبِ زمانہ جدید قسم کے ہتھیار ہوں اور ان ہتھیاروں کی نگہداشت صحیح طریقہ سے کی جائے +

اس سلسلے میں جنرل آیرڈ کا تبصرہ قابلِ غور ہے فرماتے ہیں :-

"ہر ملک جو قوم و حکومت اپنے مفاد کی حفاظت جنگ کے ذریعہ کرنا چاہتی ہے۔ اسے اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ کوئی کارروائی ہمسایہ حکومتوں کے نظریوں کی پاسداری کے خلاف نہ ہو جس سے وہ خواہ مخواہ ناراض ہو کر اپنے خلاف دشمن کے ساتھ صف آرا ہو جائیں۔ اس خارجی حکمتِ عملی کا انحصار تین باتوں پر ہے :-

اوّل ۔ اپنے ملک کی جغرافیائی پوزیشن پر۔

دُوم ۔ اپنے قومی مفاد پر، اور

سُوم ۔ اپنے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے قوم کے عزم پر۔

پہلی دو باتیں اس کا فیصلہ کرتی ہیں کہ کن کن حکومتوں سے کس کس قسم کے تعلقات اور کیا برتاؤ رکھنا چاہیئے۔ تیسری کے مطابق دشمن کے خلاف اپنے نرم، گرم، سخت، بے باکانہ یا مصالحانہ طرزِ عمل کا تعین ہوتا ہے اور مجموعی طور پر ان تینوں کے مطابق اس کی فوج مضبوط یا کمزور ہوگی ـــــ لہٰذا جنگ کی تیاری تین قسم کی ہوتی ہے :-

۱۔ سیاسی

سیاسی تیاری کے وقت حکومت پر ملک کے باشندوں کا کامل اعتماد ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہمسایہ حکومتوں کے ساتھ دوستی و حمایت اور اعتماد کا رشتہ قائم ہو تاکہ یہ بات واضح طور پر معلوم رہے کہ خطرات کا اعلان کس کس طرف سے ہے۔ اور ان کا تدارک کیا کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اخلاقی و مادی

جب ملک کی اخلاقی حالت مستحکم ہو کر نظم و نسق کا معیار خوبی بن جاتی ہے۔ تو جنگ میں کامیابی یقینی ہوتی ہے۔ نپولین کا قول ہے کہ اخلاقی طاقت جسمانی طاقت سے کم از کم تین گنا زیادہ اہم ہے۔ چونکہ فوج ہر لحاظ سے اپنے ملک و قوم کی علمبردار ہوتی ہے۔ اس لئے جس فوج میں سچائی، بردباری، ایثار، و جاں نثاری اور صلاحیت و استعداد کی خوبیاں اور عشرت رانی کے بجائے نفس کشی کے اوصاف ہوں گے۔ وہ ہر جدوجہد میں کامیاب رہے گی +

۳۔ آلاتِ حرب و ضرب

فوج کا جدید آلاتِ حرب سے مسلح ہونا ضروری ہے۔ اس سے اپنی فوج پر اپنے ملک کے باشندوں کا اعتماد بڑھتا ہے اور اس اعتماد سے تجارت فروغ پاتی ہے۔ دوسری قومیں اس زبردست فوج کے باعث اس ملک کے حقوق و مفاد، اس کی حکومت اور اس کی تجارت کا احترام کرتی ہیں ـــــ حکومت کا فرض ہے کہ اعلانِ جنگ کے وقت وہ ملکی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے فوج کو اپنے دفاعی مقاصد سے واضح طور پر آگاہ کر دے+

اب دوسرے پہلو پر آیئے جنرل ہملے اور جنرل کیگل اپنی کتاب "آپریشن آف وار" میں لکھتے ہیں:-

"جنگ شروع کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ لڑائی کن کن حالات اور کن کن اثرات کے ماتحت لڑی جائے گی۔ میدانِ جنگ کس قسم کا ہے؟ ـــــ فوجوں کے ہتھیار خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں بدلتے رہیں گے۔ میدانِ جنگ میں کامیابی کے لئے فوج میں عزم و اخلاق، نظم و ضبط، عقل و فہم، جسمانی طاقت اور تحمل مصائب کی قوت کا ہونا لازمی ہے۔ لڑائی کے میدان میں اخلاقی قوتوں کی خاص آزمایش ہوتی ہے ـــــ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ جنگ کا آغاز اچھا ہو اور آغاز اسی وقت اچھا ہوتا ہے۔ جب آغازِ جنگ سے پہلے زمانۂ امن میں لڑائی کی پوری تیاری کر لی جائے۔ لیکن یہ تیاری بیکارِ محض ہے۔ اگر فوج کو اس زمانہ میں عمدہ تربیت دے کر سخت جان نہ بنا دیا گیا ہو۔ پھر مصائب کے خنداں و فرحاں برداشت کرنے کا انحصار جسمانی قوت سے زیادہ اخلاقی قوت پر ہے ـــــ اس لئے سپہ سالار پر لازم ہے کہ وہ فوج کی اخلاقی تعلیم کا بہت زیادہ خیال رکھے۔ کیونکہ دفاعی منصوبوں کی کامیابی کا دارومدار اخلاقی حالت کے اچھے یا برے ہونے پر ہوتا ہے+

اصول و نظریات کی دنیا سے اب عمل و تجربہ کی دنیا میں آیئے اور ان کی صحت کو واقعات و مشاہدات پر منطبق کر کے آزمایئے اکثر دفاعی ماہرین کی رائے ہے۔ کہ فرانس ۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ عظیم میں محض اس لئے جلد شکست کھا گیا کہ فرانسیسی سپاہی آرام طلب عیش پسند اور پست حوصلہ تھے اور خود اعتمادی کے جوہر سے تہی مایہ۔ گو مسولینی نے اطالیوں کو جسمانی اور تعلیمی اعتبار سے فائق بنا دیا تھا مگر اخلاقی مضبوطی کی طرف توجہ نہ کی۔

اس لئے میدانِ جنگ میں وہ بہت جلد جی چھوڑ بیٹھے۔ یہی حال صلیبی حملہ آوروں کا صلیبی جنگوں میں صلاح الدین ایوبی کے مقابلہ پر ہوا۔ صلیبی جنگ بازوں کی ان غلطیوں کے علاوہ جنھیں جنرل ٹوکر نے اپنی کتاب میں شمار کرایا ہے اور جس کا حوالہ پچھلے باب میں دیا جا چکا ہے۔ ہماری رائے میں صلیبی سورماؤں کی سب سے بڑی کمزوری ان کی اخلاقی پستی تھی اس کی تائید میں ٹی اے آرچر اور چارلس لیبصرج کنگزفورڈ اپنی کتاب "قوموں کی تاریخ۔ صلیبی جنگ" میں لکھتے ہیں:۔

"پہلی صلیبی جنگ کا آغاز کرنے والوں کے سامنے دو مقاصد تھے۔ پہلا اور غالباً اہم تر یہ تھا کہ مقاماتِ مقدسہ پر عیسائی حکومتیں قابض ہو جائیں اور دوسرا یہ کہ مشرقی یورپ کو ترکوں کے حملوں سے بچایا جائے"۔

پہلا مقصد قریب قریب حاصل ہو چکا تھا کہ صلیبی لشکر زوال میں آ گیا۔ جس سے یہ حاصل شدہ مقصد بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس کے اسباب مختلف ہیں۔ مگر چند ضروری یہ ہیں:۔

اوّل۔ وسعت کے لحاظ سے مفتوحہ علاقہ بہت کم تھا۔ لہٰذا اس کے حدود ہر لحظہ معرضِ خطر میں تھے۔ دوم فوجوں میں رشک و حسد کی وجہ سے آپس میں ناچاقیاں تھیں۔ سوم۔ صلیبی عیسائیوں اور شام کے مسیحیوں میں باہم اعتماد نہ تھا۔ چہارم۔ افسر باہم دست و گریباں تھے جو فوج مشرق میں آ کر مقیم ہوئی وہ بدنظمی، آرام طلبی، اور عیش پسندی کا شکار ہو گئی اور مغربی باشندوں کا جوش و ولولہ سرد ہو گیا۔

دوسرے مقصد کے سلسلے میں دو نظریئے تھے۔ اوّل مشرقی یورپ کی عیسائی حکومتیں ترکوں سے خوف زدہ تھیں اور اپنا تحفظ چاہتی تھیں۔ صلیبی جنگوں نے ان حکومتوں کی بربادی کو ملتوی ضرور کر دیا۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان حکومتوں کی کمزوری اور نتیجتہً تباہی کا باعث بھی صلیبی فوج ہی ہوئی۔ کیونکہ ترکوں کے روکنے میں پہلی صلیبی لڑائی کا جو مفید اثر ہوا وہ چوتھی جنگ نے زائل کر دیا اور اس کے بعد مشرقی یورپ میں اسلامی فوج کو روکنے والی کوئی طاقت نہیں رہی۔ ان صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے مشرقی دنیا اور مغربی ملکوں کے مابین مذہبی و سیاسی فرق بہت گہرا ہو گیا۔ اور عیسائی حکومتوں کی طاقت نہایت کمزور ہو گئی۔

دوسرا مقصد یورپ میں اسلام کی اشاعت کی روک تھام کرنا تھا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"حدودِ یورپ سے باہر قدم رکھنے کے بعد صلیبی نائٹوں نے سیاسی شادیاں کیں جن کی نظیر سوائے اوتھوثانی (Otho II) کے کہیں نہیں ملتی۔ یہی نہیں بلکہ شاہ ایڈورڈ اول کو بڑے وثوق کے ساتھ یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ یورپ کی حسین شہزادیوں کو مشرقی زبانوں کا ماہر بنا کر بھیجا جائے۔ تاکہ ان کی شادیاں ترک اور عرب والیانِ ملک سے کرادی جائیں اور وہ خدا کی رحمت اور اپنی رعنائی حسن سے اپنے خاوندوں کو عیسائی مذہب میں لے آئیں۔"

گویا اخلاقی کمزوریاں اور کردار کی پستیاں میدانِ جنگ ہی میں شکست و ناکامی کا سبب نہ ہوئیں۔ بلکہ فکر و عمل کی پوری دنیا پر مستولی تھیں۔ لہٰذا ان کے نتائج بھی ویسے ہی خسران و تباہی کی صورت میں برآمد ہوئے۔

اگرچہ یہ حوالے اور شہادتیں کافی طویل ہوگئی ہیں۔ لیکن سُقراط کے خیالات اور ملاحظہ کرتے چلئے کہ حکمائے قدیم میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ایسے دور سے تعلق رکھتا اور ایسی تہذیب کا خالق و نمائندہ ہے جو معیار و مرتبہ کے اعتبار سے ہمیشہ وقعت و تحسین کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ سپہ سالار کے اوصاف و خصائص بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"سالارِ لشکر کے لئے لازمی ہے کہ اسے اس کا بخوبی علم و اطمینان ہو کہ اس کی فوج کو سامانِ رسد اور دوسری قسم کا سامان کہاں سے ملے گا تاکہ فوج کو کسی سامان کی کمی محسوس نہ ہو۔ اس میں یہ استعداد ہونی چاہیئے کہ وہ دفاعی منصوبے تیار کرسکے اور نہ صرف تیار کرسکے۔ بلکہ ان کو روبہ عمل لانے کا عزم و صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ اسے باریک بین، سادہ دل، محنتی و جفاکش اور کبھی رحمدل اور کبھی سفاک ہونا چاہیئے۔ کبھی چوکیدار کی طرح ہوشیار کبھی چور کی طرح موقع کی گھات میں، کبھی فیاض، کبھی بخیل، کبھی بے باک، کبھی محتاط، کبھی متین و بردبار، کبھی عیار و چالاک، یہ ایسی خصوصیتیں ہیں جن میں سے بعض پیدائشی ہیں، بعض تجربہ اور غور و فکر سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ سپہ سالار کو فنِ حرب اور دفاعی سیاست کا ماہر ہونا لازمی ہے اور فوج کے لئے نظم و ضبط انتہائی ضروری ہے۔ بغیر نظم فوج انسانوں کا محض جمگھٹ ہے جس طرح اینٹیں، چونا، ریت، اور دیگر سامانِ تعمیر کو عمارت نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح یہ مجمع بھی فوج نہیں کہلا سکتا۔"

اس بیان کا سب سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز حصّہ وہ ہے۔ جس میں سپہ سالار

کے اوصاف شمار کرائے گئے ہیں۔ سپہ سالار کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ بتائی گئی ہے کہ اسے سامانِ رسد اور سامانِ حرب کی موجودگی و ذرایع فراہمی کا علم واطمینان ہو۔ نپولین نے اسی کے نصف اوّل کو یوں بیان کیا ہے کہ "فوج خالی پیٹ لڑائی نہیں لڑ سکتی"۔

نظم و ضبط سے سقراط کی مراد ہر قسم کے فوجی نظم سے ہے۔ کیونکہ نظم ہی سے فوج فوج بنتی اور صحیح طریقہ پر نقل و حرکت کر سکتی ہے۔ اور صحیح نقل و حرکت ہی پر دفاعی سیاست اور فنِ سپہ گری کا انحصار ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ آج کل بعض نوجوان فوجی افسر فنِ جنگ کے اصولوں کا سمجھ لینا ہی فنِ سپہ گری کا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے دفاعی ماہرین تاکید و تواتر کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ "موٹر گاڑی کے انجن کا درست ہونا بالیقین ضروری ہے۔ مگر اس طرح کہ گاڑی کے ایک پہیہ میں بھی کوئی نقص نہ ہو۔ اگر ایک میں بھی نقص ہوگا تو گاڑی حرکت نہ کر سکے گی خواہ انجن برابر چلتا رہے"۔

بہرحال سقراط کی رائے بھی تقریباً وہی ہے جو آپ حال و ماضی قریب کے دوسرے ماہرینِ دفاع کے تبصروں میں پڑھ چکے ہیں مگر سقراط نے بعض نکات و اوصاف کو فراموش کر دیا ہے۔ یہ ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت و سالاری میں پوری طرح نمایاں نظر آتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ تحمل و برداشت کی قوت، نفس کشی، تن آسانی سے گریز اور صبر و استقامت۔ گویا سپہ سالار کو سخت جان، جفاکش اور مستقل مزاج ہونا چاہیئے۔ پچھلی دو عالمگیر لڑائیوں میں بہت سے بڑے معرکوں میں محض اس وجہ سے ناکامیاں ہوئیں کہ جرنیلوں کے عزم کی قوت متزلزل اور صبر و استقلال کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ورنہ ان کی فوجوں میں لڑنے کا دم اور حوصلہ باقی تھا۔

لشکریانِ اسلام کی تربیت

اب آیئے یہ دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکریانِ اسلام کی تربیت کس طرح فرمائی اور لوازم تکمیل میں کن کن امور کو شامل کیا:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اوائل عمر سے اس حقیقت کا اچھی طرح علم تھا کہ جنگ ایک بھیانک بازی ہے اور اس بازی کے کھلاڑی کو بھوک، پیاس مصائب، اور خطرات کے مقابلہ کے لئے عزم و حوصلہ کے علاوہ سخت تربیت کی بھی

ضرورت ہے۔ معذوروں اور کم سنوں کو چھوڑ کر مسلمان بلا فرق و امتیاز اسلام کے سپاہی ہیں۔ لہٰذا ان کے علاوہ اس تربیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپؐ نے روزے رکھنے کا حکم دیا تاکہ مسلمان مجاہد بھوک پیاس کی تکلیف کو آسانی سے برداشت کر سکیں اور اس کے عادی بنیں۔ آپؐ کو معلوم تھا کہ سالار کو اپنے لشکر کی زندگی کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور یہ اس وقت تک بہ احسن الوجوہ پوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک اطاعت و فرمانبرداری کے محرکات نہایت قوی نہ ہوں۔ فوج اور سالارِ فوج میں کامل ربط و ہم آہنگی نہ ہو، اعتماد و انقیاد کے جذبات میں زندگی نہ ہو اور فوج کو اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ مقصد و جزئیاتِ مقصد سے لے کر سالار کے شخصی کردار تک ہر چیز دلکش اور معیاری اور ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست کے مصداق قابلِ تکریم و تقلید ہے۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آنحضرت صلعم کے عادات و خصائل اور اعمال و افعال کا اثر اہلِ ایمان پر کتنا تھا اور کردار کے اعتبار سے کفار و مشرکین بھی آپ کو کس درجہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ گویا وہ تمام خوبیاں جو ایک اعلیٰ درجہ کے سالار میں ہونی چاہئیں آنحضرت میں بہ تمام و کمال موجود تھیں۔ اور مسلمانوں کی اخلاقی تربیت میں نمونہ و مثال کی حیثیت رکھتی تھیں+

رہا نظم و ضبط کا معاملہ تو یہ بھی مثالی تھا۔ اہلِ ایمان آنحضرتؐ کے جاں نثار تھے۔ ان کا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے تھا۔ خاندانی، نسبی، نسلی، اقتصادی اور مالی ناہمواریاں یک قلم دور ہو چکی تھیں۔ مساوات و مواخات ایسی کہ چشمِ فلک نے اس کی مثال نہیں دیکھی، جاں بازی و فداکاری کے جذبہ سے ہر مجاہد سرشار، افسری و قیادت ہے تو اللہ کے رسولؐ کی اطاعت میں سبقت کے لئے اور ماتحتی و پیروی ہے تو شوقِ شہادت کی تکمیل کے لئے۔ کل کے گردن فرازوں پر غلاموں اور غلام زادوں کو قائد و رہبر مقرر کیا جا رہا ہے اور سب خوشی خوشی تعمیل حکم کر رہے ہیں۔ تقویٰ و پرہیزگاری معیارِ فضیلت ہے اور اطاعتِ رسولؐ وجہِ فخر و وسیلۂ فلاح+

ان سب کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام غزوات اس احتیاط اس دانشمندی اور ایسی حربی مہارت سے لڑے کہ لشکرِ اسلام کا جانی نقصان ہمیشہ کم سے کم ہوا۔ یہ ایک اور امتیازی وصف ہے جسے دفاعی سیاست کے منصوبے کی اہم تدبیر کے طور پر

پیش کیا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنی اخلاقی قوت اور مجاہدانہ تربیت سے عربوں کو دنیا کا فاتح بنا دیا اور یہ فیض تربیت اتنا قوی اور دیرپا رہا کہ آپ کی وفات کے بعد بھی کفّار کی جرّار فوجیں مجاہدین کے سامنے آنے سے لرزتی رہیں۔

تاریخ جہاد کا ایک واقعہ بطور دلیل ملاحظہ فرمایئے۔ کسی پچھلے باب میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ روم کی سلطنت عربستان کے شمال اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کی قوت اور شوکت کی دھاک ساری دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب مقامی کامیابیوں کے بعد اسلام کے اقتدار کا دائرہ بڑھا تو رومیوں نے اپنے سطوت و جبروت کے مظاہرے سے مجاہدین کو مرعوب اور ان کی پیشقدمیوں کے راستوں کو مسدود کرنا چاہا۔ روم کی سلطنت بڑی طاقتور سلطنت تھی اور اس کے عساکرِ قاہرہ کی دھاک دنیا بھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چنانچہ مڈبھیڑ ہوئی۔ روم کو یقین تھا کہ اس کی فوجیں نہتے عربوں کو شکست فاش دے کر صحراؤں میں دھکیل دیں گی جہاں وہ سامانِ رسد کی قلت و نایابی سے بے حال ہو کر ختم ہو جائیں گے۔ لیکن جب کئی معرکوں میں پے بہ پے شکستیں ہوئیں تو شہنشاہ ہرقل نے اپنے ماہرین حرب و دفاع کو طلب کر کے ان سے ناکامیوں کی وجہ دریافت کی اور کہا کہ عرب سپاہی تعداد میں کم ہیں۔ ان کے ہتھیار ہمارے سامانِ حرب و ضرب کے مقابلے میں نہایت حقیر، ناقص اور دقیانوسی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے عظیم الشان لشکر ان کے مقابلہ پر ٹھہر بھی نہیں سکتے؟ سب لوگ خاموش ہو کر سوچنے لگے، کسی سے کوئی جواب بن نہ آیا۔ آخر کچھ دیر کے بعد ایک کہن سال بہادر اٹھا اور اس نے شہنشاہ کو مخاطب کر کے کہا "عالی جاہ! عربوں کی فتوحات کا راز ان کی اخلاقی قوت میں پنہاں ہے۔ وہ رات کا کچھ حصّہ اپنے خدا کی عبادت میں صرف کرتے ہیں۔ دن کے وقت حسبِ ضرورت روزہ رکھتے ہیں۔ کسی انسان پر ظلم نہیں کرتے۔ باہم اخوّت و مساوات سے رہتے ہیں۔ یہ چند اسباب ہیں۔ جن کی بنا پر وہ جری اور دلیر ہیں اور دشمن پر غالب آتے ہیں ان کا عزم پہاڑ کی طرح اٹل اور مضبوط ہے۔ لیکن روم کے سپاہی، میں شرم و ندامت سے کہتا ہوں، مغرور ہیں۔ طرح طرح کی برائیوں اور بدکاریوں میں مبتلا ہیں۔ وہ عہد شکن ہیں۔ غریبوں پر ظلم و تشدد کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر عربوں سے دلیری و جاں بازی میں کمتر ہیں۔

ایک مغالطہ

جیسا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "بچپن اور جوانی" کے باب میں "تقدیر" کے ذیلی عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں بعض مسلمانوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ آنحضرت کی کامیابیوں کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت حاصل تھی۔ اس پر رائے زنی کرنا اور تدبیر و چارہ سازی کو شریکِ حال قرار دینا ٹھیک نہیں نبوت کے علوئے مرتبت اور اللہ تعالیٰ کی تائید و امداد سے انکار نہیں۔ ہمیں اس کا بھی پورا احترام ہے کہ حضرت کی فطری صلاحتیں اور وہبی طاقتیں غیر معمولی تھیں، کسی معمولی انسان سے آپ کا مقابلہ کرنے کی جسارت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن میدانِ عمل میں آپ نے جو کچھ کیا وہ بہ حیثیت انسان ہی کے کیا جو عالمِ اسباب کے "قانونِ علت و معلول کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بعثت کے بعد آپ نے انتہائی مصائب و شدائد کا مقابلہ کیا۔ لیکن ہمت صبر و استقامت کے ساتھ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیم الفطرت انسانوں نے آپ کے پیغام کو قبول کیا۔ یہ چیز جہاں حق و باطل میں مابہ الامتیاز ہے۔ وہاں اس بات کا بھی اعلان ہے۔ کہ حق کی پشت پر الٰہہ تعالیٰ کی مدد ضرور ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ سعیٔ پیہم اور صبر و استقلال کامیابی کے خاص لوازم ہیں۔ الٰہہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر کو بھی جاں گسل حالات سے گزرنا اور تدبیر و چارہ گری سے کام لینا پڑتا ہے۔ تب کہیں منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے پھر جب حقیقت یہ ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور اسی کے ساتھ پیغمبر کے ہر قول، ہر فعل اور ہر عمل کو اسوہ قرار دے کر اس کی تقلید کی تاکید کی گئی ہے۔ تو رفعت و عافیت کے گوشوں میں بیٹھ کر تقدیر کا سلبی و غیر اسلامی فلسفہ پیش کرنا کہاں تک زیب دیتا ہے +

مکی زندگی کے مصائب و شدائد کے بعد ہجرت کی منزل، اس کے بعد دارالاسلام کا قیام، مسلمانوں کی تربیت، وفود و مہمات کی روانگی، دفاعی سیاست کی تدبیر آرائیاں، پھر غزوات اور ان میں ماہرانہ قیادت، نظمِ مملکت، قبیلوں سے معاہدے اور اس قسم کے تمام دوسرے کام کیا اس طرح انجام نہیں دیئے گئے۔ جس طرح ایک انسان کو دینے چاہئیں اور کیا ان کی تکمیل میں حضرت صلعم کو انہی حالات و واردات کا سامنا نہیں ہوا

جن کا سامنا دوسرے انسانوں کو ہوتا ہے۔ پھر کیا یہ سارے واقعات و حالات، بلکہ آنحضرتؐ کی پوری حیات مسلمانوں کے لئے نمونۂ تقلید نہیں ہے؟ حدیث، سیرت اور تاریخ کی کسی کتاب میں کہیں آنحضرت کی دو شخصیتیں متعین کی گئی ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے فوق وما فوق کی تقسیم کی گئی ہے؟

اب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے اس پہلو کی طرف آتے ہیں۔ جو آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم پہلو ہے۔ یعنی سالارِ مجاہدین اور امیر مملکت کی حیثیت، ہمیں تسلیم ہے کہ آنحضرتؐ کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر ذہین و فطین اور لائق و فائق بنا کر بھیجا تھا۔ لیکن کیا آپؐ نے ان فطری قابلیتوں سے کام لے کر اپنے اندر سالارِ فوج کی اعلیٰ ترین خوبیاں پیدا نہیں کیں اور محنت و جفاکشی کے وہ مراحل طے نہیں کئے۔ جو ان کی تکمیل کے لئے لازمی ہیں؟ صحرا کی صعوبت انگیز زندگی میں آپ نے سفر و حضر، تجارت و کاروبار، جنگ و صلح سب ہی کے تجربات حاصل کئے اور فطری قابلیت اور تجربات و مشاہدات کا یہی امتزاج تھا کہ آپؐ دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ کامیاب جرنیل اور بہترین فرمانروا ثابت ہوئے آپ نے دفاعی سیاست میں جن تدبیروں سے کام لیا اور میدانِ کارزار میں جس حربی مہارت کا ثبوت دیا۔ ساڑھے تیرہ صدی کی ساری ترقیوں کے باوجود دنیا اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کا حال آپ آگے پڑھیں گے +

ہجوم و اقدام

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوات سے قبل اور ان کے دوران میں مختلف صحابہ کی قیادت میں مجاہدین کے دستے مختلف مقامات کو روانہ فرماتے تھے۔ ان کو سرایا کہا گیا ہے۔ یہ مہمات کیوں روانہ کی جاتی تھیں۔ اس قسم کی حملہ آور فوجوں کی اہمیت کیا ہے اور ان کی تربیت کیسے ہوتی ہے۔ اس کا پوری طرح احساس کرانے کے لئے ہم ذیل میں مغربی ماہرین جنگ کی رائے پیش کرتے ہیں:-

"جب کسی فوج کا سپہ سالار یہ فیصلہ کرے کہ اس کی فوج دشمن پر حملہ آور ہوگی۔ تو اُسے یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ فتح صرف اسی فوج کے قدم چومتی ہے جو بڑھ کر خود حملہ کرتی ہے۔ اقدام ہجوم ہی سے فوج کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اور اسی سے سپہ سالار

دشمن پر فوقیت حاصل کر سکتا ہے اور جب دشمن پر ایک دفعہ پیش قدمی کی فوقیت حاصل ہو جائے تو پھر اسے ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے کہ اسی سے دشمن کو زیر کر کے اسے مناسب شرائط تسلیم کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ دشمن پر حملہ کر کے اسے مغلوب کرنے کا عزم فوج کے ہر شخص کے دل میں راسخ ہونا چاہیئے۔ تاکہ ماتحت افسر مناسب موقعہ پر دشمن پر حملہ کر کے خود آگے بڑھتے جائیں اور انہیں ہمت دلانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ ادنیٰ سپاہی سے سپہ سالار تک یہ حقیقت بھی ہر شخص کے ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بالخصوص میدانِ جنگ میں۔ گناہِ عظیم ہے۔ خطرات و مصائب سے گھبرانا یا پہلو تہی کرنا پست ہمتی کی دلیل ہے۔ اور پست ہمتی فوج کے لئے شکست کا اور قوم کے لئے ننگ و عار کا موجب ہوتی ہے۔ حصولِ کامیابی کے لئے حملہ آور فوج کو ان بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہونا چاہیئے:

۱۔ **اچانک حملہ**۔ یہ اتنا زبردست حربہ ہے کہ حملہ آور اسے استعمال کر کے لڑائی کے انتہائی نازک مرحلہ میں دشمن کو ہراساں کر سکتا ہے۔ حملہ آور ہونے کے لئے چند ضروری باتوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے۔ چونکہ اچانک حملہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دشمن کو سراسیمہ و حواس باختہ کر دیا جائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے سے ایسے اثرات پیدا کئے جائیں۔ جن سے دشمن سالار کا دل و دماغ متاثر ہو۔ مثلاً اگر اس کے دل میں اپنی فوجی طاقت کا بے جا غرور پیدا کر دیا جائے۔ اور پندار برتری میں مبتلا ہو جائے تو وہ حملہ آور کے اصل ارادوں سے بے خبر رہے گا۔ اور اسے یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس کے خلاف کہاں اور کس قسم کا حملہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ اچانک حملے کا موقع کبھی کبھی ملتا ہے اور اگر اس سے فی الفور فائدہ نہ اُٹھایا جائے تو پھر ہاتھ نہیں آتا۔ لہٰذا حملہ آور کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اسے استعمال کرنے کے لئے قبل از وقت پوری احتیاط سے منصوبہ بنائے۔ اور اسے رو بہ عمل لانے کے لئے پوری طرح تیار رہے۔ نیز اس بات کا خیال رکھے کہ اگر کسی وجہ سے یہ حملہ کامیاب نہ ہوا۔ مثال کے طور پر دشمن کو منصوبہ کا راز معلوم ہو گیا تو اس کا تدارک کیا جا سکے۔ منصوبہ کا مخفی رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً اس وقت جب اس پر عمل کرنے کی تیاریاں سرگرمی سے جاری ہوں تو اصل راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ فوجی ان تیاریوں سے حملہ کی نوعیت کا اندازہ لگا لیں گے تو اس صورت میں بھی اسے مخفی رکھنے کی تدبیریں پہلے سے سوچ

لینی چاہئیں۔ اچانک حملہ کا منصوبہ معدودے چند ہی آدمیوں کو بتانا چاہیئے تاکہ راز فاش نہ ہو۔+

اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اچانک حملہ کے منصوبے کے اہم نکات کا علم بہت کم ماتحتوں کو ہونا چاہیئے۔ پچھلی جنگِ عظیم (۴۵-۱۹۳۹) میں جب کبھی اچانک حملہ کا راز فاش ہوا زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ مثال کے طور پر حکومتِ برطانیہ نے برما پر حملہ کر کے ایک اہم بندرگاہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ ہر قسم کی احتیاط کام میں لائی گئی اور بالآخر مہم تیار ہو گئی اس کے ساتھ ایک نوجوان پادری بھی جا رہا تھا وہ اس خبر سے اتنا خوش ہوا کہ خوشی منانے کے لئے گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں کھانا کھانے گیا اور خوب شراب پی۔ جب شراب کے نشہ میں مدہوش ہو گیا تو اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔ میں بہت ہی خوش قسمت ہوں، کہ ولایت سے آنے کے فوراً بعد مجھے اس فوج کے ساتھ جانے کا موقعہ مل گیا جو جاپانیوں پر سمندر سے حملہ کرنے والی ہے دوسرے دن علی الصّباح فوج اس مہم پر روانہ ہو گئی مگر جب اس بندرگاہ (اکیاب) پر پہنچی تو دشمن لڑنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ جس کی وجہ سے اس فوج کو سخت نقصان اٹھا کر واپس آنا پڑا۔ جب تفتیش ہوئی تو پتہ چلا کہ اس نقصانِ عظیم کی وجہ یہ تھی کہ حملہ کا راز افشا ہو گیا تھا۔ اور ایک مخبر نے اس ہوٹل سے جاپانیوں کو اس مہم کی اطلاع دے دی تھی۔ لہٰذا وہ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے+

آگے چل کر یہ دکھانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان اصولوں پر کس طرح عمل کیا اور کن کن احتیاطوں سے کام لیا+

بہرحال یہ امر مسلمہ ہے کہ ناگہانی حملہ جنگ کا نہایت کارآمد حربہ ہے۔ مگر ان تمام احتیاطوں اور تیاریوں کے ساتھ جو اس کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ اچانک حملے کے اثرات، نو ایجاد اسلحہ، فنِ حرب کے اچھوتے طریقوں اور حملے کے منصوبے کو انتہائی راز رکھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن ناگہانی یا اچانک حملہ آسان کام نہیں۔ اس میں خفیہ احتیاط تیاری اور راز داری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اتنی ہی احتیاط تیاری اور راز داری سے دشمن بھی ہر قسم کی چالوں اور تدبیروں کا بغور مطالعہ اور ان کے تدارک کی سبیل کرتا رہتا ہے اس لئے اچانک حملہ بہت دشوار ہوتا ہے اور جتنا دشوار ہوتا ہے اتنا ہی اس کی تیاریوں کو صیغۂ راز میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ایسے اخفا و راز داری میں کامیابی

کے لئے نہایت ضروری ہے کہ جملہ ماتحت افسر اور دوسرے فوجی اپنے سالار کا پورا پورا ہاتھ بٹائیں +

۲- دشمن پر فتح پانے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ دفاعی منصوبہ سازی اور اس پر عمل درآمد میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور ہر کام انتہائی مستعدی اور بغیر ادنیٰ ضیاع وقت سے انجام پائے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ گھبراہٹ اور جلد بازی سے کام لیا جائے جب دشمن پر پیش قدمی کا اختیار حاصل ہو جائے تو موقعہ کو ہرگز ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے اس کام کی تکمیل و انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ سپہ سالار بروقت واضح احکام صادر کرے جن پر کسی کو کوئی شک و شبہ نہ ہو۔ اور ماتحت افسر پوری تن دہی سے ان کی تعمیل کریں۔ اگر اس قسم کے اہم کاموں کی انجام دہی کی تربیت زمانۂ امن میں اچھی طرح دی جائے تو زمانۂ جنگ میں لڑائی کے ہنگاموں کے باوجود ہر کام خوش اسلوبی اور باقاعدگی سے تکمیل کو پہنچ سکتا ہے +

اس کے ساتھ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ماتحتوں میں خود اعتمادی اور دشمن پر حملہ آور ہونے کا جذبہ ہو تاکہ وہ احکام پر سوچ سمجھ کر اپنی ذمہ داری کے ساتھ برابر عمل کرتے چلے جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی مشین کے چلتے وقت اس کے تمام پرزے اپنا کام کرتے ہیں۔ اس ترتیب و باقاعدگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سالار کو دشمن کی چالیں سمجھنے اور اپنے منصوبوں کے مزید غور و فکر پر توجہ مرکوز کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے اور دوسرے معاملات اس میں انتشار پیدا نہیں کر سکتے +

پھر جس طرح یہ ضروری ہے کہ احکام بروقت جاری کئے جائیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فوج کے تمام عناصر ان کی تعمیل بروقت اور مکانی تعجیل کے ساتھ کریں جب عزم بالجزم کے ساتھ تعمیل احکام میں تعجیل و برق رفتاری شامل ہو جاتی ہے تو دشمن کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں اور جب پاؤں اُکھڑ جائیں تو عزم و استقلال کی قوت اور تیز رفتاری کے ساتھ آخری حملہ کر کے اسے شکست فاش دی جا سکتی ہے +

۳- تیسرا اہم اصول سادگی ہے۔ اگر جنگ میں فریقین کے دفاعی منصوبے دونوں کے خیالات کے مطابق چلیں تو نہ کسی کو فتح ہو نہ شکست۔ لیکن لڑائی میں حالات برابر بدلتے رہتے ہیں اس لئے ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ کوئی سپہ سالار اپنے اصل دفاعی منصوبے پر پوری

طرح عمل کر سکے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دفاعی منصوبہ ایسا سادہ بنایا جائے۔ جس میں رد و بدل کرنے میں دشواری نہ ہو۔ سادہ منصوبے کو سپہ سالار بدلتے ہوئے حالات کے مقتضیات کے مطابق آسانی سے ترتیب دے سکتا ہے +

مگر منصوبے کی سادگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دفاعی منصوبے کی تیاری میں سستی سے کام لیا جائے یا چونکہ اس کے بدلنے کا امکان ہے لہذا اسے تشنۂ تکمیل ہی رہنے دیا جائے۔ بلکہ اس کے برعکس مراد یہ ہے کہ منصوبے کے ہر پہلو پر پوری احتیاط اور توجہ سے غور کر کے اور سارے مالہ و ماعلیہ کو سامنے رکھ کر دقتِ نظر سے تیار کیا جائے۔ کیونکہ لڑائی کے ہنگامے میں باریک بینی سے کام لینے کا موقعہ شاذ ہی ملتا ہے۔

۴۔ اصول اجتماع۔ اس ذیل میں سب سے پہلی بات یہ یاد رکھنی چاہیئے کہ ہجوم و اقدام کرنے والے سپہ سالار کو دفاع و تحفظ کرنے والے سالار پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دفاع کرنے والے سالار کو آخر وقت تک یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حملہ آور فوج اس کی فوج پر کب کس طرح اور کہاں حملہ کرے گی۔ لہذا دفاع کرنے والا سالار اپنی فوج کو ایک جگہ جمع نہیں کر سکتا۔ اسے مختلف مورچوں کی حفاظت کے لئے اپنی فوج کو ادھر اُدھر بٹا ہوا رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس حملہ آور سالار اپنی فوج کی بڑی سے بڑی جمعیت کو ایک جگہ جمع کر کے دشمن کے خلاف لڑا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب حملہ ہو جاتا ہے، تو دفاعی فوج کا سالار نئے حالات کے مطابق اپنی فوج کو ترتیب دے سکتا ہے۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ حملہ آور سالار کو اپنے منصوبہ کی تکمیل میں سرعت، و نیز رفتاری سے کام لینا چاہیئے۔ تاکہ بحیثیت حملہ آور اسے جو تفوّق حاصل ہے۔ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔

لہذا اصولِ اجتماع سے مراد یہ ہے کہ حملہ آور فوج کے تمام عناصر اپنے دماغی، جسمانی اور مادی مساعی کو اس طرح یک رنگی و ہم آہنگی کے ساتھ مرکوز و مجتمع کریں کہ کامل یکسوئی و یک جہتی پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب حملہ آور سالار اپنے مقصد کا اظہار پوری وضاحت کے ساتھ کر دے اور اس کے حصول کے لئے پوری یکسوئی سے اپنی طاقت کو کام میں لائے۔ تاکہ منصوبہ پر عمل درآمد کے وقت شروع سے آخر تک فوج کے کسی عنصر کے دل میں کسی قسم کا کوئی شبہ پیدا نہ ہو +

صحیح قسم کا اجتماع اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب مختلف قسم کی فوجیں مختلف قسم

کے اسلحہ و آلات کو صحیح جگہ اور صحیح وقت پر قابلیت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں صحیح اجتماع اس وقت ہوتا ہے جب پیدل فوج کے سپرد وہ کام کیا جائے جس کی وہ اہل ہے۔ گولہ انداز دستہ کو وہ کام دیا جائے جو وہ کر سکتا ہے۔ جدید قسم کی فوج میں ٹینک اور زرہ بکتر کے حصوں کے ذمہ وہ فرائض کئے جائیں جن کے لئے ان کی تشکیل و تربیت کی گئی ہے۔

۵۔ جنگ میں فوجوں اور ہتھیاروں کی طاقت ہی معرضِ امتحان میں نہیں آتی۔ اس سے زیادہ مخالف سپہ سالاروں کے عزم و استقلال، عالی دماغی اور قابلیت کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جو سالار بھی اپنے مخالف پر اپنی شخصیت کا رعب ڈال لیتے ہیں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اس کی بنا پر پیشقدمی کر سکتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدِمقابل کو مجبوراً اس کے منصوبے کے مطابق اپنے دفاعی منصوبے میں ردوبدل کرنا پڑتا ہے۔ گویا فتح و شکست کا بہت کچھ دارومدار حملہ آور سالار کی ذاتی قابلیت اور شخصیت پر ہوتا ہے کیونکہ اس کی قابلیت اور شخصیت کا اثر اس کے ماتحتوں اور دشمنوں پر یکساں ہوتا ہے۔

اس کے بعد لڑائی کے نتیجہ کا انحصار سپہ سالار کی منصوبہ سازی پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس منصوبہ میں وہ یہ طے کرتا ہے کہ جنگ کن دفاعی اصولوں کے ماتحت لڑی جائے گی۔ اور اس کے لئے کتنی فوج درکار ہوگی، اور فنِ حرب کے کون سے اصول عمل میں لائے جانے کا امکان ہے اور منصوبہ کی تکمیل کے لئے کیا کیا دفاعی تیاریاں ضروری ہیں۔ دفاعی تیاریوں کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا سپہ سالار کو پورے حزم و احتیاط سے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اسے اس حملہ کی تیاری کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی۔ یہ وقت اسے مل سکتا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوگا کہ ادھر تو تیاری ہو اور ادھر ہاتھ سے موقعہ نکل جائے۔ تاریخ میں اس قسم کی کوتاہیوں، فروگزاشتوں اور غلطیوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر دوسری جنگِ عظیم میں اطالوی فوج کا کمانڈر انگریزی فوج پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں اس درجہ مصروف رہا کہ برطانوی فوج کے کمانڈر جنرل ویول نے اس پر اچانک حملہ کر کے اس کی ساری تجویزوں اور تیاریوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اطالوی فوج کو اس طرح برباد کر دیا کہ پوری جنگ کے دوران میں اطالوی

پست ہمت رہے۔ اطالوی جنرل برطانوی جنرل ویول سے اتنا خائف تھا کہ وہ اس پر اصرار کرتا رہا کہ حریف پر حملہ کی تیاری کے لیے مزید اسلحہ اور مزید کمک کی ضرورت ہے۔ غزوات میں بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے اور اس قسم کی بہت سی دفاعی تدبیریں ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کے بڑے بڑے مسلح لشکروں کے خلاف اختیار کر کے انہیں شکستیں دیں۔ اور قلت و بے سروسامانی کے باوجود محیر العقول فتوحات حاصل کر کے امت کے لئے دفاعی حدیث چھوڑی ؂

۴۳- آنحضرتؐ صلعم کی دفاعی تیاریاں

جب آنحضرتؐ مسلمانوں کی اخلاقی و عسکری تنظیم و تربیت سے مطمئن ہو گئے تو بنفس نفیس مجاہدین کی ایک جمعیت کے ساتھ تبلیغ کے لئے مدینہ سے باہر تشریف لے گئے۔ اس مہم کا مقصد جہاں تبلیغ تھا۔ وہاں یہ معلوم کرنا بھی تھا کہ مدینہ کے گرد و نواح میں جو قبائل آباد ہیں ان میں سے کون کون مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ کن کن سے امداد کی توقع کی جا سکتی ہے اور کون کون سے غیر جانبدار رہیں گے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے آنحضرت صلعم ودان پہنچے۔ ودان مکہ کے راستہ میں ابواء سے سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں کا قبیلہ بنی حمزہ بن بکر بن عبد مناف بن کنانہ قریش کے نسب سے تھا۔ آپ نے اس سے مل کر معاہدہ کیا کہ وہ لوگ لڑائی میں غیر جانبدار رہیں گے معاہدہ کے مفصل شرائط یہ تھے۔

۱- قبیلہ قریش کو کوئی مدد نہ دے گا۔ اور لڑائی چھڑ جانے پر غیر جانبدار رہے گا۔

۲- اپنے علاقہ میں امن و امان قائم رکھے گا۔

۳- آئندہ جھگڑوں میں نہ کفار قریش کا ساتھ دے گا۔ نہ مسلمانوں کا۔

فوجی دستوں کی روانگی

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود مدینہ تشریف لے آئے اور لشکر کو دو سرداروں کے ماتحت سفید علم دے کر روانہ کیا۔

ان میں سے ایک عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب کے ماتحت بھیجا۔ جس میں صرف مہاجرین تھے۔ انصار میں سے کوئی نہ تھا اور لشکر کی تعداد ستر اسی تھی جب یہ ثنیۃ المرہ پہنچا جو جحفہ کی سمت میں واقع ہے تو احیا نامی چشمہ پر اس کا مشرکین سے مقابلہ ہوا۔ مگر لڑائی نہیں ہوئی۔ دونوں اپنا اپنا پہلو بچا کر نکل گئے۔ اس مہم کا مقصد محض قریش کے قافلوں کے دل

میں خوف پیدا کرنا تھا۔

اسی طرح دوسرا دستہ جس کی تعداد بیس یا ئیس تھی سعد بن ابی وقاص کی سیادت میں روانہ کیا۔ اس کا علمبردار مقداد بن عمرو تھا اور علم کا رنگ سفید تھا۔ اس دستہ میں بھی سب مہاجرین ہی شامل تھے۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا تھا کہ وہ خرار تک پا پیادہ جائے۔ دن کے وقت چھپا رہے، رات کو سفر کرے اور اس طرح وہاں کے حالات معلوم کر کے مدینہ واپس آجائے۔ اس دستہ نے یہ سفر پانچ راتوں میں ختم کیا۔ واپسی پر اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کیا کہ خرار میں اہلِ قریش کا ایک قافلہ دستہ کے پہنچنے سے ایک روز پہلے مکہ روانہ ہو چکا تھا۔

مہاجرین کا ایک اور دستہ جس میں تقریباً تیس شتر سوار شامل تھے حمزہ بن عبدالمطلب کے ماتحت سیف البحر کی طرف روانہ فرمایا۔ اس کا علم بھی سفید تھا۔ اس کو ہدایت کی گئی کہ عیص کی سمت سے جائے اور جہینہ کے علاقہ کو دیکھ کر وہاں کے حالات معلوم کرے۔ جب یہ دستہ ساحل کے برابر جا رہا تھا تو اس کا سامنا ابو جہل بن ہشام (مکہ) کے دستہ سے ہوا مگر لڑائی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ مجدی بن عمرو الجہنی نے فریقین میں مصالحت کرادی اور دونوں دستے واپس چلے گئے۔ مشرکین کے دستے کی تعداد بھی تقریباً تیس یا چالیس تھی۔

آنحضرتؐ کی روانگی

اس کے بعد آنحضرت صلعم مہاجرین و انصار کا ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ کوہ رضوی سے ہوتے ہوئے ابواط پہنچے۔ اس سفر میں تقریباً ایک مہینہ صرف ہوا۔ مگر بغیر کسی جنگ و تصادم کے مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ اس نقل و حرکت کا مقصد قریش کے قافلوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنا تھا۔ کیونکہ اسی زمانہ میں ایک قافلہ جس کا سردار امیہ بن خلف تھا اور جس کے ساتھ قریش کے ایک سو سوار اور دو ہزار پانچ سو اونٹ تھے۔ ادھر سے گزرنے والا تھا۔ اس موقعہ پر مجاہدین کے علمبردار سعدؓ بن ابی وقاص تھے اور آنحضرت صلعم نے مدینہ میں سعدؓ بن معاذ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔

مدینہ میں چند روز قیام فرما کر آپ پھر ایک لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے اور بنی دینار بن النجار کی سرنگ سے گزر کر فیفا الخبار کے پہاڑ پر ہوتے ہوئے ذات الساق پر جا پہنچے۔

اور وہاں ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا۔ اس جگہ پانی کا ایک چشمہ تھا۔ جس کا نام عشیرب تھا (اس درخت کی جگہ اب ایک مسجد ہے جو اس کی یاد دلاتی ہے کہ آنحضرتؐ یہاں قیام فرما ہوئے تھے اور اس چشمے سے پانی پیا تھا) یہاں مختصر سا قیام کر کے آنحضرتؐ پھر روانہ ہوئے اور خلائق کو بائیں سمت چھوڑے ہوئے مشعبہ عبداللہ نام کی گھاٹی کا راستہ اختیار کیا۔ یہ گھاٹی اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ یہاں سے آپ بائیں جانب سے وادی یلیل میں داخل ہوئے اور آگے بڑھ کر وادی الضبوعہ کے مقام انصال پر ایک کنویں کے پاس قیام فرمایا۔ پھر یہاں سے روانہ ہو کر فرش ملل تشریف لے گئے۔ اس طرح اپنی فوج کو ان دشوار اور پر صعوبت راستوں سے گزارتے رہے۔ جنہیں اہل قافلہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ گویا یہ مجاہدین کی نوجی نقل و حرکت کی مشق تھی۔ فرش ملل سے جب صخیرات الیمام کے قریب آئے تو قافلہ والوں کا عام راستہ آگیا۔ اب آپؐ نے اس پر چلنا شروع کیا اور بطن ینبع کے مقام ذی العشیرہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ یہاں آپ نے بنی مدلج اور ان کے حلیف بنی حمزہ سے غیر جانبداری کا معاہدہ کیا اور چند روز قیام کر کے مدینہ کو مراجعت فرمائی۔

مدینہ آئے ہوئے دس روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک شخص کرز بن جابر الفہری اپنے گروہ کے ساتھ چھپ کر آیا اور مدینہ کے باہر اہلِ مدینہ کے جو مویشی چر رہے تھے انہیں پکڑ کر لے گیا۔ آپ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے وادی سفوان تک اس کا تعاقب کیا۔ مگر وہ بہت دور نکل چکا تھا۔ اس لئے آپؐ مدینہ تشریف لے آئے۔ سفوان بدر کے علاقہ میں ہے۔ بعض مورخین نے اس واقعہ کو بدر کا پہلا غزوہ قرار دیا ہے۔

نخلہ کی مہم

رجب کے مہینہ میں آنحضرتؐ نے عبداللہؓ بن جحش کو چند مسلمانوں کے ساتھ نخلہ روانہ کیا۔ نخلہ مکہ سے ایک منزل پر سرسبز و شاداب مقام ہے۔ عبداللہ بن جحش کے دستے میں آٹھ مختلف خاندانوں کے مہاجر شامل تھے۔ روانگی کے وقت آنحضرت صلعم نے سالار دستہ کو ایک خط دے کر حکم دیا کہ بطن پہنچنے سے پہلے (یعنی جب تک دو دن کی مسافت طے نہ ہو جائے)، اسے کھول کر نہ پڑھا جائے۔ اس کے بعد پڑھ کر جو کچھ لکھا ہو اس پر عمل کرنا۔ جب یہ خط بطن

میں کھول کر پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا کہ یہ دستہ سیدھا نخلہ جائے اور حجش اہل قریش کے حالات معلوم کرکے مدینہ میں اطلاع پہنچائیں تاکہ آنحضرت کو قریش کی نقل وحرکت اور دوسرے منصوبوں کا علم ہو سکے۔ نیز یہ کہ اگر مکہ کے قافلے کا کوئی شخص اپنی خوشی سے تمہارے ساتھ آنا چاہے تو اسے لے آنا کسی پر جبر نہ کرنا۔

حجش نے اپنے ساتھیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم سنا کر پوچھا کہ کون ہے جو میرے ساتھ جانا چاہتا ہے اور کون واپسی کا ارادہ رکھتا ہے۔ سب نے آگے بڑھنے کا عزم ظاہر کیا جب یہ لوگ بالائے فرع کے قریب پہنچے تو سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ گم ہو گیا اور یہ اس کی تلاش میں نکلے۔ عبداللہ بن حجش نے ان کا انتظار کیا۔ مگر یہ واپس نہ آئے تو دستہ آگے بڑھا اور نخلہ پہنچ گیا یہاں اتفاق سے نہیں قریش کا ایک قافلہ نظر پڑ گیا جو طائف کے میوے اونٹوں پر لاد کر لا رہا تھا۔ قافلہ کو دیکھتے ہی انہیں کرز بن جابر کے مویشی چرانے کا واقعہ یاد آ گیا۔ رجب کا آخری دن تھا۔ انہوں نے طے کیا کہ ماہِ حرام شروع ہونے سے پہلے اسی رات کو اس پر حملہ کرکے مال واسباب لوٹ لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ واقد بن عبداللہ نے قافلہ کے سردار عمر بن الخضرمی کو تیر کا نشانہ بنا دیا اور دستے والے اس کے دو بہادر رفیقوں عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کرکے مدینہ لے آئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے آنے کی خبر سن کر انہیں وہیں روک دیا مالِ غنیمت تقسیم نہیں ہونے دیا، اور جب مکہ والے گرفتاروں کو چھڑانے کے لئے فدیہ لے کر پہنچے تو انہیں بھی روک دیا اور عبداللہ بن حجش اور ان کے ساتھیوں کو تنبیہ کی اور فرمایا تمہیں قتال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس عرصہ میں سعدؓ بن ابی وقاص اور عبداللہ بن غزوان اونٹ کی تلاش میں بحران پہنچ گئے۔ وہاں سے جب مدینہ واپس آئے تو اس کے بعد آنحضرتؐ نے اپنے پاس سے قریشی قافلہ کے سردار عمرو بن الخضرمی کا خون بہا ادا کیا اور دونوں اسیروں کو رہا کر دیا۔

اس مہم سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مجاہدین کس درجہ فرمانبردار، تربیت یافتہ اور دلیر ہو گئے تھے۔ اور جوشِ جہاد کس طرح ان کے سینوں میں موجزن تھا۔

فوجی مہیں روانہ کرنے اور آنحضرتؐ کے خود اس قسم کی مہموں پر تشریف لے جانے

کے بعد چند واقعات اس لئے بیان کئے گئے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنی فوج کی تنظیم و تربیت کن اصولوں پر کی اور یہ اصول ساڑھے تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی بالکل نئے اور انوکھے ہیں یا نہیں۔ فنِ سپہ گری اور جدید اصول حرب و ضرب کے ماہرین و ناقدین کے پاس اس سے زیادہ کیا ہے۔ اور جن اصولوں اور حربی تدبیروں کو جدید یا جدیدیت کے سانچہ میں ڈھلا ہوا سمجھا جاتا ہے وہ فی الاصل جدیدیت کا کوئی شائبہ یا تجدید کا کوئی پہلو بھی اپنے اندر رکھتی ہیں؟ اس باب کے پہلے اور دوسرے حصہ میں مغربی ماہرینِ فنِ جنگ و سیاست دفاع کے افکار و آرا کے طویل اقتباسات درج کئے جا چکے ہیں۔ انہیں سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ آنحضرت صلعم کی عسکری تنظیم و تربیت اور آپ کی مہارت فنِ حرب اصول و عمل اور فکر و نظر کے کس جزو میں کسی پہلو سے بھی تشنہ تکمیل معلوم ہوتی ہے۔ جب آنحضرتؐ کے اصول اٹل ہیں۔ ساڑھے تیرہ سو سال سے زیادہ طویل مدت کے تجربات و مشاہدات ان میں سرِ مو اضافہ نہیں کر سکے تو کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دفاعی حدیث کو پسِ پشت ڈال کر ان لوگوں کو دفاعی سیاست کے آسمان کا مہر و ماہ سمجھ لیا جائے جو ناکام و نامراد ہو کر مرے اور جن کا شخصی کردار پاسنگ بھر بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس معاملہ میں آنحضرتؐ کی پوری اُمت کا ایک ہی حال ہے۔ اس میں کہہ مہ، جاہل و عالم اور بے اختیار و ذی اختیار سب ایک ہی زمرہ میں ہیں۔ انہیں نپولین کا نام آتا ہے، ہیبول، ہنڈنبرگ، کلاڈٹیز، آئی زن ہاور اور اسی قبیل کے بیسیوں زندہ و مردہ مغربیوں کے نام ازبر ہیں۔ وہ ان کے کارناموں ——— فرضی و واقعی ——— سے واقف ہیں لیکن آنحضرت صلعم کے کارناموں، آپؐ کے اصولوں، آپؐ کی مہارتِ تنظیم و تربیت اور آپ کی فوق العادہ و معرکۃ الآراء عسکری قیادت سے قطعاً نابلد، اور نہ صرف نابلد بلکہ ان کے حاشیۂ خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کا جو نقشہ آتا ہے وہ اپنے اندر حضرت کی عسکری قابلیت اور دفاعی سیاست کا کوئی ہلکا سا رنگ بھی نہیں رکھتا۔ دفاعی تنظیم و سیاست اور حرب و ضرب کے مغربی ماہرین کے علم و تجربہ کی اہمیت مسلّم، مگر آنحضرتؐ کی دفاعی حدیث اولین اہمیت کی چیز ہونی چاہیئے۔ آپ کی گرامی شخصیت کے اس اہم ترین پہلو کو دوسرے پہلوؤں سے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ جب مدنی زندگی کی حیرت انگیز کامیابیوں اور اسلام و اہلِ اسلام کے عروج و اقبال کی ساری تابناکیوں کی وجہ موجبہ

دفاعی حدیث ہے تو اس کو یکسر فراموش کر کے ملّی فلاح و صلاح کے خواب کی تعبیر کیسے ہو سکتی ہے اور مومن و مسلم کہلانے والے قوموں کی امامت پر کس طرح فائز کئے جا سکتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

بہر نوع اب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان دفاعی اصولوں پر پھر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے جو آپ نے ہجرت کے پہلے دو سال میں اختیار فرمائے اور امت کے لیے بطور دفاعی حدیث چھوڑے +

۱۔ شخصی اخلاق و کردار کے وہ تمام اوصاف و محاسن جو ایک سپہ سالار میں موجود ہونا ضروری ہیں اور جنہیں زمانۂ جدید کے دفاعی ماہرین اس کی شخصیت کا فکری منتہائے کمال سمجھتے ہیں، آنحضرت صلعم کی ذات میں بہ تمام و کمال جمع تھے۔

۲۔ آنحضرتؐ نے قلیل ترین مدّت میں مسلمانوں کے اندر اعلیٰ درجہ کا لشکری ضبط و نظم بہترین حربی استعداد، اور عزم و حوصلہ، بے نفسی و خود اعتمادی، جفاکشی و ایثار پیشگی، اطاعت شعاری و فرمانبرداری اور اخوت و مساوات کی بے مثال خوبیاں پیدا کر کے منظم و مرتب فوج بنا دیا تھا +

۳۔ آنحضرتؐ نے آنے والے حالات کا اندازہ کر کے مدینہ سے ینبع اور ینبع سے مکّہ تک فوجی نقل و حرکت کر کے مجاہدین کو ہر نشیب و فراز کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ اس کے دشوار گزار راستوں، پگڈنڈیوں، چشموں اور غاروں وغیرہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور جب لڑائی کا وقت آ جائے تو نقل و حرکت میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو +

فیلڈ مارشل فان ہنڈنبرگ (جرمنی) اور جنرل شرمن (امریکہ) کے کارنامے زبان زدِ خلائق ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنی فوجی ملازمت کے دوران میں ان علاقوں کے چپہ چپہ کو اپنے ذاتی خرچ سے بغور دیکھا۔ جن میں آگے چل کر انہیں لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مثلاً ہنڈنبرگ نے ٹینبرگ کے علاقہ کی دلدلوں اور دلدلوں کے درمیانی راستوں کا تفصیلی مشاہدہ کیا۔ پھر جب روسیوں سے مقابلہ ہوا تو روسی فوج کو وہاں لا کر ایسا پھانسا کہ ساری فوج وہیں ختم ہو گئی۔ اسی طرح جنرل شرمن نے حریف کے میدانِ جنگ کو اچھی طرح جاننے کی بنا پر قلیل التعداد فوج سے اس قدر ہراساں کیا کہ دشمن نے ہتھیار ڈال دیئے +

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فوجی نقل وحرکت کے یہ حالات ہم تک بالاجمال پہنچے ہیں۔ کاش یہ تفصیل سے معلوم ہوتے اور مورخین نے ان کی تاریخی اہمیت کا اندازہ کیا ہوتا!

۴۔ آنحضرت صلعم نے مجاہدین کو اسلحہ کے استعمال میں ماہر بنایا۔ انہیں بلا تکان رات ہو یا دن منزل مقصود پر پہنچنے کی عادت ڈالی اور ان میں فوجی راز کو راز رکھنے کی قابلیت پیدا کی قابلیت

۵۔ فوجوں کو علم عطا فرما کر آپ نے سارے عرب میں اپنی دفاعی فضیلت کا اعلان کیا۔ سیاسی طور پر یہ منافقین پر بہت کاری ضرب تھی۔ فوجوں میں صف بندی، اور مہمات پر روانگی سے قبل ان کا معائنہ آپ کی بہت اہم کارروائیاں تھیں۔ جن سے سیاسی و فوجی نظم و استحکام میں بہت زیادہ مدد ملی +

۶۔ مکہ میں نامہ نگار متعین کیا جو خفیہ طور پر آپ کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھتا۔ ایک طرف آپ فوجی دستوں اور جاسوسوں کے ذریعہ حالات معلوم فرماتے، دوسری طرف خبر رسانی کا یہ انتظام رکھتے +

۷۔ اس کے ساتھ اپنے شہری باشندوں اور فوجی آدمیوں کو اپنی نقل وحرکت کے راز رکھنے کا پابند بنایا۔ فوجی دستوں کو قبل از وقت کبھی یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کتنے عرصہ کے لئے اور کہاں جا رہے ہیں +

۸۔ فوج کی تکمیل و تربیت کے ساتھ آپ نے سیاسی پہلوؤں کی تکمیل کا بھی پورا بندوبست فرمایا۔ مدینہ کے شہریوں کو منظم کیا۔ جو قبائل ایک دوسرے کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے اور مذہبی اختلافات و ذاتی بغض و عداوت کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے ان سب کو مجتمع کیا اور نہ صرف زمانۂ امن کے لئے باہمی اتحاد کا رشتہ قائم کیا بلکہ جنگ کے زمانہ کے لئے بھی عہد و پیمان کر لئے۔ تمدن و معاشرت کا معیار بدلا۔ حقوق و فرائض کا ایسا ضابطہ مرتب فرمایا کہ اتحاد و ائتلاف کا دور دورہ ہو گیا۔ امن و اعتماد کی فضا سے تجارت نے فروغ پایا۔ معیشت کا نظام بلند ہوا۔ اندرونی اختلافات دور کرنے کے بعد آپ نے خارجی سیاست پر توجہ فرمائی۔ تبلیغ کے لئے پہلے گردونواح کے علاقہ میں، پھر حجاز کے دور افتادہ قبائل کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کو اس خوبی سے اپنے مشن کے مقاصد سمجھائے کہ وہ ہمدرد بن گئے اور اگر مسلمان نہ ہوئے تو غیر جانبداری اختیار کر لی۔ تبلیغ کے راستے ہموار ہو

گئے۔ آپ کے اخلاق حسنہ کا ان پر بہت زیادہ اثر ہوا۔

مدینہ کے اندر اتنا عمدہ نظام قائم ہو گیا کہ آپ کی اور فوج کی غیر موجودگی میں بھی کامل امن وامان رہتا اور سب لوگ آپؐ کے نائب کے احکام کی اطاعت کرتے۔

۹۔ فوجی اور شہری انتظامات کی تکمیل کے بعد آپؐ نے خارجی سیاست کا حربہ استعمال کیا۔ اور اہل مکہ کی تجارت کو ختم کرنے کے ذرائع عمل میں لائے۔ ابتدا میں قریش نے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے ساحل کے متوازی راستے اختیار کئے۔ مگر ان پر چل کر ان کے منافع کی مقدار بہت کم ہو گئی اور سامان خوراک بڑی دقت سے اور گراں قیمت پر ملنے لگا۔ اس لئے انہوں نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح آنحضرتؐ نے انہیں ایسے مقامات پر لڑنے کے لئے آمادہ کیا جو فن حرب و سپہ گری کے لحاظ سے مشرکین کی عسکری حرکت کے لئے سازگار نہ تھے۔ اور یہی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر آپؐ نے کفار و مشرکین کے کئی کئی گنے بڑے لشکروں کو شکست فاش دی۔ مشرکین کو جنگ میں سبقت بھی کرنی پڑی اور ہر دفعہ شکست کھا کر ہتھیار بھی ڈالنے پڑے۔

ان اوراق میں یہ اصول و طریق کار اختصار سے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل آپ کو غزوات کے ابواب میں ملے گی۔

غزوات

غزوۂ بدر

بدر اور اس کا نواح:-

حجاز کے طبعی حالات کے تحت میں لکھا جا چکا ہے کہ اس کے مغربی علاقہ میں پہاڑیوں کی وجہ سے آمد و رفت کے راستے بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ وادیوں یعنی برساتی نالوں کے نشیب میں ہیں اور اکثر انہی نشیبوں کو قافلے والے استعمال کرتے ہیں ساحل کے برابر والے راستے ریت کی کثرت اور پانی کی قلت کی وجہ سے بہت دشوار گزار ہیں۔ تمام راستوں میں سب سے اچھا راستہ وہ ہے جو دومۃ الجندل سے براہ مدینہ مکہ کو جاتا ہے اس راستہ کی وادیاں کھلی اور کشادہ ہیں، اور "قافلوں" کے قیام کے مقامات پر پانی کی کمی نہیں۔ ترکوں نے اپنے عہد اقتدار میں عہد نبوی کے راستے کے بڑے حصے پر آمد و رفت ترک کر دی تھی۔ حجاج مصر کی کثیر تعداد بحری سفر کی سہولتوں کی وجہ سے جہازوں سے آتی تھی ساحل پر جہاں جہاں بندرگاہیں بن سکیں۔ ان کے جہاز وہاں آکر لنگر انداز ہوتے اور وہاں سے حجاج وادیوں میں سے ہوتے ہوئے مدینہ پہنچتے یا سیدھے مکہ معظمہ کا راستہ اختیار کرتے۔ ترکوں نے اپنے زمانہ میں "طریق سلطانیہ" کے نام سے ایک علیحدہ راستہ بنایا تھا جس کے کچھ حصہ پر ریلوے لائن چلائی گئی تھی۔ آج کل اس لائن کو ترقی دینے کی کوشش کی جا رہی ہے +

بدر اور مدینہ کے درمیان کہیں کہیں بڑے نخلستان ہیں۔ لہٰذا یہ راستہ خاصہ سر سبز ہے بدر اور حمرا کے درمیان اچھا جنگل ہے۔ جہاں بعض مقامات پر میٹھا پانی بھی ملتا ہے۔ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کی چراگاہیں ہیں۔ بدر کے قریب جہاں غزوہ ہوا۔ وہاں کہیں کہیں گھاٹیاں ہیں اور

بدر نمبر ۲

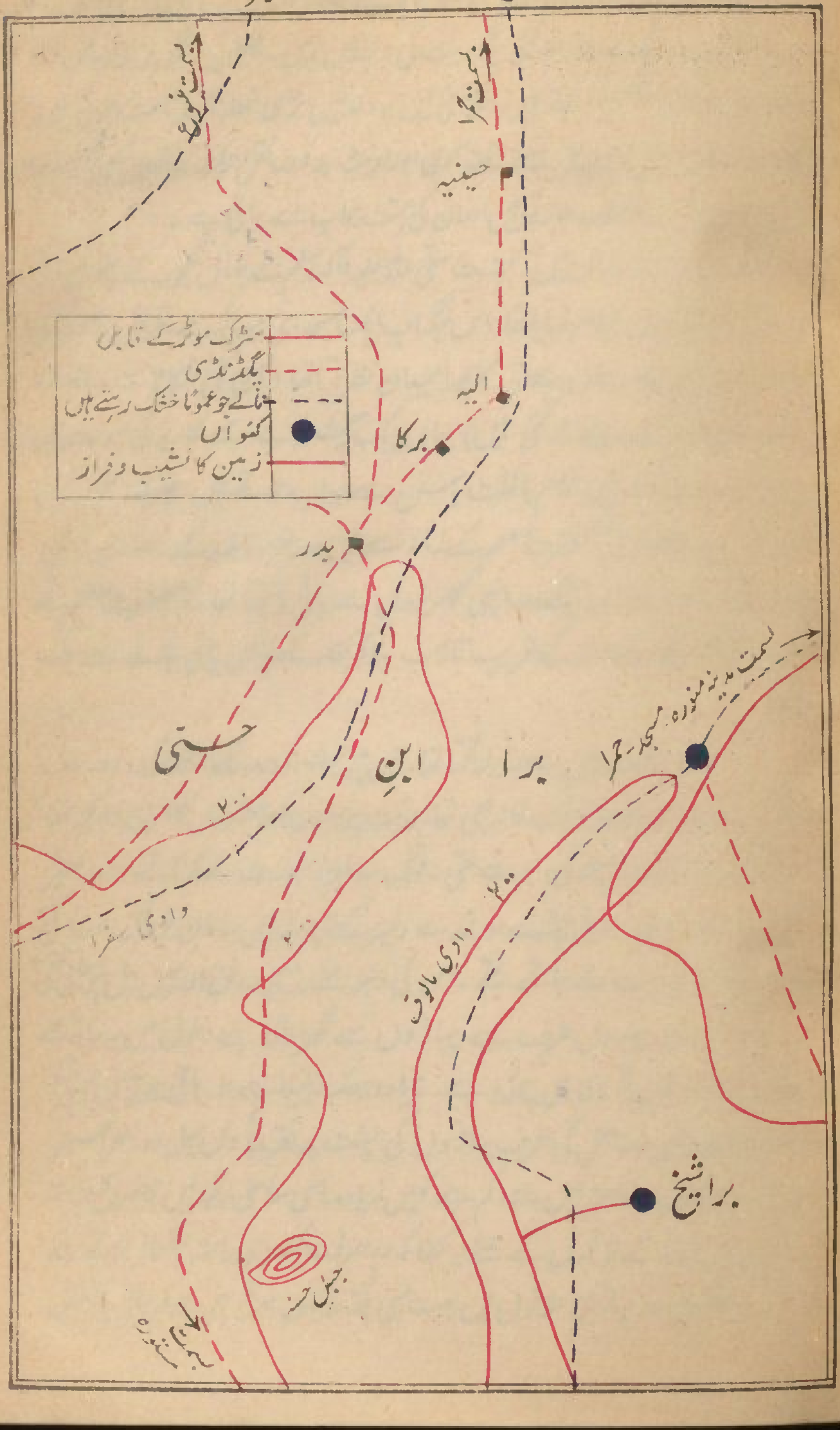
سڑک موٹر کے قابل
پگڈنڈی
نالے جو عموماً خشک رہتے ہیں
کنواں
زمین کا نشیب و فراز
حسینیہ
الیہ
برکا
بدر
براشیخ

ان کے نشیب میں جہاں کاریزوں سے پانی مہیا ہوتا ہے متعدد نخلستان ہیں لیکن اس پہاڑی دامن کی ریت نہایت باریک ہے اور کئی جگہ ریت کی دلدلیں ہیں۔ جنھیں انگریزی میں (Qioksand) "کُکسینڈ" کہتے ہیں۔ لڑائی میں یہ دلدلیں بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہیں گھوڑے ان میں بالکل نہیں چل سکتے البتہ آدمی اور اونٹ بدقت نقل و حرکت کر سکتے ہیں لیکن اگر نصف میل بھی چلنا پڑتا ہے تو تھک جاتے ہیں اوسان کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔

جنگِ بدر کے دوران میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں کھجور کے پتوّں کی بنی ہوئی جھونپڑی میں قیام فرمایا تھا۔ اس جگہ اب ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ عریش چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ جہاں سے بدر کا پورا میدان نظر آتا تھا (آج کل مکانات و باغات کی وجہ سے کچھ رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں) یہاں ایک چشمہ ہے۔ جسے کاریز کی صورت میں میدان تک لے گئے ہیں۔ تمام باغات اس سے سیراب ہوتے ہیں۔ پھر اور کاریزیں نکالی گئی ہیں۔ یہ کاریزیں آنحضرت صلعم کے زمانہ سے ہیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بھی یہاں کے نخلستانوں کو اسی چشمے اور انہی کاریزوں سے پانی پہنچتا تھا۔ آنحضرت صلعم نے عریش پہنچ کر چشمے کے منہ کے قریب تالاب بنا کر کفار کے پاس پانی جانے سے روک دیا تھا۔

اسلام سے پہلے بدر میں سالانہ میلہ لگتا تھا۔ جس میں شرکت کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ یہاں ایک بڑا بت خانہ بھی تھا۔ جو بت پرستوں اور مشرکوں کا مرجع و مرکز تھا، مگر اس کی زیادہ اہمیت میلے کی وجہ سے تھی۔ لوگ سامانِ تجارت لے کر آتے، اور بھیڑ بکری، اونٹ، اون، اونی کپڑے اور نمدے وغیرہ کے تبادلہ میں سامانِ خوراک اور زندگی کی دوسری ضروریات لے جاتے تھے۔ اس کی وجہ سے بڑی رونق اور چہل پہل ہو جاتی تھی۔

بدر کا میدان چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ طول میں یہ ساڑھے پانچ میل لمبا اور تقریباً اتنا ہی چوڑا ہے۔ زیادہ حصّہ ریتیلا ہے اور باقی حصّے میں ریتیلے پتھر کی چٹانیں ہیں۔ ساحل کی طرف پہاڑوں کی پشت پر تقریباً دس میل دور بحر احمر موجزن ہے۔ کہیں یہ فاصلہ اس سے کم ہے کہیں زیادہ۔ اسی ساحلی رقبہ میں قافلوں کا راستہ ہے۔ لیکن اس زمانہ کے قافلوں کے لئے یہ کہنا کہ وہ صرف ایک ہی راستہ استعمال کرتے تھے صحیح نہیں۔ جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں بہت سی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں جو کم و بیش استعمال

ہوتی ہیں۔ پھر صحرائی راستے بادِ خمیس کی وجہ سے اکثر بدلتے رہتے ہیں۔ بادِ خمیس ریت کے تودوں کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ لہٰذا راستے بھی تھوڑے بہت برابر بدلتے رہتے ہیں۔ تاہم ان کا رُخ ایک ہی سا رہتا ہے اسی وجہ سے نقشہ میں جو صحرائی راستے اور پگڈنڈیاں دکھائی جاتی ہیں وہ زمین پر اکثر مختلف ملتی ہیں۔ چونکہ پگڈنڈیاں زیادہ ہوتی ہیں اس لئے اونٹوں کے قافلے ان میں سے جن کو چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کا بالکل روک دینا حجاز جیسے ملک میں بہت دشوار ہے البتہ عام استعمال کے بڑے راستوں کو بند کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے یہی کیا یعنی قریش پر نقل و حمل کے بڑے راستے بند کر دیئے۔

چونکہ حالات کا پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ چکا تھا اور قریش کی تجارت خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ اس لئے تصادم کا امکان قوی ہو گیا تھا۔ ابھی دو سال نہ ہوئے تھے۔ کہ قریش غالب اور زبردست تھے۔ انہوں نے رسول اکرمؐ اور اہل ایمان کو مصائب و شدائد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آنحضرتؐ کے مکان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کی وجہ سے مکّہ کے تمام مسلمانوں کی زندگی عذاب میں تھی۔ انہوں نے مٹھی بھر مہاجرین کا حبشہ تک تعاقب کیا تھا۔ دن اور رات کی کوئی ساعت ایسی نہ گزرتی تھی۔ جس میں مسلمانوں کی تعذیب کے نت نئے طریقے اختیار نہ کئے جاتے تھے اور انہی حالات کی وجہ سے آنحضرتؐ کو مجبوراً ہجرت کے منصوبہ پر عمل کرنا پڑا تھا۔ مجبوراً اس لئے لکھا جا رہا ہے کہ واقعات کو حالات کی رفتار سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس منصوبہ کو معرضِ التوا میں ڈالے رکھا۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہ مل گئی۔ اس وقت تک اس پر عمل نہیں فرمایا اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔ بلکہ تلوار انتہائی مجبوری کی حالت میں نکالی گئی) کہاں اب یہ حالت ہو گئی کہ قریش تجارت کے لئے مدینہ کا راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔ چھپ کر دور دراز کے راستوں سے جاتے ہیں۔ یا آنحضرتؐ سے سفر کی اجازت لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کاروبار تجارت، نقل و حرکت کی آزادی اور اقتصادی مرفہ الحالی سب خطرہ میں ہیں اور کوئی پیش نہیں جاتی۔ منافع کم ہو گیا۔ خسارہ کی صورتیں بڑھ گئیں۔ سفر طویل ہو گیا۔ قافلوں کے لٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ سامانِ خوراک کی فراہمی دشوار ہو گئی۔ قریش کا وقار اور ان کی ماموریت ختم ہو گئی اور یہ سب ان کی وجہ سے ہوا جو کل تک ان کے موردِ عتاب تھے۔ لہٰذا جنگ و تصادم کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ قریش کو

اندیشہ تھا کہ اگر جنگ نہ کی گئی اور اس بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام نہ ہوئی تو کہیں رہی سہی آزادی بھی سلب نہ ہو جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتقام لینے پر نہ اتر آئیں۔ اثر و اقتدار کا دائرہ مدینہ سے ینبع اور نخلہ تک وسیع ہو چکا ہے۔ آس پاس کے تمام قبائل حلیف بن گئے ہیں۔ اگر اور مہلت ملی تو پانی سر سے اونچا ہو جائے گا، کفر و شرک کو کوئی پناہ نہ ملے گی۔ لہذا بلا تاخیر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ قریش کے پاس مال و دولت کی کمی نہیں، لڑنے والے بہادروں کی کمی نہیں، سامانِ حرب و ضرب کی کمی نہیں، حوصلہ و ہمت کی کمی نہیں، کفر و شرک کے مددگاروں کی کمی نہیں، پھر مسلمانوں کو مزید طاقت حاصل کرنے کا موقع کیوں دیا جائے اور اپنی تباہی کا سامان دیدہ و دانستہ کیوں ہونے دیا جائے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کے ان جذبات اور ان کی ان تیاریوں کا خوب علم تھا۔ مگر مصلحتاً یا حزم و احتیاط کی بناء پر اپنے فوجی دستوں کو لڑائی میں پیش قدمی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ آپؐ نے جتنی مہمیں روانہ کیں یا جن فوجی دستوں کے ساتھ بہ نفسِ نفیس خود تشریف لے گئے۔ ان کا مقصد وحید دفاعی منصوبہ کی تکمیل تھا۔ آنحضرت صلعم جنگ و تصادم میں پہل نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ عسکری تربیت اور جنگی تیاری کا کوئی پہلو تشنۂ تکمیل بھی رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

اس حکمتِ عملی کا ایک سیاسی پہلو غالباً یہ بھی تھا کہ مدینہ تشریف لانے سے پہلے اور اس کے بعد آپؐ نے مدینہ کے قبائل سے جو معاہدے کئے تھے۔ ان کی رو سے کفار کے حملہ کی صورت میں آپ پر ان کی حفاظت فرض تھی۔ لہذا اخلاقی طور پر آپؐ ان کو مشرکین پر حملہ کرنے کا حکم نہیں دے سکتے تھے۔ اور غالباً اسی وجہ سے آپؐ نے ابتداء میں جو فوجی مہمیں روانہ کیں۔ ان میں صرف مہاجرین کو شامل کیا۔ بعد کو جب مہاجرین و انصار کی ملی ہوئی جمعیتیں مدینہ سے باہر گئیں تو ان کی سالاری آپؐ نے خود فرمائی۔ مگر انصار کی شمولیت کی یہ کمی جنگِ بدر سے پہلے پوری ہو گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے آنحضرتؐ سے خود جہاد میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی۔ یہ اجازت طلبی اور آنحضرتؐ کی منظوری سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھی۔

جنگِ بدر کے اسباب

جنگِ بدر کے عمومی اسباب تمام تر معاشی و سیاسی تھے۔ ان کی وضاحت پچھلے

اوراق میں کی جا چکی ہے لیکن فوری اور خصوصی اسباب یہ تھے :۔

۱۔ عبداللہ بن جحش کے دستہ نے قریش کے تجارتی قافلہ کو نخلہ میں لوٹ کر اس کے سالار ابن الحضرمی کو ہلاک کر دیا تھا۔ اہل مکہ اس پر بہت برہم ہوئے۔ کیونکہ اس سے ان کے وقار کو سخت دھکا لگا۔ مدینہ والے مکہ کے قریب آ کر ان کے سالارِ قافلہ کو بھی ہلاک کر گئے اور مالِ غنیمت سمیت دو قیدیوں کو بھی لے کر واپس چلے گئے۔

۲۔ اس واقعہ کی خبر مکہ والوں کو ہر جگہ پہنچ گئی۔ ابوسفیان بن حرب اس وقت شام سے بہت سا سامان لے کر مکہ کو واپس آ رہا تھا۔ اس کے قافلہ میں تقریباً ایک ہزار اونٹ تھے۔ جن پر سامانِ تجارت کے علاوہ نقد روپیہ بھی لدا ہوا تھا۔ بعض مورخوں نے جن میں ظلپ کے ہتی بھی شامل ہے۔ قافلہ کے سامان کی مجموعی مالیت بیس ہزار پونڈ بتائی ہے۔ نخلہ کے حملہ کی خبر سنتے ہی ابوسفیان نے عام راستہ چھوڑ کر ساحل کا راستہ اختیار کیا اور اس کے ساتھ ضمضم بن عمرو کو غازہ (شام) سے مکہ روانہ کر کے اہل مکہ سے مدد طلب کی اور یہ کہلا بھیجا کہ وہ اس کو بدر کے قریب مل جائیں ورنہ محمدؐ ان کا مال لوٹ لیں گے وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ سے روانہ ہو گئے ہیں۔ حضرت صلعم کو کرز بن جابر کے تعاقب سے واپس آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ شام سے اس قافلے کے واپس آنے کی اطلاع ملی۔ اس کے ساتھ یہ بھی خبر پہنچی کہ ابوجہل ساڑھے نو سو جنگ جو اہل قریش اور ایک سو گھوڑوں کے ساتھ مکے سے مدینہ روانہ ہو گیا ہے۔ مشرکین کی چڑھائی کا حال سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کی کہ اے خدائے پاک اگر یہ مختصر سا گروہ ہلاک ہو گیا تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا اس کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ قیس بن ابی صعصعہ کو جو بنی نازن بن النجار سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے ساقہ پر مقرر کیا اور ۱۲ رمضان المبارک کو تین سو تیرہ آدمیوں کا لشکر لے کر جن میں ۸۲ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ بدر کی طرف روانہ ہوئے۔ بسبس بن عمرو الجہنی بنی ساعدہ کے حلیف اور عدی بن ابی الزغبا الجہنی بنی نجار کے حلیف کو صفرا کے قرب و جوار سے فوراً بدر بھیجا تاکہ آپ کو قریش کے قافلہ کے متعلق اطلاع دیں۔ صفرا ایک گاؤں ہے جو مسلح اور صمزی نام کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اس زمانہ میں یہاں بنو النار اور بنو حراق بن غفار دو خاندان آباد تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ آنحضرت کا کوئی عہدنامہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے

آپؐ نے اس گاؤں کے پاس سے گذرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس راستہ کو ترک کر کے صفرا کو اپنے بائیں جانب چھوڑا اور ذفران نامی وادی میں سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ ابھی اس کا ایک حصہ باقی تھا کہ رات بسر کرنے کے لئے قیام فرمایا۔ یہاں پہنچکر آپؐ کو خبر ملی کہ اہل قریش ابوسفیان کے قافلہ کی مدافعت کے لئے قریب آ گئے ہیں تو آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ انصار کے ارادوں کا حال واضح طور پر معلوم ہو جائے۔ کیونکہ آپؐ کے لشکر میں انہی کی اکثریت ی اور آپؐ اس بات کا اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ ایسے وقت میں جبکہ مدینہ پر دشمن کے حملہ کا اندیشہ ہے انصار امداد و حمایت کو ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ سے مشورہ کر چکے تو سعد بن معاذ نے مشورہ کی اہمیت کو محسوس کر کے انصار کی طرف سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؐ کا منشاء ہماری رائے معلوم کرنا ہے۔ سو وہ یہ ہے ۔

ہم آپ پر ایمان لائے ہیں ہم نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی ہے اور ہم نے پختہ دل سے آپؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لیا ہے۔ لہذا آپ اپنے ارادہ پر عمل فرمائیے۔ ہم اس ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ جس نے آپ کو نبی برحق بنایا ہے۔ کہ اگر آپ ہمیں سمندر میں کود جانے کا حکم دیں گے تو ہم سب بخوشی اس میں کود جائیں گے۔ ہم لڑائی میں ثابت قدم رہیں گے۔ ہمارا قدم ہرگز پیچھے نہیں ہٹے گا۔ ہماری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہم کوئی ایسا کام کر سکیں جس سے ہمیں آپ کی خوشنودی حاصل ہو جائے ۔"

مہاجرین کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق نے وفاداری و جان نثاری کا یقین دلایا۔

حضرت معاذؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی تقریریں سننے کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کہ اللہ کی مدد کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرو۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی ۔"

ذفران سے روانہ ہو کر آپؐ نے اصافر نامی گھاٹیوں کی راہ اختیار کی، وہاں دبہ نامی ایک قصبہ میں اُترے۔ پھر حنّان نامی ریت کے بہت بڑے ٹیلے کے بائیں جانب سے گذر کر بدر کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں آپؐ کے لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ اور آنحضرتؐ ایک صحابی کو ساتھ لے کر حالات معلوم کرنے کے لئے ایک شیخ کے پاس گئے اور اس سے سوال کیا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ محمدؐ اور ان کے ساتھی کہاں ہیں۔ اس نے دریافت کیا آپ دونوں صاحبان کون ہیں۔ پھر اس قسم کی گفتگو کے بعد اس نے کہا میری اطلاع یہ

ہے کہ محمدؐ اور ان کے ساتھی فلاں روز مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ لہٰذا اس حساب سے ان کے قافلے کو فلاں جگہ ہونا چاہیئے۔ شیخ نے اندازہ سے جو جگہ بتائی وہ بالکل صحیح تھی۔ کیونکہ آنحضرتؐ کا پڑاؤ اس روز اسی جگہ تھا۔ پھر اس سے پوچھا گیا کہ قریش کا لشکر کہاں ہوگا۔ تو اس نے اپنے حساب سے اس کے قیام کی جگہ بھی بتائی۔ یہ جواب بھی صحیح تھا۔ اس کے بعد آپ وہاں سے تشریف لے گئے اور شیخ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ دونوں کون تھے۔

پڑاؤ پر پہنچ کر آپؐ نے شیخ کے بتلائے ہوئے نخلستان کی طرف دشمن کی خبر لانے کے لئے ایک دستہ بھیجا یہاں اُسے چشمہ پر قریش کے اونٹ اور اُن کے سقّے ملے۔ مسلمانوں کو دیکھ کر کچھ سقّے تو بھاگ گئے۔ مگر دو آدمیوں اور کچھ جانوروں کو مسلمانوں نے پکڑ لیا اور اپنے پڑاؤ پر لے آئے۔

صحابہؓ کے دریافت کرنے پر ان دونوں نے بتایا کہ ہم قریش کے سقّے ہیں۔ جب ان سے تجارتی قافلہ کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی البتہ لشکر کا پتہ بتا دیا۔ لشکرِ اسلام میں سے کچھ نے خیال کیا کہ سقّے جان بوجھ کر قافلے کا حال نہیں بتا رہے ہیں۔ جس وقت یہ پڑاؤ میں پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے ان سے کچھ استفسار فرمایا اور اس کے بعد صحابہؓ سے کہا کہ سقّے درست کہہ رہے ہیں۔ کفار کا لشکر عقنقل نامی ریتیلی پہاڑی کے عقب میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بیان کا سقوں پر بہت اثر ہوا۔ آپؐ نے انہیں قریب بلا کر نرمی سے پوچھا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ قریش کے لشکر کی تعداد کیا ہے۔ انہوں نے کہا تعداد تو ہمیں معلوم نہیں مگر وہ بہت زیادہ ہیں پھر آپؐ نے یہ دریافت کیا، اچھا یہ بتاؤ وہ روزانہ کتنے اونٹ کھانے کے لئے ذبح کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا ایک دن نو اونٹ اور دوسرے دن دس اونٹ ذبح کرتے ہیں۔ آپ نے اندازہ لگایا کہ ان کی تعداد نو سو یا ایک ہزار کے قریب ہے۔

اس کے بعد آپ نے دریافت فرمایا کہ لشکرِ قریش کے ساتھ کون کون سے سردار ہیں تو انہوں نے کہا۔ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوالبختری بن ہشام، حکیم بن حزام، نوفل بن خویلد، حارث بن عامر بن نوفل، عدی بن نوفل، نصر بن الحارث بن کلدہ، زمعہ بن الاسود ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف، بنھر بن الحجاج، سہیل بن عمرو اور عمرو بن عبدود۔ ہمیں صرف اتنے نام یاد ہیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ مکہ نے تمہارے سامنے اپنے

جگر پارے لاڈالے ہیں ؛

بسبس بن عمر اور عدی بن ابی الزغبا بدر کے چشمے سے اپنے مشکیزے کو بھر کر اونٹوں کو ٹیلے کے پاس بٹھا گئے۔ وہاں انہوں نے دو لڑکیوں کو یہ کہتے سُنا کہ کل یا پرسوں قریش کا قافلہ اس چشمہ پر آکر پڑاؤ ڈالے گا۔ دونوں اہلِ قافلہ کی خاطر و تواضع کے معاملہ پر آپس میں بحث کر رہی تھیں۔ مجدی بن عمرو بھی ان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے لڑکیوں سے کہا کہ اگر انتظام اچھا ہُوا تو اس کے عوض تمہیں بہت انعام ملے گا۔ عمرو عدی نے فوراً یہ خبر آنحضرت صلعم کو پہنچا دی ؛

ادھر قریش کے قافلہ کا سالار ابوسفیان قافلہ کو ساحل کے راستے پر ڈال کر خود بدر کی طرف روانہ ہو گیا تھا تاکہ اسلامی لشکر کی نقل و حرکت کا علم حاصل کرلے۔ جب وہ چشمۂ بدر پر پہنچا تو اس نے مجدی بن عمرو سے دشمن کے متعلق سوال کیا۔ مجدی نے کہا کہ میں نے صرف دو مشتبہ شتر سواروں کو دُور سے دیکھا ہے جو ٹیلے پر اونٹ بٹھا کر اور اپنے مشکیزوں میں پانی بھر کر چلے گئے۔ یہ سُن کر ابوسفیان اس جگہ گیا۔ جہاں اونٹ بیٹھے تھے۔ وہاں اس نے ان کی مینگنیاں توڑ کر دیکھیں اور کہا ان میں کھجور کی گٹھلیاں نکلی ہیں۔ لہٰذا یقیناً یہ مسلمان فوج کے شتر سوار تھے۔ کیونکہ صرف اہلِ مدینہ ہی اپنے اونٹوں کو ایسا چارہ دے سکتے ہیں۔ وہاں سے وہ تیزی کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹا اور اپنے قافلہ کو انتہائی تیز رفتاری سے چلنے کی تاکید کی ؛

جب یہ قافلہ جحفہ پہنچ گیا تو اسے یقین ہُوا کہ میں نے قافلہ کو خطرہ سے بچا لیا ہے، چنانچہ اس نے قریش کے لشکر کے پاس قاصد بھیجکر کہلا دیا کہ جس مال و متاع اور جن عزیز و اقارب کی سلامتی کے لئے آپ مسلمانوں سے لڑنے آئے تھے۔ اب وہ محفوظ ہیں۔ لہٰذا آپ سب مکّہ لوٹ جائیں ؛

ابوجہل نے اس مشورہ کو قبول نہ کیا اور کہا کہ ہم بدر میں کچھ روز قیام کرنے کے بعد واپس جائیں گے تاکہ بدر کا میلہ بھی دیکھ لیں اور بُت خانہ پر کچھ جانور بطورِ نذر چڑھا کر اس کامیابی کا جشن بھی منا سکیں اس کا خیال تھا کہ اس سے اس علاقے کے عرب قبائل ہماری قوت و شوکت دیکھ کر مسلمانوں کے علی الرغم ہمارے حلیف بن جائیں گے۔ لہٰذا اس نے لشکرِ قریش کو آگے بڑھنے کا حکم دیا ؛

جحفہ میں قریش کے حلیف بنی زہرہ اور بنی عدی بن کعب کے خاندانوں کے جو لوگ ان کی امداد کے لئے آئے تھے وہ اخنس بن شریق بن عمرو بن وہب کے کہنے سے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم جس کام کے لئے آئے تھے وہ پورا ہو گیا۔ اس لئے ابو جہل کی باتوں پر توجہ دینا بیکار ہے اس طرح قریش کا لشکر تنہا بدر کی طرف بڑھا، اور وادی کے دوسری جانب عقنقل کے ٹیلہ کے پیچھے خیمہ زن ہوا؛

بدر بطن وادی یلیل میں اور عقنقل کے ٹیلہ کے درمیان واقع ہے۔ بدر کے کنویں بطن یلیل میں مدینہ کی سمت والے کنارے کے قریب تھے۔ جس رات کو قریش کا لشکر عقنقل کے ٹیلہ کے پیچھے خیمہ زن ہوا۔ اس رات کو کچھ بارش ہوئی۔ جس کی وجہ سے وادی میں سخت دلدل ہو گئی اور قریش کو آگے بڑھنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ لہذا وہ آنحضرت ؐ کے لشکر سے پہلے پہنچکر چشمے پر قبضہ نہ کر سکے اور اسلامی لشکر اس پر قابض ہو گیا۔ مجاہدین نے چشمہ پر پہنچکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے تمام کاریزوں کے منہ بند کر دیئے اور چشمہ کے منبع کے قریب تالاب بنا کر قریش کے پاس پانی پہنچنے سے روک دیا۔ آنحضرت ؐ کا لشکر چونکہ بلندی پر تھا اور وہاں کی زمین پتھریلی تھی اس لئے انہیں اس بارش کی وجہ سے نقل و حرکت میں کوئی دشواری نہیں ہوئی

پہاڑی علاقوں کی جنگ

پہاڑی علاقوں میں جنگ کا زرین اصول یہ ہے اور اس پر دنیا بھر کے دفاعی ماہرین متفق ہیں کہ فوج کو کبھی وادیوں اور نالوں میں پڑاؤ نہیں ڈالنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسے علاقوں میں اگر یکایک تیز بارش ہو جائے تو سیلاب آ جاتا ہے اور اس سے جان و مال دونوں کا نقصان ہوتا ہے اور اگر معمولی بارش ہوتی ہے تو بدترین قسم کی دلدل ہو جاتی ہے۔ جسے انسان اور حیوان دونوں مشکل سے عبور کر سکتے ہیں۔ موٹر گاڑیاں پھنس کر رہ جاتی ہیں اور ٹینک بھی مشکل ہی سے نکل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وزیرستان کی برطانوی فوجی مہم کو لے لیجئے۔ ۱۹۳۷ء میں برطانوی فوج فقیر ایپی کے خلاف یورش کرتی ہوئی مقام گریوم تک پہنچ گئی جو میدان شام میں واقع ہے۔ یہ میدان در اصل شام نالے کے بہاؤ کی زمین ہے مئی کا مہینہ تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس زمانہ میں بارش ہو سکتی ہے۔ راقم الحروف اس فوج

نمبر۳

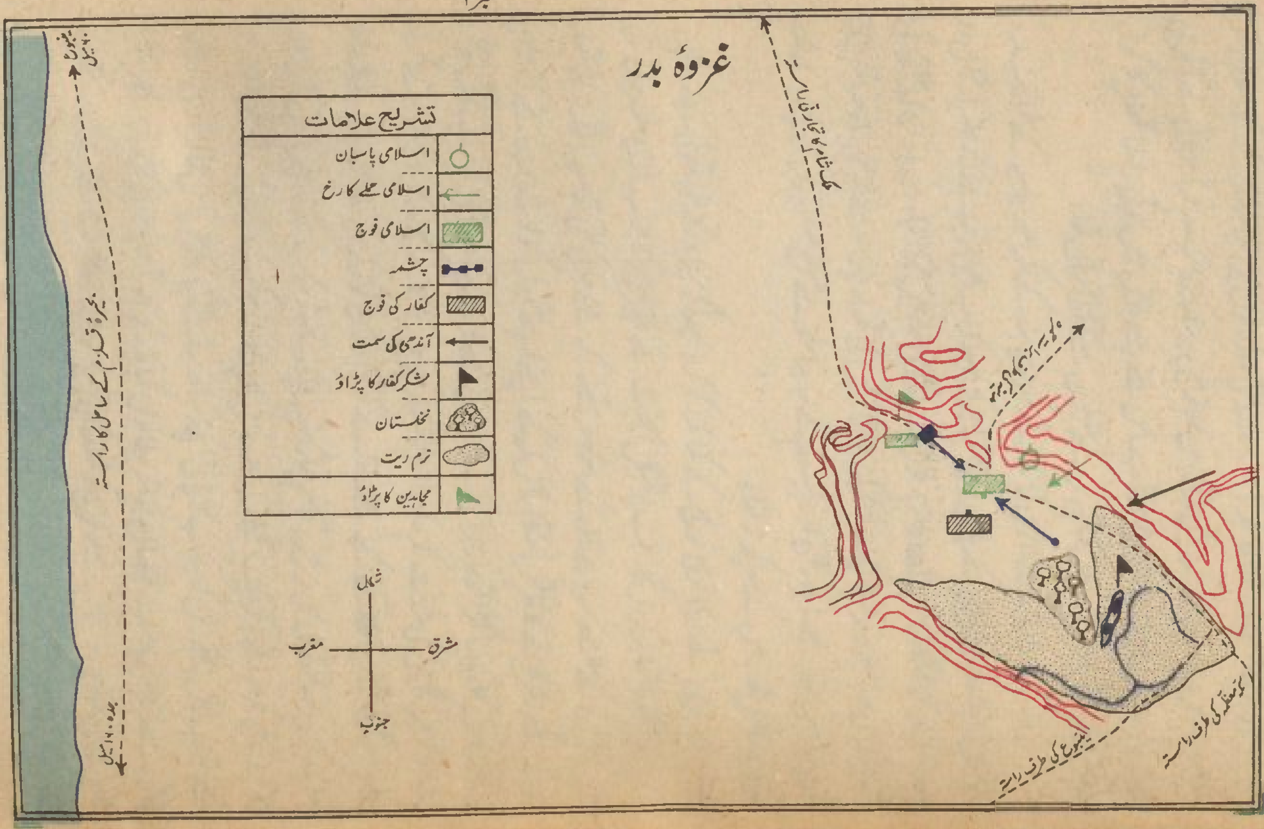

غزوۂ بدر
تشریح علامات
اسلامی پاسبان
اسلامی حملے کا رخ
اسلامی فوج
چشمہ
کفار کی فوج
آندھی کی سمت
لشکر کفار کا پڑاؤ
نخلستان
نرم ریت
مجاہدین کا پڑاؤ
شمال
مشرق
مغرب
جنوب
ملک شام کا تجارتی راستہ
بحیرۂ قلزم کے ساحل کا راستہ
ینبوع کی طرف راستہ
مکہ معظمہ کی طرف راستہ

کے ساتھ تھا۔ فوج نے پڑاؤ کے اس مقام کو کئی باتیں مدِّنظر رکھ کر چُنا تھا۔ اوّل یہ کہ یہاں فوج کے لئے جگہ کافی تھی۔ اس مہم سے پہلے قبائیوں کے خلاف اتنی بڑی فوجی جمعیت کبھی فراہم نہیں کی گئی تھی۔ لہٰذا وسیع اور کشادہ جگہ کی ضرورت تھی اور نالوں میں قیام نہ کرنے کے اصول کو سردست اس لئے نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ اس علاقہ میں برسات کا موسم عموماً جولائی کے آخری ہفتہ یا اگست کے مہینہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بارش نہیں ہوتی۔ لہٰذا خطرہ کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ دوم یہ کہ وہاں قبائیوں کے شبخون سے تحفظ آسان تھا۔

پڑاؤ کے بعد فوج کے برطانوی کمانڈر نے حکومتِ ہند کے محکمہ امورِ سیاسیہ کے نمائندہ (پولیٹیکل ایجنٹ) کو فقیر ایپی کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اب بھی موقعہ ہے کہ تم ہتھیار ڈال دو ورنہ تمہاری قیامگاہ پَسَل (Pasal)۔ جو (ایک پہاڑی غار میں تھی) تباہ و برباد کر دی جائے گی۔ فقیر ایپی کی مدد مسعود قوم کا ایک لشکر کر رہا تھا۔ جس کی تعداد چار سو سے کم تھی۔ ادھر انگریزی فوج چالیس ہزار سے زیادہ تھی اور ہر قسم کے جدید اسلحہ سے مسلح۔ مسعودیوں کے پاس لے دے کر ایک رائفل تھا۔ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔

فقیر ایپی نے برطانوی فوج کے کمانڈر کو کہلا بھیجا کہ میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے۔ میں آخری دم تک مقابلہ کروں گا۔ جب پولیٹیکل ایجنٹ نے فقیر ایپی کا جواب فوجی افسروں کی اس کانفرنس کے سامنے سنایا جو حملے کے احکام سننے کے لئے ہوئی تھی تو سب لوگ بے اختیار ہنسنے لگے۔ شرکائے کانفرنس احکام حاصل کر کے اپنے اپنے خیموں کو لوٹ رہے تھے کہ آسمان پر دفعتاً بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ جب اس میں سے گرج کی آواز آئی تو سب لوگ خوش ہوئے کہ اب گرمی کی شدّت کم۔ اور موسم خوشگوار ہو جائے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اولے پڑنے لگے۔ لوگ انہیں اٹھانے کے لئے دوڑے کہ کام و دہن کو تر کریں کہ ژالہ باری نے شدت اختیار کر لی اور تھوڑی ہی دیر میں تمام پہاڑ سفید چادر سے ڈھک گئے۔ پھر بارش آئی اور اتنی تیز آئی کہ اولے بہ کر ایک ٹیلے کی صورت میں ہمارے کیمپ کی طرف بڑھے، اور جو نیچے نشیب میں تھے۔ ان کو سیلاب کا پانی اپنے ساتھ بہالے گیا۔ غرض اس ژالہ باری اور بارش سے اتنا زبردست نقصان ہوا کہ برطانوی کمانڈر کو مجبوراً حملہ ملتوی کرنا پڑا۔ پھر یہی نہیں کہ اس طوفان و سیلاب سے فوج کو نقصان پہنچا اور حرب و ضرب سے لے کر رسد تک کا سامان ضائع ہوا۔ بلکہ بہت سا سامان بہ کر فقیر ایپی کے کیمپ کی طرف چلا گیا جو دریا کے

بہاؤ کی جانب تھا اور قبائیلیوں کے ہاتھ آیا۔ اس قسم کی دشواریاں قریش کے لشکر کو بھی پیش آئیں۔ ان کے باربردار اونٹ دلدل میں پھنس گئے، نقل وحمل دشوار ہو گئی۔ لہٰذا وہ تیزی سے حرکت نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پڑاؤ کی جگہ محفوظ و مضبوط تھی، اس لئے اسے بارش سے کوئی نقصان نہ پہنچا، آپؐ کو اس سے فوجی مورچوں کو اور مضبوط بنانے کا موقعہ مل گیا۔ وہیں آپ کے لئے کھجور کی شاخوں کی جھونپڑی بنائی گئی تاکہ آپ گرمی سے محفوظ رہیں۔ جھونپڑی کی آڑ میں آپ کی سواری کے لئے جگہ تھی اور یہ ایسے موقع پر تھی، کہ آپؐ جنگ کے تمام مورچوں کو آسانی سے دیکھ سکتے تھے:۔

دوسرے دن قریش کا لشکر وادی کی دلدل سے نکل کر ریتیلے علاقہ میں آیا اور ایک چھوٹے سے نخلستان میں ٹھہر گیا۔ یہ ریتیلا علاقہ دراصل ریت کی دلدل تھا جس کی سطح بارش کے پانی سے جم گئی تھی۔ قریش کو اس کا علم نہ تھا۔ جب لشکر نے پڑاؤ ڈال لیا تو عتبہ بن ربیعہ نے پھر اس بات کی کوشش کی کہ قریش جنگ کئے بغیر امن وامان کے ساتھ واپس چلے جائیں مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ اس سے پہلے بھی اس نے اس وقت قریش کو واپسی کا مشورہ دیا تھا۔ جب مسلمانوں کے دستے نے قلیب کے مقام پر قریش کے دوسقوں اور اونٹوں کو پکڑ لیا تھا۔ عتبہ جنگ پر صلح کو ترجیح دیتا تھا اور ابو جہل جنگ کو۔ وہ عتبہ کو بزدل کہتا تھا۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ نخلہ میں عبداللہ بن جحش کے دستے کے حملے اور قلیب میں دوسقوں اور اونٹوں کے پکڑے جانے سے کفار کے دلوں پر مسلمانوں کی بہادری کی ہیبت چھا گئی تھی اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جنگ سے پہلے ہی دشمنوں پر اپنی فوجی واخلاقی برتری وفضیلت کا اثر قائم کر دیا تھا۔ اس کا واضح تر ثبوت یہ ہے کہ جب قریش نے عمیر بن وہب کو لشکرِ اسلام کی تعداد اور دوسرے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجا تو اس نے آکر جواب دیا کہ مسلمانوں کی تعداد کم و بیش تین سو ہے اور جہاں تک میں دیکھ سکا کوئی کمک آس پاس نہیں ہے۔ مگر ان میں جذبۂ فداکاری حد سے بڑھا ہوا ہے۔ انہیں موت کا مطلق خوف نہیں وہ تمہارا سخت و شدید مقابلہ کریں گے۔ اور ان کے مقابلہ میں ہمارا نقصان بہت زیادہ ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر ہم فتحیاب بھی ہوئے تو زیادہ فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا اثر ہمارے لوگوں اور دوسرے قبیلوں پر اچھا نہ ہوگا۔ لہٰذا جنگ شروع کرنے سے پہلے ان باتوں پر اچھی طرح غور کر لیجئے:۔

عُمیر کے اس بیان کوسُن کر حکیم بن حزام عتبہ بن ربیعہ کے پاس گیا کہ وہ قریش کے سرداروں میں ممتاز تھا اور یہ مشورہ دیا کہ قریش کو سمجھا بجھا کر واپسی پر آمادہ کرے اور عمرو بن الحضرمی کے خون کا بدلہ لینے سے روکے اس نے کہا میں تو راضی ہوں۔ تم ابو جہل کو آمادہ کرو۔

اس کے بعد حکیم بن حزام مروان بن حکم کے پاس آیا اور کہا کہ جحفہ سے قریش کا ایک بڑا حلیف ہم سے الگ ہو گیا ہے۔ میں نے عتبہ سے عمرو بن الحضرمی کے خون کا بدلہ لینے سے گریز کرنے کا مشورہ کیا تو وہ اس پر رضامند ہے اور میری رائے سے متفق ہے کہ محمدؐ سے جنگ نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ لہذا میں اس لئے آیا ہوں کہ تم ابو جہل کو جنگ سے باز رہنے کا نیک مشورہ دے کر ساری قوم کو اپنا ممنونِ احسان بنا لو۔ مروان راضی ہو گیا۔ مگر ابو جہل نے اس کو بہت سخت جواب دیا۔ اور کہا کہ تو عتبہ جیسے بزدل کا پیامبر کیوں بنا؟ اس کے بعد عتبہ ابو جہل کے پاس آیا وہ اس وقت ایما بن رحضتہ الغفاری سے باتیں کر رہا تھا۔ ایما اپنے حلیف مشرکین کے کھانے کے لئے دس اونٹ دعوت کے طور پر لایا تھا۔ اس نے ابو جہل کو اپنے اونٹوں کے ساتھ اپنے باپ کی طرف سے یہ پیغام بھی پیش کیا کہ اگر اسلحہ یا سپاہ کی ضرورت ہو تو ابو جہل وہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ابو جہل نے اس کے جواب میں کہا کہ جہاں تک عزیزانہ تعلقات کا حق تھا وہ تم نے ادا کر دیا۔ مگر مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہماری طاقت بہت بڑی ہے۔ اس کے بعد وہ عتبہ سے مخاطب ہوا اور اسے بہت سخت سست کہہ کر اس کے گھوڑے کی پشت پر تلوار ماری۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تم بزدل ہو یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ پھر اس نے عمرو بن الحضرمی کے بھائی عامر بن الحضرمی کو خون کا بدلہ لینے کے لئے اشتعال دلایا۔ وہ ابو جہل کی باتوں میں آ گیا۔ اور عتبہ کا اثر زائل کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے لشکر کو لے کر قریش سے الگ نہ ہو سکا اور مجبوراً لڑائی پر رضامند ہو گیا چونکہ حکیم اور عتبہ کی مصالحانہ روش سے لوگوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ اس لئے ابو جہل نے زیادہ توقف کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً لڑائی شروع کر دی۔

جنگ کا آغاز

مبارزت طلبی کے لئے ابو جہل نے سب سے پہلے عتبہ اور اس کے بیٹے ولید بن عتبہ اور اس کے بھائی شیبہ کو بھیجا۔ ان کے جواب پر انصار کی طرف سے تین جوان نکلے۔ ان میں دو

حارث کے بیٹے عوف اور معوذ تھے اور تیسرا عبداللہ بن رواحہ۔ قریش نے ان کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمارے مقابلہ پر ہمارے ہم قوموں کو بھیجو۔ اس پر حمزہؓ بن عبدالمطلب عبیدہ بن الحارث، اور علیؓ ابن ابیطالب نکلے۔ مقابلہ ہوا۔ تینوں مشرکین ہلاک ہو گئے۔ مسلمانوں میں سے عبیداللہ سخت زخمی ہوئے۔ حمزہؓ اور علی ابن ابیطالب انہیں اٹھا کر اپنے لشکر میں لائے جہاں وہ انتقال کر گئے۔ تینوں مشرکین کی ہلاکت دیکھ کر ابو جہل کے لشکر نے ایک دم ہلہ بول دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس امکان کے پیش نظر اپنے لشکر کو حکم دے رکھا تھا۔ کہ اگر کفار یک لخت حملہ کریں تو انہیں آگے بڑھنے دینا اور نہایت تیز رفتاری سے صحیح نشانہ پر تیر اندازی کرنا۔ مجاہدین کی صف بندی اس طرح فرمائی تھی کہ مجاہدین فولاد کی دیوار بن گئے تھے۔ جس میں کسی جگہ کوئی شگاف نہ تھا کہ دشمن اندر گھس سکتا۔ اس کے علاوہ ایک علیحدہ جماعت، حملے کے لئے تیار تھی:

آنحضرتؐ نے جنگ سے پہلے رات کے وقت لشکرِ اسلام کو قطاروں میں تقسیم کر کے باقاعدہ صف بندی کی۔ اس کے بعد ان کا معائنہ کیا اور جہاں کوئی آدمی آگے پیچھے نظر آیا اُسے چھڑی کے اشارے سے درست کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے فوج کے مختلف حصوں پر افسر تعینات کئے اور ان کے الگ الگ علمبردار بھی مقرر فرمائے۔ پھر فوج کو ہدایات جاری کیں اور نصیحت فرمائی کہ صف بندی کو نہ توڑیں، جب تک اجازت نہ دی جائے۔ لڑائی کا آغاز نہ کریں دشمن دور ہو تو تیر چلا کر ضایع نہ کریں۔ نزدیک آئے تو تیر چلائیں اور قریب آئیں تو پتھر ماریں اور زیادہ نزدیک آئے تو نیزوں سے روکیں اور سب سے آخر میں تلوار نکالیں:

محدثین و مورخین کے اقوال کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے تمام صحابہؓ کے ساتھ میدانِ جنگ کا معائنہ کیا اور جگہ جگہ فرماتے گئے کہ دشمن کا فلاں افسر فلاں جگہ ہوگا آنحضرتؐ کا انتہائی خطرہ کے موقعہ پر اس درجہ اطمینان کے اظہار سے فوج میں جو دلولہ اور خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگا لینا مشکل نہیں +

آنحضرتؐ نے اپنی چھوٹی سی جماعت کے لئے رضاکار عورتیں بھی مقرر کی تھیں، جو بخاری کی حدیث کے مطابق زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، سپاہیوں کو پانی پلاتیں۔ میدان میں دشمن کے گرے ہوئے تیر اُٹھا کر مسلم تیر اندازوں کو دیتیں +

جب آپ فوج کا معائنہ کر کے ہدایات جاری فرما چکے تو آپ چند صحابہ کے ساتھ

اس پہاڑی ٹیلے پر تشریف لے گئے۔ جہاں آپ کے لئے کھجور کی شاخوں کی جھونپڑی بنائی گئی تھی۔ یہاں سے میدانِ جنگ صاف نظر آتا تھا۔ یہاں چند تیز رفتار سانڈنیاں رکھی گئی تھیں تاکہ فوج کو ہدایات بھیجی جا سکیں۔ نیز حفاظت کے لئے ایک محافظ دستہ بھی مقرر کیا گیا تھا۔

دشمن کے حملے کو دیکھ کر آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور مٹھی بھر خاک اٹھا کر دشمن کی طرف اڑائی۔ اس کا اثر دیکھ کر آپ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے فوراً بعد پہاڑ کی طرف سے ہوا کا نہایت سخت جھونکا آیا جس کے ساتھ قریش کی طرف ریت کا طوفان بڑھا اور ان کے کیمپ میں ابتری پھیل گئی۔ ایک طرف مسلمانوں کے تیروں کی بارش تھی۔ دوسری طرف ریت کا طوفان اور تیسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حملہ کرنے والے دستہ کو دشمن کے دائیں بازو پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس دستہ میں علیؓ حمزہؓ اور ابو دجانہؓ وغیرہ جیسے نامور بہادر شامل تھے۔ قریش کے اسپ سوار اور شتر سوار ریت کی دلدل میں پھنس کر عاجز ہو چکے تھے۔ لہذا دشمن کے اوسان جاتے رہے۔ ابو جہل نے پوری طاقت سے حملہ کیا۔ مگر کوئی پیش نہ گئی۔ خود بھی اسی حملے میں مارا گیا اور دوسرے ساتھی بھی کام آئے۔ قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور افراتفری کے عالم میں بھاگنے لگے۔ ستر آدمی گرفتار اور اتنے ہی ہلاک ہوئے دشمن کو بھاگتے دیکھ کر آنحضرتؐ نے ایک دستہ کو اس کا تعاقب کرنے اور اس کی نقل و حرکت کو دیکھنے کے لئے مامور کیا کہ مبادا وہ واپس آنے کا ارادہ کرے یا دوسرا راستہ اختیار کرے تو آپؐ کو اس کی فوراً اطلاع دی جائے۔

جنگ کے بعد آنحضرتؐ نے بدر میں تین روز تک قیام کیا۔ اس کے بعد شہدائے بدر کو دفن کیا اور مشرکین کی لاشوں کو زیرِ خاک کیا۔ اس کے بعد وادی صفرا تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے مالِ غنیمت تقسیم کیا۔ مگر قیدیوں کو اپنے پاس رکھا۔ ان کے ساتھ نہایت شفقت کا سلوک کیا۔ جن کے پاس پہننے کو کپڑے نہ تھے انہیں کپڑے پہنائے۔ سب کو اچھا کھانا کھلایا۔ بالآخر حضرت ابو بکرؓ کے مشورہ پر قریش سے فدیہ لے کر سب کو چھوڑ دیا

یہاں ہم اس دفاعی اصول کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ جس کے ماتحت آپؐ نے قریش کے لشکر کا مقابلہ مدینہ کے قریب نہیں کیا۔ بلکہ مدینہ سے منزلوں دور بدر میں کیا۔ دفاعی منصوبہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ دشمن کو ہماری نقل و حرکت کے مقصد کا علم نہ ہو اور وہ اسی شش و پنج میں رہے کہ ہم خدا جانے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ پھر فوج کی ترتیب اس طرح

کی جائے کہ دشمن کی چالوں کو رد کرنے کے لئے کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ فوج خطرہ کے مقام پر آسانی سے جمع کی جا سکے۔ آنحضرت دشمن کی طاقت کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے بدر کا مقام ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ یورپ کے ایک مشہور دفاعی مبصر کا قول ہے کہ جو سپہ سالار ہر جگہ مضبوط رہنا چاہتا ہے اور بیک وقت کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ہر جگہ ناکام رہتا ہے اور ہر موقعہ پر شکست کھاتا ہے۔ آنحضرتؐ نے اپنی فہم و بصیرت سے بدر کے مقام کا انتخاب کر کے اپنی چھوٹی سی فوج سے دشمن کو شکست دے کر اپنا مقصد حاصل کر لیا +

سپہ سالار کے لئے ضروری ہے کہ خواہ دفاعی و حربی منصوبہ کتنا ہی عمدہ ہو۔ مگر فوج کے ایک حصہ کو بوقتِ ضرورت کام لینے کے لئے محفوظ رکھے۔ اس سے ناگہانی حملے کے موقعہ پر مدافعت کی جا سکتی ہے۔ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگے تو اس کا تعاقب کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے بھی اپنی چھوٹی سی فوج کا ایک حصہ الگ رکھا اور مناسب وقت پر اسے حملہ کا حکم دے کر دشمن کی ہمت توڑ دی +

فوج کے جملہ حصوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ لڑائی کے حالات کی خبریں سپہ سالار کو پہنچاتے رہیں تاکہ وہ صحیح فیصلہ کر سکے۔ آپؐ عریش کے ٹیلے سے نہ صرف جنگ کے تمام حالات بچشم خود دیکھتے رہے، بلکہ وہیں سے احکام بھی بھیجتے رہے۔ اس طرح جنگ سے پہلے آپ قریش کے تجارتی قافلہ اور لشکر کی خبریں حاصل کرتے رہے۔ جنگ کے دوران میں خبر رسانی کا یہ انتظام اسی وقت سودمند ہوتا ہے۔ جب محفوظ فوج ایسی جگہ رکھی گئی ہو جو نہ بہت آگے ہو نہ بہت پیچھے۔ آنحضرتؐ نے اپنا مقام اور محفوظ فوج کی جگہ ایسی رکھی کہ نہ حملے کی زد میں تھی نہ بہت دور۔ آپؐ نے پوری جنگ اپنی آنکھوں سے ہوتی ہوئی دیکھی اور جب محفوظ دستے کے استعمال کا وقت آیا تو اسے دشمن کے کمزور پہلو پر حملہ کا حکم دے کر اسے شکست دے دی +

اس شکست سے اہل قریش کے پندار کو سخت چوٹ لگی مگر انہوں نے ضبط سے کام لیا اور اپنے مقتولین پر گریہ و بکا بھی نہیں کیا کہ اس سے مسلمان خوش ہوں گے اور دوسرے قبائل پر برا اثر پڑے گا۔ مگر انتقام کی آگ ان کے دلوں میں شدت سے بھڑکنے لگی +

جنگ کے یہ واقعات ہم نے مختلف تاریخوں سے اخذ کر کے درج کئے ہیں۔ اب ان کو دفاعی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرتؐ نے

ابوسفیان کے قافلہ سے کوئی تعرض کرنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ جبکہ آپ کو قافلہ کی روانگی کا علم تھا۔ اگر آپ تیز رفتاری سے بڑھ کر قافلہ کو پکڑ لیتے تو زرومال کثرت سے ہاتھ آتا۔ پھر جب قافلہ نکل گیا تھا تو آپؐ نے بدر میں کیوں قیام کیا۔ فوراً مدینہ کیوں نہ واپس آگئے؟

دوم۔ آپؐ بدر کے قریب اتنے دن کیوں مقیم رہے۔ فوراً ہی اس پڑاؤ پر قبضہ کیوں نہ کیا۔ جہاں آخرکار عجلت میں دشمن سے کچھ ہی پہلے جانا پڑا۔

سوم یہ کہ دشمن کی شکست و ہزیمت کے بعد آپؐ نے اس کا تعاقب کیوں نہ فرمایا؟

چہارم فتح کے بعد آپؐ بدر میں کئی دن کیوں مقیم رہے جس سے اہل مدینہ کو تشویش رہی؟

پنجم۔ اسیرانِ جنگ سے انتقام کیوں نہ لیا۔ ور نرمی کا سلوک کر کے بعض کو بغیر فدیہ لئے کیوں چھوڑ دیا۔ بعض مورخین نے قیدیوں کی زبانی لکھا ہے کہ مسلم فوج خود پیدل چلی۔ اور اسیرانِ جنگِ بدر کو اس نے اونٹوں پر سوار کیا۔ خود صرف خرمے کھا کر دن گزارے اور ہمیں روٹی کھلائی۔ اس نرمی میں کیا مصلحت تھی؟

ششم۔ بدر کی چھوٹی سی لڑائی دفاعی نقطۂ نظر سے کیا اہمیت رکھتی ہے اور اس سے کن اصولوں کا استخراج کیا جا سکتا ہے؟

یہ سوال کہ قافلے کے نکل جانے کے بعد آنحضرتؐ نے فوراً مدینہ کو مراجعت کیوں نہ فرمائی اور ہفتہ بھر تک بدر کے قرب و جوار میں رہ کر دُور افتادہ علاقہ میں خطرات کا مقابلہ کیوں کیا۔ اس کا جواب دفاعی سیاست کی زبان میں یہ ہے کہ قابل سپہ سالار اپنی فوجی مہم کو ایسا رخ دیتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کا دفاعی مقصد حاصل ہو جائے۔ اس سے دشمن کشش و پنج میں پڑ جاتا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے حریف و متقابل کا منشا کیا ہے اور وہ کس منصوبہ پر چل رہا ہے۔ دشمن کو اس طرح کشش و پنج میں ڈال کر قابل سالار اس پر ایسی جگہ حملہ کرتا ہے۔ جہاں اسے کامیابی یقینی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی یہ رُخ ایسا ہوتا ہے۔ جہاں سے وہ کم سے کم نقصان پر اپنا دفاعی مقصد پورا کر سکتا ہے۔ چونکہ دفاعی سیاست کا مقصد دشمن کی فوج کو شکست دے کر تباہ کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا آنحضرتؐ کا مقصد اہلِ مکہ کی طاقت کو شکست دے کر تباہ کرنا تھا۔ محض مال لوٹ لینا نہ تھا۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اور جتنا ان میں فرق ہے اتنا ہی ان کی اہمیت میں بھی فرق ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم تھا کہ قریش اپنی تجارت کو فنا ہونے دینے سے پہلے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے نکلیں گے۔ لہذا انہیں ایسے مقام پر لڑنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے جو ان کے مفید مطلب نہ ہو۔ اگر آنحضرتؐ قافلہ پر حملہ کر دیتے تو بالکل ممکن تھا کہ عین اُس وقت جب وہ اس میں مشغول ہوتے۔ قریش اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھاتے اوّل اپنے لشکر کے دو حصے کر کے ایک سے لوٹ کے دوران میں مسلمانوں پر عقب سے حملہ کرتے اور دوسرے سے مدینہ پر چڑھائی کر کے ان کے اہل و عیال کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیتے۔ ایسی صورت میں قریش کی طاقت دفاعی اعتبار سے اس طاقت سے دو چند ہوتی۔ جس کا انہیں بدر میں مقابلہ کرنا پڑا۔

چونکہ لشکرِ قریش کی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔ اس لئے ان کو تذبذب میں ڈال کر میدانِ جنگ میں تباہ کرنا ضروری تھا۔ دشمن پر کارگر حملہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب وہ عالمِ بے خبری میں ہو یا ہمارے دفاعی منصوبہ سے ناواقفیت کی بنا پر اپنے آپ کو ہمارا شکار بنا دے۔ ایسی صورت میں اس سے جونہی چوک ہو۔ فوراً بھرپور وار کیا جائے۔ دفاعی منصوبے میں یہ موقعہ در اصل ایسی چال ہے جو دشمن کو

۱۔ اس بات پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے محاذ کی سمت تبدیل کر دے اور اس سے اس کے لشکر کا نظم خراب ہو جائے۔

۲۔ دشمن کی فوج کے حصے ایک دوسرے سے اس طرح کٹ جائیں کہ وہ ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں۔

۳۔ اس کے رسد و خوراک کے انتظام میں خلل واقع ہو جائے۔

۴۔ شکست کی صورت میں اپنے مرکز کی طرف پسپائی کا راستہ منقطع پائے۔

دشمن کے دل میں اس قسم کا خوف یا جملہ قسم کے خطرات اور اندیشے بیک وقت پیدا ہو سکتے ہیں اور جب یہ پیدا ہو جاتے ہیں تو ہراس و اضطراب کا باعث ہوتے ہیں۔ ایک اندیشے سے دوسرا اندیشہ اور ایک خطرہ سے دوسرا خطرہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ بدر کے معرکہ سے پہلے بالکل یہی ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حملے کے منصوبے نے اہل قافلہ اور لشکرِ قریش دونوں کو اس خوف میں مبتلا رکھا کہ معلوم نہیں مسلمان کیا کرنا چاہتے ہیں شک و ریب اور بے یقینی کی وجہ سے ان کا دفاعی منصوبہ غلط رہا۔ ان کی باربرداری پر

مسلمانوں کے اچانک حملے نے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ وہ جنگ کرنے میں مذبذب ہو گئے اور آنحضرتؐ کی دفاعی چالوں کے مطابق اپنے مورچوں کو تبدیل کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے سالار ابوجہل نے انھیں ایسی جگہ لا ڈالا۔ جہاں نہ پانی تھا اور نہ جانوروں کے لیئے چارہ۔ سورج منہ کی طرف تھا، ہوا ناموافق تھی۔ زمین ریتیلی اور دلدلی تھی۔ جس سے سوار فوج بالکل معطل ہو کے رہ گئی۔ جب انہوں نے پا پیادہ لڑنا شروع کیا تو مسلم تیر اندازوں نے آنحضرت کے حکم سے ان پر تیروں کی بارش کر دی۔ چونکہ ریتیلی اور دلدلی زمین کی وجہ سے قریش کو چلنے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس لیئے کثرت سے تیروں کا نشانہ بن کر ہلاک ہوتے۔ پھر جب لشکرِ اسلام کے قریب دست بدست لڑائی کے لیئے پہنچے، تو تھک کر اتنے پست ہو چکے تھے اور پیاس کی شدّت نے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے اور بہت زیادہ جانی نقصان اٹھایا۔

جس طرح سکّے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اس طرح لڑائی کے ہر اصول کے بھی دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ تلوار کا وار کرتا ہے تو دوسرا مدافعت کے لیئے ڈھال بڑھاتا ہے کبھی تلوار سے دشمن کو شہ دی جاتی ہے۔ کبھی ڈھال سے۔ لیکن دونوں کا مقصد یہ ہے کہ دشمن کو اپنے جسم کا وہ حصّہ دکھانے پر مجبور کیا جائے۔ جہاں اس پر کارگر وار کیا جا سکتا ہے گویا دشمن کو تو اس پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنی فوج کو ٹکڑیوں میں تقسیم کر دے۔ اور اپنی فوج کو ایک جگہ مجتمع رکھا جائے۔ تاکہ حملہ کے مجوزہ موقع پر مضبوط ترین رہے۔ آنحضرتؐ نے اس پر نہایت عمدگی و خوش اسلوبی سے عمل کیا۔ کفّار کی کچھ فوج تو قافلہ کی حفاظت کی وجہ سے جنگِ بدر میں حصّہ نہ لے سکی، پھر سیاسی چال سے کچھ قبائل اس سے الگ ہو گئے۔ یعنی جب انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا تو وہ الگ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ابوجہل کی باتوں پر مطلق توجہ نہ کی۔ پھر جب قریش کا بڑا حصہ میدانِ جنگ میں پہنچا تو اس کا دوسرا حصہ پہلے حصّہ کی مدد نہ ملنے کی وجہ سے بےکار ہو گیا۔ یعنی سوار، پیدل فوج کے کام نہ آئے۔ پھر آنحضرت صلعم کی پیش قدمی نے لشکرِ قریش کے دل میں ہراس پیدا کر دیا۔ فوج کے کئی سرداروں کو ابوجہل کی سالاری پر اعتماد نہ تھا۔ وہ کھلم کھلا لڑنے کی مخالفت کر رہے تھے۔ گویا اخلاقی طور پر وہ میدانِ کارزار گرم ہونے سے پہلے ہی شکست کھا چکے تھے اور یہ امر مسلّمہ ہے اور اس پر ماضی و حال کے تمام ماہرینِ دفاع

کا اتفاق ہے اور اخلاقی شکست بڑی سے بڑی فوج کو بے کار بنا دیتی ہے؛

ان حالات کو اچھی طرح سمجھ کر اور حربی مہارت سے کام لے کر جب آنحضرت صلعم نے دشمن پر ایک پہلو سے حملہ کیا تو وہ ایسا کامیاب ثابت ہوا کہ دشمن کی کمر ٹوٹ گئی۔ آپؐ نے اپنے پڑاؤ کے مقام اور فضائی و موسمی حالت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

دفاعی نقطہ نظر سے ہم اس جنگ سے یہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں :-

ا۔ دفاعی منصوبہ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس پر آسانی سے عمل کیا جا سکے۔ یعنی منصوبہ دشمن کی طاقت کا صحیح اندازہ لگا کر ایسا بنایا جائے کہ حسبِ حالات اس میں رد و بدل کیا جا سکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جب منصوبہ کو سکّہ کی طرح دو رُخا رکھا جائے۔ جیسے آنحضرتؐ نے رکھا۔ کہ دشمن کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ آپؐ قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں یا لشکر پر۔ اس سے دشمن کے دل میں شک اور تذبذب پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے منصوبے پر عزم و استقلال کی قوت کے ساتھ عمل نہیں کر سکتا۔ دفاعی اعتبار سے یہ موقع سب سے اہم ہوتا ہے اور اس میں دشمن پر کارگر وار کرنے کو کوئی نہ کوئی پہلو مل جاتا ہے؛

مگر ایسی جگہ جہاں زمین کا نشیب و فراز اور قدرتی رکاوٹیں دونوں لشکروں کے سالاروں کے سامنے ہوں۔ ماہرینِ فنِ حرب آسانی سے کوئی ایسا منصوبہ نہیں بنا سکتے۔ جس سے دشمن ایسی چال کی تقلید پر آمادہ ہو جاتے کہ یقینی طور پر موت کے منہ میں دھکیل دیا جائے اس کا اہتمام دفاعی منصوبے ہی میں آسانی سے کیا جا سکتا ہے تاہم یہ ناممکن بھی نہیں ہے اور بدر میں ایسا ہی ہوا۔ ٹینبرگ کے محاذ پر فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ نے روسیوں کو ایسے ہی پھندے میں پھنسا کر مارا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں ہٹلر نے بھی اتحادی فوجوں کو ایسا ہی ناچ نچایا تھا کہ انہیں ڈنکرک سے نکل کر بھاگنا پڑا۔ حربی نقطۂ نظر سے میدانِ جنگ میں بہترین اصول یہ سمجھا جاتا ہے کہ دشمن جہاں کوئی غلط چال چلے۔ اسے فوراً اس کی سزا دے دی جائے تاکہ وہ ہمت ہار دے۔ منصوبہ حرب پھلدار درخت کی طرح ہے۔ جس میں کئی شاخیں ہوتی ہیں تو پھل آتا ہے۔ بغیر شاخوں کے پھل نہیں آتا۔ اسے ٹھنٹھ ہی کہا جاتا ہے؛

جنگِ بدر میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جس دفاعی سیاست سے کام لیا اس کے سکّہ کی طرح دو رُخ تھے اور اس سے آپؐ نے ہمارے لئے یہ سبق چھوڑا،

کہ دفاعی منصوبے کے دو رُخ رکھنا مفید ہوتا ہے تا کہ حسبِ موقع ان میں سے جس سے چاہیں اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔ اس دور اندیشی سے میدانِ جنگ میں جہاں حالات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں اور رفتارِ جنگ کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دفاعی مقصد کا حصول بالکل یقینی ہوتا ہے۔

برطانوی دفاعی مبصر جنرل برڈ وڈ لکھتے ہیں۔ جب کوئی حکومت جنگ کا ارادہ کرے تو اسے چاہیئے کہ پہلے اس بات کا پورا اطمینان کر لے کہ اندرونِ ملک معاشی و اقتصادی طور پر آبادی کے مختلف گروہوں میں یک جہتی و ہم آہنگی موجود ہے۔ اس کے بعد دشمن کے اقتصادی وسائل کو کمزور کر کے اس کی اہمیت کو کم کرنے کا منصوبہ بنانا چاہیئے۔

نیز اس کو مدِ نظر رکھے کہ کوئی ایسا منصوبہ اختیار نہ کرے جو ظاہری نتائج کے اعتبار سے اس کے لئے مفید ہو مگر آگے چل کر اس سے دشمن کو تقویت پہنچے۔ مثال کے طور پر پہلی عالمگیر جنگ میں جب جرمنی کے یوبوٹ (تحت البحر کشتیوں) نے بلا تخصیص و امتیاز تجارتی جہازوں کو غرق کرنا شروع کیا تو بالآخر امریکہ انگریزوں کے ساتھ مل کر جرمنی کے خلاف میدانِ جنگ میں آ گیا اور جرمنی کے مقابلہ میں اتحادیوں کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی۔

کہتے ہیں جب ولنگٹن سے پوچھا گیا کہ آپ کی فتوحات کا راز کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں دشمن کے اندازہ سے عموماً پندرہ منٹ پہلے مقررہ مقام پر پہنچ جاتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دشمن پر عموماً اچانک حملہ کرتا تھا۔ یعنی دشمن کو جس وقت حملہ کی توقع ہوتی تھی۔ اس سے پہلے ایسی نقل و حرکت سے دشمن سپہ سالار مبہوت و پریشان ہو جاتا ہے، اس کی فوج کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، دماغی توازن بجا نہیں رہتا اور جب یہ ہوتا ہے تو غلطیوں کا سرزد ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔ بسا اوقات سپہ سالار کی اس قسم کی غلطیاں حکومتوں کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیتی ہیں، خواہ اس کے پاس اپنے دشمن کے مقابلہ میں فوج اور اسلحہ زیادہ ہی کیوں نہ ہو، چونکہ وہ انہیں صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکتا۔ اس لئے فوج اور اسلحہ کا یہ عددی تفوق بیکار ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دشمن سپہ سالار کا دماغی توازن چونکہ صحیح ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ حریف کی ہر چال کا جواب کامیابی کے ساتھ دیتا ہے۔ دفاعی سیاست کا دوسرا اصول جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم کیا وہ ناگہانی حملہ کا ہے۔ جب آپ مدینہ سے روانہ ہوئے تو دشمن کے مخبروں

نے سمجھا کہ قافلہ کو لوٹنے جا رہے ہیں۔ ابتدائی سفر کا رخ بھی اسی کی طرف رہا۔ مگر اس کے بعد ایسا پیچیدہ اور دشوار گزار راستہ اختیار فرمایا کہ دشمن اس نقل و حرکت کا مقصد نہ سمجھ سکا۔ آنحضرت ؐ کی بصیرت نے دیکھ لیا تھا کہ دشمن اپنے قافلہ کی حفاظت کے لئے فوج لے کے آئے گا۔ اس لئے آپ اس کی طاقت کو توڑنے اور اس کو نیچا دکھانے کے لئے فوجی چال سے اس کے لشکر کو ایسی جگہ لے آئے۔ جہاں بھرپور وار کرنا آسان تھا۔ آپؐ کی فوجی چال سے دشمن کو اس کا مطلق علم نہ ہو سکا کہ آپؐ کا اصل مقصد کیا ہے۔ دشمن کو ایسے شش و پنج اور لاعلمی کی حالت میں ڈالنے کو فوجی اصطلاح میں حربی پیشقدمی (Initiative) کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دشمن نادانستگی مگر مجبوری کی حالت میں ایسی چالیں چلتا ہے۔ جن سے آخرکار وہ موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ مگر حربی پیش قدمی (Initiative) کا یہ موقعہ اسی سپہ سالار کو ملتا ہے جو دفاعی منصوبہ نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے بناتا ہے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے دور اندیشی اور عزم و حوصلہ مندی سے کام لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ جنگ شروع کرتے وقت حربی پیشقدمی (Initiative) صرف وہی سالار کر سکتا ہے۔ جس نے جنگ کے لئے ہر قسم کی تیاریاں مکمل کر لی ہوں اور فتح اسی کے قدم چومتی ہے جو جنگ میں استقلال و حوصلہ مندی سے اپنے منصوبہ پر عمل کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ حربی پیشقدمی سے حاصل شدہ تفوق کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ بلکہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے ؛

حربی پیشقدمی یا بالادستی (Initiative) ایسا حربہ ہے۔ جس سے سپہ سالار دشمن پر حسب منشاء حملہ کر سکتا اور اسے مغالطہ میں مبتلا رکھ سکتا ہے۔ حریف مقابل اسی شش و پنج میں رہتا ہے کہ خدا جانے حملہ کب اور کس سمت سے ہوگا اور کس طاقت کے ساتھ ہوگا۔ لہٰذا وہ مدافعت کی پوری تیاری نہیں کر سکتا۔ وہ جس حالت میں بھی ہوتا ہے اسے حملے کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور جب تک کمک پہنچتی ہے۔ عموماً جنگ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ حربی پیش قدمی کا اختیار کرنے والا لازمی طور پر کامیاب ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ مستعدی کے ساتھ اپنے منصوبہ کو عمل کا جامہ نہیں پہناتا۔ تو حریف اس پر کارگر حملہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں اسے اس کا پتہ چل جاتا ہے کہ دشمن سپہ سالار کی فوجی چال کیا ہے ؛

آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ دشمن کے لشکر کو ایسے میدان میں لے آئے جو فنِ سپہ گری کے لحاظ سے اس کی فوجی تربیت کے موافق نہ تھا۔ اس کے سوار بالکل بیکار ہو گئے جس سے اس کی طاقت کم ہو گئی۔ پانی نہ ملا تو آنحضرتؐ کی فوجی چال کے مطابق دشمن نے مجبور ہو کر خود بخود لشکرِ اسلام پر حملہ کیا۔ کمک کے لئے فوج کا کوئی حصہ الگ نہ رکھا۔ لہٰذا جب آنحضرتؐ کے حکم سے اسلامی دستہ نے حملہ کیا تو قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور مُردوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اگر دشمن کو شکست ہو جائے تو ایک اہم دفاعی اصول یہ ہے کہ تکمیلِ شکست کے لیے دشمن کا تعاقب کیا جائے تاکہ اس کی رہی سہی قوت بھی ختم ہو جائے۔ مگر آنحضرت صلعم نے اس پر عمل نہیں کیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ آپؐ نے بدر میں تین روز تک قیام فرمایا اور ایک مختصر سا دستہ بھی دشمن کے پیچھے روانہ کیا۔ مگر صرف اس لئے کہ اگر وہ پلٹے۔ یا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے تو آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع دے۔ گویا دشمن کا تعاقب کر کے اس کی طاقت کو بالکل ختم کرنے اور اس پر حملہ کرنے کے لئے آپؐ نے فوج روانہ نہیں کی۔ اِس کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کہ آپ کے پاس سوار صرف چند تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ بدر تک پہنچنے کے لئے کئی کئی آدمیوں کے حصہ میں ایک ایک اونٹ آیا تھا۔ اگر آپؐ پیدل فوج کو روانہ فرما دیتے تو بہت ممکن تھا، کہ ہزیمت خوردہ لشکرِ قریش پلٹ کر جوابی حملہ کرتا اور انھیں تباہ کر دیتا۔ لہٰذا آنحضرت صلعم نے نہایت دانشمندی سے کام لیا کہ دشمن کا تعاقب کر کے اس پر حملہ نہیں کیا اور اپنی طاقت کو وہیں مجتمع رکھا۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مثلاً صلاح الدین ایوبی کے سواروں کے ہاتھوں صلیبی نائٹوں کا حشر۔ صلاح الدین ایوبی کے سوار دھوکہ دے کر صلیبی نائٹوں کو بہت دُور نکال لے گئے۔ سوار ہلکے پھلکے تھے اور صلیبی نائٹ غرقِ آہن ہونے کی وجہ سے بوجھل۔ لہٰذا جب موقعہ دیکھ کر مسلمان سوار ان پر پلٹے، تو صلیبی پیادوں کی حالت انتہائی نازک تھی۔ آسانی سے نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے سواروں نے پہلے تو انہیں تیروں کا نشانہ بنایا۔ پھر نیزے لے کر ٹوٹ پڑے اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ باقی ماندہ صلیبی واپس آئے تو سوار کامیاب اور وہ شکست خوردہ تھے۔ آتے ہی انہوں نے صلیبوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس طرح تثلیث پرستوں کے لشکر کا حتیم (Hatim)

کے مقام پر قلع قمع کر کے دیارِ اسلام کو پاک کر دیا؛

جنگ کے بعد بدر میں قیام کی مصلحت واضح ہو جانے کے بعد اب یہ سوال باقی رہتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مشرک قیدیوں کے ساتھ لطف و رحمت کا سلوک کیوں کیا تو اس کا جواب قدرتی طور پر یہ ہے کہ آپ حسنِ اخلاق کا نمونہ تھے؛

جنگ کے قیدیوں کے ساتھ رحمدلی اور شرافت کے برتاؤ کی بنیاد آپ ہی نے رکھی۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک امتیازی خوبی تھی۔ دنیا ساری ترقیوں کے بعد بھی آج اس معاملہ میں تنگ نظری تعصب، اور جہالت کی اسی تاریکی میں ہے۔ جس میں کبھی صدیوں پہلے تھی۔ اسلام اور بانیٔ اسلام اس کو دُور کرنے کے لئے آئے تھے۔ نہ کہ اسے قائم و دائم رکھنے کے لئے؛

اگر سپاہیوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ دشمن ان کو زندہ نہ چھوڑے گا تو وہ آخری دم تک مجبوراً لڑتے ہیں تاکہ بجائے دشمن کے ہاتھوں قتل ہونے کے کسی کو مار کر مریں۔ اگر وہ فوج جس میں ایثار کا جذبہ کم ہو یا نظم کمزور ہو اور اس کو معلوم ہو جائے کہ ان کا دشمن ان کے ساتھ جبر کی حالت نہیں نرمی کا برتاؤ کرے گا تو وہ عزم سے نہیں لڑتے۔ مثلاً اطالوی سپاہی لاکھوں کی تعداد میں لڑائی کئے بغیر اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود بخود قید ہو گئے۔ ان کا مقولہ تھا کہ جان بچی، لاکھوں پائے! وہ اپنی عافیت کو عزیز سمجھتے تھے؛

بہر حال جنگِ بدر کے تمام واقعات و شواہد اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ جنگ میں کامیابی حملہ آوری کی پوزیشن سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دفاع کا بہترین اور صحیح ترین طریقہ یہ ہے کہ پہلے دشمن پر حربی پیشقدمی حاصل کی جائے پھر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اس پر ایسا بھرپور وار کیا جائے کہ سنبھل نہ سکے۔ یہ حربی پیشقدمی اور یہ دفعۃً حملہ اس وقت ممکن ہوتا ہے۔ جب دفاعی سیاست کے منصوبہ میں فنِ حرب کے اس اصول کو مدنظر رکھ کر کام کیا جائے۔ دفاعی منصوبہ کی تیاری کے وقت سب سے ضروری امر یہ ہے کہ ملک کے تمام وسائل دفاعی مقصد کے لئے وقف ہوں۔ پھر یہ دیکھا جائے، کہ اس پر عمل کرنے کے لئے کتنی فوج کی ضرورت ہے کتنی میدانِ کارزار میں ہمارے سپہ سالار کے ہاتھ میں ہوگی اور کتنی اندرونِ ملک محفوظ۔ کون سا میدانِ جنگ ہمارے حالات کے

مطابق ہوگا اور اپنی فوج کے آلاتِ حرب وضرب اور سامانِ خور دونوش کا کیا انتظام ہوگا۔ اس طرح سپہ سالار کو اپنی طاقت کے صحیح اندازہ لگانے کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ اور اس کے مقابلہ میں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ دشمن کی طاقت اور وسائل کیا ہیں۔ اس کے تمام حالات کا بھی صحیح صحیح علم ہونا بہت ضروری ہے۔ زمین کے حالات، اس کا نشیب وفراز اور دوسری تمام باتیں ٹھیک ٹھیک معلوم ہونی چاہئیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم غزوہ سے پہلے بدر کے مقام کو کئی دفعہ دیکھ چکے تھے۔ اور لشکرِ اسلام وہاں نقل وحرکت کر چکا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دفاعی منصوبہ میں ان امور کی کتنی بڑی اہمیت ہے اور ان کی تکمیل وانجام دہی حصولِ مقصد کے لئے کتنی ضروری ہے +

ان کے علاوہ دفاعی منصوبہ میں جن باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں کہ حریف و مقابل کن باتوں میں ہم سے آگے ہے، کن امور میں فضیلت رکھتا ہے اور ہم اس کا کس طریقہ سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہماری برتری اور فضیلت کن معاملات میں ہے اور اس سے کس طرح صحیح کام لیا جاسکتا ہے +

مگر ان سب کے باوجود منصوبہ کا سادہ ہونا ضروری ہے تاکہ اس کو حسبِ حالات بدل کر زیادہ مفید ونتیجہ خیز بنایا جاسکے +

بدر کے بعد

غزوۂ بنی قینقاع

جن دنوں لشکرِ اسلام بدر کے غزوہ میں مصروف تھا۔ مدینہ کے یہودیوں نے اپنی خباثت کا ثبوت دیا۔ انھیں خیال تھا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ابوجہل کا لشکرِ عظیم ہے۔ اس لئے وہ کامیاب رہے گا۔ اس لئے مسلمانوں سے منافقت اور قریش کی خیر خواہی کے جذبات کی بنا پر انہوں نے ایسا مفسدانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ جس سے مشرکین کی فتح کی صورت میں وہ یہ کہہ سکیں کہ ہم تو تمہارے ہی خواہ اور ہمدرد ہیں مسلمانوں سے عطوفت اور پناہ و تحفظ کا معاہدہ محض نمائش کے لئے تھا:

چنانچہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لشکرِ اسلام کی غیر حاضری میں عین جہاد کے وقت کوچہ و بازار میں اکیلی دکیلی مسلمان عورتوں کو چھیڑنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ ایک یہودی نے کسی عورت پر دست درازی بھی کی۔ جس پر مسلمانوں کو سخت طیش آیا۔ اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اس سے مسلمانوں اور یہودیوں میں برہمی پیدا ہوگئی:

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر سے واپس تشریف لائے تو یہودیوں سے معاہدہ کی خلاف ورزی کا جواب طلب کیا۔ مگر بنی قینقاع نے جو شرارت میں پیش پیش تھے۔ نہایت گستاخانہ جواب دیا اور کہا کہ مکّہ والوں پر فتح پا کر آپؐ غرور کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے مقابلہ پر آئے تو آپؐ کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے معاہدے کی تحریر چاک کر کے آنحضرتؐ کے سامنے پھینک دی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان باغیوں کے خلاف فوری کارروائی کا حکم

دیا۔ چنانچہ ان کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پندرہ شب کے محاصرہ کے بعد مجبور ہو کر انہوں نے صلح کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے اس شرط پر صلح کی کہ بنی قینقاع مدینہ سے نکل جائیں اور تمام اسلحہ اور آلاتِ زراعت مسلمانوں کے حوالہ کر دیں۔ چنانچہ محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ بنی قینقاع مدینہ سے نکل کر خیبر چلے گئے۔ اس غزوہ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اس میں سے پہلی مرتبہ آنحضرتؐ نے اپنا حصّہ لیا۔ یہ آپؐ کا پہلا خمس شمار کیا جاتا ہے۔

ابوسفیان کا تعاقب

جنگِ بدر میں لشکرِ قریش کو جو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اس نے سردارانِ قریش کی قوت واثر کو بہت نقصان پہنچایا۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے مقتولینِ بدر کا سوگ منانے کی ممانعت کر دی۔ ابوسفیان نے مکّہ واپس آ کر اپنے مقتول عزیزوں کا غم منانے کی ممانعت کر کے اس بات کا اعلان کیا کہ جب تک میں اپنے بھائیوں کا بدلہ نہ لے لوں گا۔ چین سے نہ بیٹھوں گا۔ اور اپنے اوپر عیش و راحت کی ہر چیز حرام رکھوں گا۔

اس قسم کو پورا کرنے کے لئے وہ دو سو شتر سوار لے کر مسلمانوں کے علاقہ میں لوٹ مار کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمانوں کے پاس سوار فوج کافی نہیں اس لئے وہ لوٹ مار اور قتل و غارتگری کر کے واپس آ جائے گا۔

چنانچہ معمول کے خلاف اس نے نجد کا راستہ اختیار کیا اور کوہ نبت پر جو مدینہ سے تقریباً ایک منزل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ قناۃ کی چڑھائی پر پہنچ کر مع شتر سواروں کے ٹھہرا۔ اور رات کے وقت چھپ کر مدینہ پہنچا اور دو نو سائے قبائل سے ملا۔ اور حالات معلوم کر کے اپنے پڑاؤ پر واپس آ گیا۔ اس کے بعد اس نے کئی قبائل کو آنحضرتؐ کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی۔ مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

دوسرے دن اس نے اپنے کچھ آدمیوں کو مدینہ کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے مدینہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر دو مسلمانوں کو جو کاشت کر رہے تھے قتل کیا۔ اور ان کے کھجوروں کے باغ کو آگ لگا کر بھاگ گئے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو اس واقعہ کی خبر ملی تو خود دشمن کے تعاقب کے لئے نکلے اور قرقرۃ الکدر تک آئے۔ مگر ابوسفیان بھاگ گیا اور ستّو کے تھیلے وہیں

چھوڑ گیا۔

قرقرہ الکدر مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے یہاں یہودی رہتے تھے آنحضرتؐ کے لشکر کے آنے سے وہ کچھ ناراض ہوئے مگر فوج کی طاقت کو دیکھ کر خاموش رہے آنحضرت اس کے بعد مدینہ تشریف لے آئے +

نجد کے راستہ کی ناکہ بندی

ابوسفیان کے تعاقب کے کچھ عرصہ بعد ربیع الاوّل کے مہینہ میں نواح نجد کے قبیلہ بنی ثعلبہ نے شرارت کی اور یہ منصوبہ بنایا کہ مدینہ میں لوٹ مار کر کے وہاں کا نظم درہم برہم کر دیا جائے +

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر ملتے ہی ان پر ساڑھے چار سو مجاہدین کے ساتھ اچانک حملہ کیا۔ ناگہانی حملہ سے وہ اتنے بدحواس اور پریشان ہوئے کہ اپنا علاقہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ان کا سردار عثور چھپا رہا۔ اس روز بارش ہوئی تھی۔ چنانچہ جس وقت مجاہدین اپنے کپڑے سکھا رہے تھے تو عثور آنحضرتؐ کو قتل کرنے کے ارادہ سے اپنی جگہ سے نکلا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو استراحت فرما رہے تھے۔ بیدار ہو گئے اور آپؐ کی تکبیر کی آواز سے اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ عثور نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے اس وقت اپنی جان بچائی اور وہاں سے بھاگ گیا انہی دنوں بنی غطفان نے بھی شرارت پھیلانے کی کوشش کی۔ مگر آنحضرتؐ کے پہنچتے ہی صلح کر کے خاموش ہو گئے +

ان مہمات سے آپؐ نے نجد سے آنے والے راستوں اور ان کے آس پاس کے علاقوں کو اچھی طرح دیکھا اور ساتھ ہی یہ اندازہ لگایا۔ کہ:۔

ا ۔ کتنے قبائل جنگ کے موقعہ پر حریف یا حلیف بن سکتے ہیں ؟

ب ۔ علاقہ کے قدرتی حالات حملہ آور کے موافق ہیں یا مخالف ؟

ج ۔ حملہ آور کو کس جگہ روکنا چاہیئے وغیرہ

گویا آپؐ نے بحیثیت سپہ سالار اطرافِ نجد کا پوری طرح جائزہ لے لیا۔ ادھر ابوسفیان اور مکہ والوں نے ساحل اور بدر کا پرانا راستہ چھوڑ کر عراق اور نجد سے شام جانا شروع کر دیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے

خوفِ مزاحمت سے یہی راستہ اختیار کریں گے۔ لہذا آپؐ نے اب اس راستہ کی ناکہ بندی کا انتظام فرمایا:۔

آپؐ نے زید بن حارثہ کے ماتحت ایک مہم روانہ کی تاکہ وہ اس قافلہ کو لوٹ لے جو ابوسفیان کا مال تجارت لیئے جا رہا تھا۔ ابوسفیان خود اس قافلہ کے ساتھ تھا اور اس نے اس علاقہ کے سردار بکر بن وائل کے نامزد راہبر فرات بن حیان کو راہبری و حفاظت کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔ اہلِ مکہ نے اس قبیلہ کی اس خدمت کے صلہ میں ایک کثیر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ابوسفیان کا خیال تھا کہ موسمِ سرما کی وجہ سے اس دشوار گزار راستے کو پانی کی قلت کے باوجود طے کیا جا سکتا ہے۔

فرات بن حیان قافلہ کو ذاتِ عراق کی راہ سے غمرہ لایا۔ جب قافلہ قردۃ نامی چشمے پر پہنچا تو مجاہدین کے لشکر نے اس کو گھیر لیا۔ قبیلہ حیان کے بہت سے لوگ بھاگ گئے۔ ابوسفیان بھی فرار ہو گیا مگر فرات بن حیان گرفتار ہو گیا۔ مسلمانوں کے ہاتھ بطور مالِ غنیمت ایک لاکھ درہم کی چاندی آئی۔ فرات بن حیان ایمان لے آیا۔ اس لئے اسے آزاد کر دیا گیا:۔

اس واقعہ سے اہلِ مکہ کے ہراس میں بے حد اضافہ ہو گیا اور انہیں صاف نظر آنے لگا کہ اب ان کی تجارت ختم ہو گئی۔ ان حالات میں ان کے سامنے دو ہی متبادل صورتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ شکست تسلیم کر لیں۔ دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کر کے اپنی فوقیت قائم کریں:۔

شکست قبول کر لینا ناممکن تھا۔ کیونکہ دولت و ثروت اور طاقت کا گھمنڈ موجود تھا لہذا یہود کے مشورہ سے انہوں نے مخالفت کا آسان منصوبہ یہ بنایا کہ آنحضرت صلعم کے خلاف پروپیگنڈا کیا جائے اور جب تک باقاعدہ جنگ کی نوبت آئے، غلط نمائی، مکر و کید اور دروغ بافی سے آپ کی قدر و منزلت کو کم کیا جائے اور اگر کسی طرح ممکن ہو سکے۔ تو آنحضرتؐ کو قتل کرا دیا جائے:۔

اوّل الذکر منصوبہ کی تکمیل کے لئے قریش نے قابل شعراء کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کیں، تاکہ شعر کی تاثیر سے لوگوں کے جذبات آنحضرتؐ کے خلاف مشتعل کئے جائیں۔ شعراء میں کعب بن الاشرف قابلِ ذکر ہے۔ یہ مدینہ کے نواح میں رہتا تھا۔ پہلے یہ مکّے

گیا اور مُطّلب بن ابی کے یہاں مہمان ہوا۔ جس نے اس کی بڑی تواضع کی۔ وہاں اس نے مختلف عنوانات پر اشعار پڑھ پڑھ کر اہلِ مکّہ کو بہت اشتعال دلایا مثلاً کبھی بدر میں قریش کے مقتولین جنگ کی نوحہ خوانی کرتا اور کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر اتہام طرازیاں اور سب وشتم کرتا مسلمان اس کی ان شنیع حرکات سے سخت متنفر تھے۔ اس نے اس قسم کے اشعار مدینہ میں بھی آکر پڑھے۔ دلآزاری کے اس سلسلے کو ختم کرنے اور آنحضرتؐ کی ذات کو اس قسم کے ناپاک حملوں سے محفوظ کرنے کے لئے محمد بن مسلمہؓ اور دوسرے صحابہؓ نے آپؐ سے اس کے قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ آنحضرتؐ نے اجازت دے دی۔ ان لوگوں کے ساتھ ابو نائلہ بھی تھے جو شاعر تھے۔ ایک دن وہ رات کے وقت اس سے ملنے گئے اور اس کے قلعہ پر دستک دی۔ ابو نائلہ کی آواز سن کر کعب نیچے اُتر آیا۔ دونوں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو شعر سناتے رہے۔ اس کے بعد ابو نائلہ اسے باتوں میں لگا کر قلعہ سے دُور لے گئے جہاں محمد بن مسلمہ اور دوسرے مسلمان انتظار میں تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی اس کا کام تمام کر دیا۔

ابو رافع یہودی بھی ان لوگوں میں سے تھا جو چرب زبان ہونے کے علاوہ مالدار بھی تھا۔ اور آنحضرتؐ کے خلاف نفرت پھیلانے اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں پیش پیش رہتا تھا اس کا طریقہ عام طور پر یہ تھا کہ لوگوں کو رات کے وقت اپنے قلعہ میں جمع کرتا اور من گھڑت قصے کہانیاں سنا کر آنحضرتؐ کے خلاف ورغلاتا۔

اس کا خاتمہ کرنے کے لئے عبداللہ بن عقبہ اور چند دوسرے انصار نے بیڑا اٹھایا۔ ایک دن یہ سب مل کر اور دُوسرے لوگوں میں شامل ہو کر ابو رافع کے مکان میں داخل ہو گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے اُسے قتل کر دیا۔

سلام بن ابی الحقیق بھی اسی گروہِ دشمنان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے قتل کی اجازت خزرج قبیلہ کے انصاری مجاہدین نے حاصل کی۔ اور اس کام کو خوش اسلوبی سے تکمیل تک پہنچایا۔

اس طرح قریش کا یہ منصوبہ اور اس منصوبہ کو جامۂ عمل پہنانے والے ختم کر دیئے گئے اور اس طریقہ سے ختم کئے گئے جس کی تکمیل و تدوین کا سہرا بیسویں صدی کے عقلاء اور ماہرینِ سیاست وعسکریت کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ ہماری مراد جانباز دستے (Commado)

کمانڈو، خفیہ نگاری (Intelligence Service) ففتھ کالم (Fifth column)

یعنی "چالباز دستے" سے ہے۔ ہم انھیں اس زمانہ کی بلکہ دوسری جنگِ عظیم کی ایجاد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ نئی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب سے کام لیا، اور مجاہدینِ اسلام کو ان میں سے ہر ایک فن کی تربیت دی تھی اس کا مفصل تذکرہ کتاب "ہمارا دفاع" میں کیا جا چکا ہے۔ اختصار کے طور پر یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے۔ کہ اگر ۴۵-۱۹۳۹ء کی جنگ میں فریقین ان حربوں سے کام نہ لیتے تو جنگ کے نتائج واثرات کچھ اور ہوتے۔ انہی نے اقوامِ متحدہ کی فوجوں کو کوریا میں مبتلائے جنگ کر رکھا ہے۔ انہی سے کام لے کر ماؤزی تنگ نے چین کو آزاد کرایا ہے اور انہی کے استعمال میں دوسروں کی بھی فلاح وبجاح کا راز پوشیدہ ہے۔ البتہ اس طریقۂ کار میں جذبہ ایثار وفداکاری کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ عزت وآزادی کو عزیز رکھنے والے ملکوں کو یہ بھینٹ چڑھانی پڑتی ہے۔ جو حکومت عوام کی نمائندہ ہوتی ہے اور جہاں باہمی اعتماد اور خدمت واخلاص کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ وہاں ایک طرف تو حکومت زمانۂ امن میں منصوبہ بنا کر اپنے قابل لوگوں کو اس کی تربیت دیتی ہے۔ دوسری طرف عوام کو معتمد علیہ بنا کر آزادئ ملک کے تحفظ کے لئے مختلف مقامات پر اسلحہ وغیرہ کے خفیہ ذخائر رکھتی ہے۔ تاکہ ایامِ جنگ میں اس منصوبہ پر بحسن وخوبی عمل کیا جا سکے۔ جرمنی نے ۱۹۴۰ء میں اس حربہ کو تیار شدہ منصوبہ کے مطابق نہایت دانائی سے استعمال کیا تھا اور فرانس کو دیکھتے دیکھتے اتحادی فوجوں سے خالی کرا لیا تھا۔

روس نے اسی حربہ کو جرمنی کے خلاف نئے طریقے سے استعمال کیا اور نہ صرف ماسکو اور اسٹالن گراڈ سے جرمنوں کو دھکیل کر نکال دیا۔ بلکہ ان کی طاقت کو بھی ختم کر کے رکھ دیا۔

اتحادیوں نے بھی جرمنی کے خلاف یورپ میں اسی حربے سے کام لیا اور نازیت کا کلّی استیصال کر کے فتح حاصل کی۔ اس کو ماؤزی تنگ نے چین میں نئے طور سے جنم دے کر پہلے چین سے امریکہ کے دخل واثر کو ختم کیا اور اب کوریا میں اسی کو نئی نئی شکلوں میں ڈھال کر متحدہ فوجوں کے خلاف جنگ کو طول دے رہا ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور کب بیٹھے گا۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ روس اور چین کی گوریلا فوج کا آغاز جسے "ملکی مجاہد" کہتے ہیں کس طرح ہوا۔ پہلے جانباز دستے اور خفیہ نگار کام میں لائے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں سے پورا کام لیا۔ چنگیز خاں تاتاری نے ان میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور غالباً اس لئے کہ اس کی جنگ عالمگیر پیمانہ کی تھی۔ اس نے ایران وغیرہ کو فتح کرنے کے لئے محمد شاہ کے ملک کے بڑے بڑے شہروں سمرقند و بخارا وغیرہ میں "چالباز دستے" روانہ کئے جو جانباز دستوں اور خفیہ نگاروں کے علاوہ تھے۔ جرمنی نے "چالباز دستوں" کا خوب استعمال کیا۔ روس نے ملکی دفاع کے لئے "ملکی مجاہدین" پیدا کئے اس حربہ کو آج کل بہت سے ملک جنگِ آزادی میں استعمال کر رہے ہیں۔ لہٰذا دفاعی نقطۂ نظر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اُسوۂ عمل نہایت درجہ اہم ہے اور اس پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلامی ممالک میں اسے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے ؎

جامی نشانِ منزلِ مقصود می دہد
اے سالکانِ راہِ طلب اَیْنَ تذہبُون

جنگِ اُحد

مدینے کے مقامی حالات اور آبادی

عہدِ نبوی میں مدینے کی آبادی موجودہ زمانے کی آبادی سے بالکل مختلف تھی۔ اس وقت نہ عالی شان مکانات تھے نہ گنجان محلے۔ مختلف المذاہب لوگ ایک دُوسرے سے ایک ایک دو دو فرلانگ پر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے تھے۔ اس طرح مدینہ اس مجموعۂ دیہات کا نام تھا جن میں بُت پرست، یہودی اور مسلمان سب آباد تھے اور جو جوفِ مدینہ کے تقریباً دس ساڑھے دس میل لمبے اور دس میل چوڑے میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہ میدان چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان میں اُحد کا پہاڑ شمال میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کی شمالی چوٹی جبلِ ثور کہلاتی ہے۔ جنوب میں جبلِ عَیر ہے۔ مدینے کی آبادی جبلِ ثور سے جبلِ عَیر تک پھیلی ہوئی تھی ؛

آنحضرتؐ کے مدینے تشریف لانے سے پہلے پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس طویل و عریض میدان کو جوفِ مدینہ کہتے تھے۔ آپؐ نے ہجرت کے بعد اسے حرم قرار دیا۔ اور اب یہ حرمِ مدینہ کہا جانے لگا۔ میدان کے چاروں طرف ایک دوسری سے متصل بلند پہاڑیوں کا سلسلہ بہت دُور تک چلا گیا ہے جس کی وجہ سے آمد و رفت کے راستے تنگ وادیوں میں سے ہو کر گذرتے ہیں ؛

حرمِ مدینہ کا میدان بھی ہموار نہیں ہے بلکہ اس میں بھی جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جو جنگ میں، ہجوم و دفاع کے اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہیں ؛

قبائل کی بستیوں میں آب رسانی کاریزوں سے ہوتی ہے یا قریب کی وادیوں میں کنویں کھودے گئے ہیں - ہر بستی میں ایک یا دو ایسے سنگی مکانات بنے ہوئے تھے جن میں جنگ کے موقعہ پر عورتیں اور بچے پناہ لے سکتے تھے - اس قسم کی پناہ گاہوں کا رواج عرب سے لیکر پاکستان کے صوبۂ سرحد تک تھا اور سرحدی پٹھانوں میں اب تک ہے۔ یہ مینار نما ہوتے تھے جن پر چڑھ کر دشمن پر گوپیوں سے پتھر وغیرہ پھینکے جاتے تھے - اب گولہ اندازی کی جاتی ہے - عرب میں ان محفوظ مکانوں کو آطام کہتے ہیں - جس قبیلے کی بستی میں آطام زیادہ ہوتے تھے وہ طاقتور اور آسودہ حال تصور کیا جاتا تھا - آطام عموماً دو منزلہ بنائے جاتے تھے مگر بعض قبائل سہ منزلہ اور چہار منزلہ بھی بناتے تھے -

چونکہ مدینے کے قرب و جوار میں لاوا کے سیاہ پتھر بکثرت ملتے ہیں اس لئے آطام کی نچلی منزل سیاہ پتھر کی بنی ہوئی ہوتی تھی - سنگی ہونے کی وجہ سے دشمن اس میں آگ نہیں لگا سکتا تھا - قبائلی بستیاں عام طور پر وادیوں کے قریب ہوتی تھیں اس لئے پانی آسانی سے مل جاتا تھا - اسی وجہ سے بستیوں کے چاروں طرف باغات ہوتے تھے جن کی حفاظت کے لئے پتھر کی چار دیواری ہوتی تھی ؛

ہجرت کے بعد آنحضرتؐ نے جس بستی میں قیام فرمایا وہ ان ساری بستیوں کے وسط میں تھی - اس کا نام یثرب تھا اور اسی کے نام پر بستیوں کا سارا مجموعہ یثرب کہلاتا تھا۔ باغات اور گنجان آبادیاں اس کے مغرب، جنوب اور شمال مشرق میں واقع تھیں - مشرق کی طرف قبا سے اُحد کے قریب تک شمالاً جنوباً زیادہ تر یہودی آباد تھے - جن کے محلے گنجان اور دُور تک مسلسل چلے گئے تھے ؛

یثرب کے شمال مغرب میں بر رُومہ تک وادی العقیق کے کناروں پر بہت سے باغات تھے - بر رُومہ کا یہ علاقہ بھی یہودیوں کے قبضے میں تھا - یہ علاقہ بہت زرخیز تھا - اس میں ہر قسم کے پھل اور اناج کثرت سے پیدا ہوتے تھے ؛

شمالی علاقہ کھلا ہوا تھا مگر اس میدان کی زمین شور ہونے کی وجہ سے اس میں زراعت نہیں ہو سکتی - مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر اسی راستے سے حملہ کا ارادہ کیا اور جنوب کے راستے کو جو دشوار گذار وادیوں اور گھاٹیوں میں سے گذرتا ہے، استعمال نہیں کیا - اس میں لاوے کے پتھر اس طرح حائل ہیں کہ قافلے والے بھی اسے استعمال

نہیں کرتے۔ پانی کی کمیابی اور پتھروں کے تپ جانے کی وجہ سے گرمی ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے۔ پُرانے زمانے میں قافلے جبل عَیر کے مغرب سے وادی العقیق کے ریتلے راستے سے بر رُومہ کے شمال میں غابہ کے قریب جنوب کی طرف مڑ کر وادیٔ قناۃ میں آتے تھے وہاں سے وادیٔ بطحا کے ریت بھرے نالوں میں چل کر مدینے میں داخل ہوتے تھے تاکہ اونٹوں کے پیر زخمی نہ ہوں ؛

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے جبلِ اُحد مدینے کے شمال میں شرقاً غرباً کئی میل تک پھیلا ہُوا ہے اور وادیٔ قناۃ اس کے دامن میں ہے۔ اس پہاڑ سے صرف ایک دشوار گذار پگڈنڈی گذرتی ہے جو نعل کی شکل کی وادی سے ہوکر اس کی بلند چوٹیوں تک چلی گئی ہے۔ یہ وادی ایک مسطح و مُرتفع میدان ہے جس میں دو چشمے بہتے ہیں۔ اسی وادی میں ایک چھوٹا سا پہاڑی ٹیلہ ہے جسے غالباً ان چشموں کی وجہ سے جبل عینین کہتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے یہاں تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا تھا ؛

غزوۂ اُحد کے بواعث

پچھلے ابواب میں لکھا جا چکا ہے کہ ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کی دفاعی سیاست نے قریش مکّہ کے لئے سخت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ ایک طرف معاشی بحران اور تجارتی تعطّل پیدا ہو رہا تھا اور نقل و حمل کے راستے مخدوش بن گئے تھے دوسری طرف وقار و فضیلت کا پندار خاک میں مل رہا تھا۔ بدر کے مقام پر مسلمانوں سے ٹکر لی تو اُلٹی شکست کھائی۔ گویا مقابلہ و محاربہ میں بھی ذلیل ہُوئے لہٰذا آتشِ انتقام اور بھڑکی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی فوراً ڈھائی لاکھ درہم جنگ کی تیاری کے لئے جمع کئے گئے اور تقریباً اتنی ہی رقم سے بدر کے قیدیوں کو چھڑایا گیا۔ مکّے میں رضاکار فوج کی تیاری کے علاوہ سرداران قریش نے اپنے نقیبوں اور نمایندوں کو قبائل عرب میں بھیج کر انہیں بھی مدینے پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس طرح ابن ہشام کے بیان کے مطابق ایک سال کے عرصے میں تین ہزار کا لشکرِ جرّار تیار ہُوا جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو اسپ سوار شامل تھے۔ اہلِ مکّہ نے اس سے پہلے اتنا بڑا لشکر نہیں دیکھا تھا۔ قریش نے اپنے غلاموں کو بھی یہ لالچ دے کر فوج میں شامل کر لیا کہ جو بہادری اور پامردی سے لڑے گا

اُسے آزاد کر دیا جائے گا۔ ان غلاموں میں ایک غلام وحشی تھا جسے بھالا مارنے میں کمال حاصل تھا؛

آنحضرتؐ کفار کی ان تیاریوں سے غافل نہ تھے۔ آپ کے خفیہ پرچہ نویس آپ کو برابر کفار کی تیاریوں کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ مسلمانوں کی حالت خدا کے فضل اور آنحضرت کے تدبّر و دانائی کے باعث بہتر ہو چکی تھی۔ جب قریش کا لشکر کیل کانٹے سے درست ہو گیا تو اُنہوں نے مقتولینِ بدر کی بیواؤں اور نزدیبی رشتہ دار عورتوں نیز بڑے بڑے سرداروں کی بیویوں کو ساتھ لے کر کوچ کیا تاکہ وہ رجز خوانی کر کے اہلِ لشکر کو جوہرِ مردانگی دکھانے پر مجبُور کریں۔ لشکر نے یہ سفر بارہ دن میں طے کیا اور سخت دشواریوں اور مشکلات کے بعد غابہ کے قریب پڑاؤ ڈالا تاکہ چارہ اور پانی سے اونٹ اور گھوڑے تازہ دم ہو جائیں۔ یہاں یہ چیزیں افراط سے ملتی تھیں۔ یہاں سے چل کر لشکرِ کفار جبلِ رومات کے قریب خیمہ زن ہُوا؛

آنحضرتؐ کے خفیہ نگار لشکر کی نقل و حرکت کی خبریں برابر آنحضرتؐ کو پہنچا رہے تھے۔ اور ان کی بنا پر آپ مدافعت کی پوری تیاری کر چکے تھے۔ جب یہ لشکر ذوالحلیفہ پہنچا تو جانباز مسلم دستے جاسوسی کے لئے اس میں شامل ہو گئے تاکہ آنحضرت کو تمام ضروری خبریں بروقت مل سکیں؛

جب کفار اُحد کے قریب آ گئے تو آنحضرت نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ عبداللہ بن ابی بن ابی سلول نے مشورہ دیا کہ آپؐ مجاہدین کو لے کر مدینے سے باہر مقابلہ کریں۔ بعض صحابہؓ نے رائے دی کہ مدینے میں قلعہ بند ہو کر لڑنا مناسب ہے کیونکہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ آنحضرت نے اپنی رائے کسی پر ظاہر نہ فرمائی۔ البتہ جنگ کے لئے تیار ہو جانے کا حکم صادر فرمایا۔ آپؐ کے اِس سکوت پر کچھ لوگوں کو حیرت ہُوئی اور اُنہوں نے اپنے خیالات میں اس کا اظہار بھی کیا مگر جلد ہی سب اِس تردّد پر نادم ہُوئے۔ مدینے سے آنحضرتؐ کی سالاری میں ایک ہزار مجاہدین روانہ ہُوئے۔ جب لشکرِ اسلام شواط پہنچا تو عبداللہ بن ابی بن ابی سلول جو بظاہر مسلمان اور بباطن منافق تھا اپنے قصورِ فہم یا منافقت کی بناء پر آنحضرت صلعم کی اس نقل و حرکت کو نہ سمجھ سکا اور اس نے کہنا شروع کیا کہ

نمبر ۶

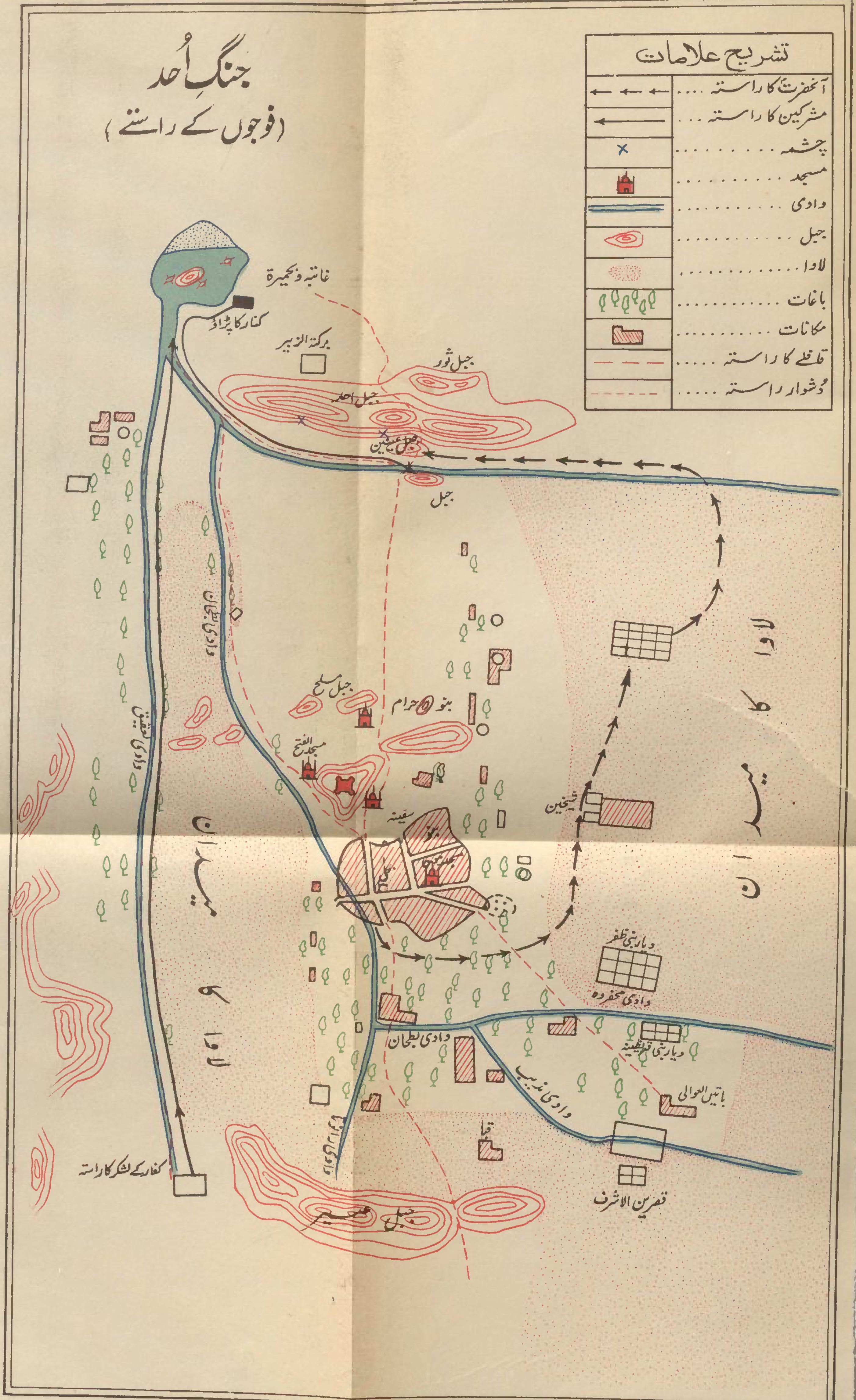

جنگِ اُحد
(فوجوں کے راستے)
تشریح علامات
آنحضرت کا راستہ
مشرکین کا راستہ
چشمہ
مسجد
وادی
جبل
لاوا
باغات
مکانات
قافلے کا راستہ
دشوار راستہ
کفار کا پڑاؤ
برکۃ الزبیر
جبل ثور
جبل احد
جبل عینین
جبل
وادی بطحان
جبل سلع
بنو حرام
مسجد الفتح
سقیفہ
شیخین
دیار بنی ظفر
دیار بنی قریظہ
وادی مذینب
قبا
جبل عیر
کفار کے لشکر کا راستہ

ہمیں کہاں لیجایا جا رہا ہے۔ ہم ایسی جگہ نہیں لڑیں گے۔ جب اس کی باتوں پر کسی نے توجہ نہ کی تو باغی ہوگیا اور اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر مدینے واپس چلا گیا۔ ابو جابر السلمی اپنے رفیق عبداللہ بن ابی کو واپس لانے کے لئے روانہ ہُوا مگر عبداللہ کے لشکر والوں نے اسے پکڑ لیا اور اسے بھی اپنے ساتھ مدینے لے گئے۔ بنو سلمہ اور بنو حارثہ بھی عبداللہ کے ساتھ واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے مگر بعد کو انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ آنحضرت صلعم باقی لشکر کو لے کر مقام شیخین تشریف لائے اور فوج کا معائنہ فرمایا۔ یہاں آپ نے بعض لوگوں کو جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔ انہیں الگ کر کے آپؐ دیار بنی حارثہ پہنچے۔ وہاں سے آپ نے ایک قابل اور تجربہ کار رہبر کو ساتھ لیا تاکہ لشکرِ اسلام کی ایسے خفیہ راستے پر رہبری کرے کہ دشمن کو خبر نہ ہو اور وہ کفار کے عقب میں جبلِ اُحد کے درّہ میں پہنچ جائے۔ ابو حثمۃ الحارثی نے اس کام کا بیڑہ اُٹھایا اور لشکرِ اسلام کو بنو حارثہ کے پتھریلے میدان سے لے کر ان کھیتوں میں آیا جو مربع بن قیظی کی ملک تھے یہ آدمی اندھا تھا۔ جب اس نے شور مچایا تو کچھ مجاہد اسے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے مگر آنحضرت صلعم نے روک دیا۔ مجاہدین نے اسے صرف اتنا مجروح کیا کہ وہ دشمن کے کیمپ میں جا کر خبر نہ کر سکے۔ اس طرح آنحضرتؐ کی فوج جبلِ عینین کے چشموں کے پاس پہنچ گئی۔ اس مقام پر جبلِ اُحد فوج کے عقب میں تھا اور سامنے جبلِ عینین۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے حکم دیا کہ جب تک اجازت نہ دی جائے لڑائی کا آغاز نہ کیا جائے؛

صف آرائی اور مورچہ بندی

کفار نے اپنے لشکر کی صف بندی اس طرح کی کہ سواروں کے ایک حصے پر خالد بن ولید کو افسر مقرر کر کے میمنہ کے عقبی جانب متعین کیا اور عکرمہ بن ابی جہل کو باقی رسالے کا افسر بنا کر میسرہ پر مقرر کیا؛

آنحضرت صلعم نے بنی عمرو بن عوف کے سردار عبداللہؓ بن جبیر کو قادر تیر اندازوں کا افسر بنا کر جبل عینین کے قریب تعینات کیا۔ مصعبؓ بن عمیر کو عَلَم دیا گیا، سواروں کا

جو مختصر سا دستہ تھا وہ زبیرؓ کے ماتحت کیا گیا اور اس کی حفاظت کے لئے بھی کچھ تیر انداز مقرر کئے گئے۔ تیر اندازوں کو تاکیدی حکم دیا گیا کہ جنگ کے حالات خواہ موافق ہوں یا مخالف وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ انہیں بتایا گیا کہ تمہیں صرف اس لئے یہاں متعین کیا گیا ہے کہ دشمن کا رسالہ ہمارے لشکر کے عقب پر حملہ نہ کر سکے۔ ایک اور مختصر سا دستہ آنحضرتؐ نے جبلِ اُحد کے عقب میں متعین فرمایا تاکہ کفار درّہ میں سے نکل کر لشکرِ اسلام پر حملہ آور نہ ہو سکیں اور اگر کوئی آدمی میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے تو اسے پکڑ لے۔

آغازِ جنگ

جنگ کا آغاز مشرکین کی طرف سے ہوا اور ان کی طرف سے خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل آگے بڑھے۔ آنحضرتؐ نے اپنے رسالے کے فوراً دو حصے کئے۔ ایک حصے کو زبیرؓ کے ماتحت اپنی جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا اور دوسرے کو جبلِ عینین کی طرف بڑھنے کا حکم فرمایا۔ دشمن اس جنگی چال کو مطلق نہ سمجھ سکا۔ خالد بن ولید عکرمہ کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ عکرمہ غالباً اس وقت مسلم رسالے کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ لہٰذا حملہ کے لئے پیش قدمی کرنے کی بجائے اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ خالد اپنے دستے کو لے کر تنہا آگے بڑھا تو دونوں طرف کے تیر اندازوں کے تیروں کی بوچھاڑ سے اسکے سواروں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ٹھیک اُسی وقت آنحضرتؐ نے زبیرؓ کو حملے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ دوسرا دستہ درّہ کی طرف سے خالد کے میسرہ پر حملہ آور ہوا۔ لہٰذا جب خالد کا رسالہ شکست کھا کر پیچھے ہٹا تو اس کی وجہ سے مشرکین کے لشکر کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس کے آثار سب سے پہلے مشرکین کی عورتوں کے خیمہ میں نظر آئے۔ اسلامی رسالہ کے دستوں نے عکرمہ کے رسالے پر حملہ کر کے اسے بھی بھگا دیا۔ جو قادر انداز بلندی پر تعینات تھے انہوں نے دشمن کو وادئ قناۃ کی طرف پیچھے دھکیل دیا۔ اسی کے ساتھ لشکرِ اسلام نے ہلّہ بول دیا۔ ہنگامۂ کارزار اس طرح گرم ہوا تو کفار کی عورتوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں نے اسے اپنی فتح سمجھ کر بلا اجازت لوٹ مار شروع کر دی۔ تیر اندازوں نے دیکھا تو وہ بھی لوٹ مار کے لئے اپنی جگہ چھوڑ کر عورتوں کے پڑاؤ کی طرف لپکے۔ انہوں نے بلندی پر سے نہ صرف کفار کے رسالے کو بھاگنے

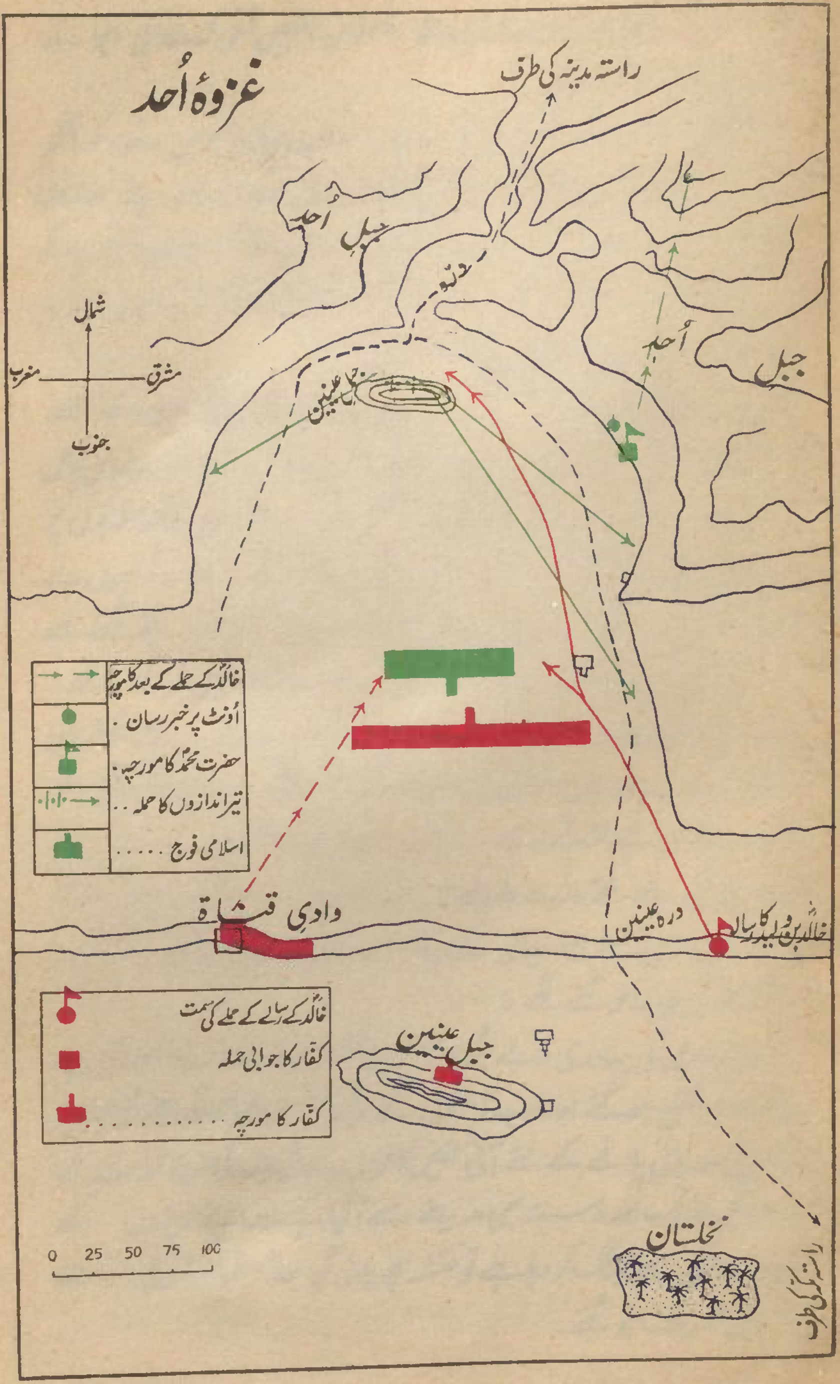
غزوۂ اُحد
راستہ مدینہ کی طرف
جبلِ اُحد
مدینہ
شمال
مشرق
مغرب
جنوب
جبل عینین
اُحد
جبل
خالدؓ کے حملے کے بعد کا مورچہ
اُونٹ پر خبر رساں
حضرت محمدؐ کا مورچہ
تیر اندازوں کا حملہ
اسلامی فوج
وادیِ قناۃ
درہ عینین
خالد بن ولید کا رسالہ
خالد کے رسالے کے حملے کی سمت
کفار کا جوابی حملہ
کفار کا مورچہ
جبل عینین
نخلستان
راستہ مکہ کی طرف
0 25 50 75 100

دیکھا تھا بلکہ لشکر کو بھی پسپا ہوتے دیکھا تھا۔ مسلمان انہیں قتل کرنے کی بجائے لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔

اس غلطی و کمزوری کو خالد کی تیز نظر نے فوراً بھانپ لیا۔ اس نے دیکھا کہ تیر اندازوں نے اپنے مورچے چھوڑ دئے ہیں لہٰذا وہ برق رفتاری سے اپنے سواروں کو لے کر پلٹا اور پوری قوت سے جوابی حملہ کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان افراتفری کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ حضرت حمزہؓ نے کچھ آدمیوں کو لے کر جوابی حملہ کیا مگر وہ وحشی غلام کے نیزے سے شہید ہو گئے۔

باقی کفار نے جب خالد کے حملہ کی یہ کامیابی دیکھی تو وہ بھی پلٹے۔ ان کے حملے نے مسلمانوں کے لشکر کو اور بھی درہم برہم کر دیا۔ اس وقت آنحضرتؐ اپنے آس پاس کے آدمیوں کو لے کر پہاڑ کی بلندی کی طرف بڑھے اور ایک جگہ مورچہ بنا کر مشرکوں پر پتھروں اور تیروں کی بارش کر کے ان کے حملوں کو پسپا کرتے رہے۔ انہوں نے آنحضرتؐ کو قتل کرنے کے لئے پیہم کئی حملے کئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ پتھر لگنے سے آپ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے تھے اور آپ ایک گڑھے میں گر گئے تھے۔ آپ کے زخمی ہوتے ہی مشرکین نے شور مچایا کہ محمدؐ مارے گئے۔ یہ آواز سنتے ہی مسلمانوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ مگر جو لوگ میدانِ جنگ میں تھے وہ بڑی بے جگری سے لڑتے رہے۔ اس بہادری کو دیکھ کر مشرکوں نے سوچا کہ فتح ہماری ہو ہی چکی ہے۔ محمدؐ مارے جا چکے ہیں لہٰذا ان لوگوں سے لڑ کر اپنی جانیں ضائع کرنا بیکار ہے اس لئے ابوسفیان کے پکارتے کے باوجود وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر لشکر گاہ کی طرف لوٹنے لگے۔

ادھر مجاہدین کی بہادری و بے جگری کا اثر ان منتشر ہو جانے والے مسلمانوں پر یہ ہوا کہ وہ پھر مجتمع ہو گئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان عورتیں جو زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی اور پانی پلانے کے لئے آئی تھیں کافروں سے شیروں کی طرح لڑ رہی ہیں، مسلم خواتین کا ایک اور دستہ بھی مدینے سے آ گیا ہے اور اپنے عزیزوں کے شانہ بشانہ دشمن سے جنگ کر رہا ہے تو نقشہ پھر بدل گیا اور مسلمان تلافیٔ مافات میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

اس پورے معرکہ میں اسلامی جھنڈا کسی وقت بھی سرنگوں نہیں ہوا ۔ جھنڈے کو اونچا رکھنے اور آنحضرت صلعم کی جان کی حفاظت کے لئے غزوۂ اُحد میں مجاہدین نے جس جانبازی اور ایثار کا ثبوت دیا وہ ابد تک یادگار رہے گا ۔ یقیناً یہ حضرت اسمٰعیلؑ کے اس ایثار سے کسی طرح کم نہیں جس کی یاد ہم ہر سال عید قرباں کی صورت میں مناتے ہیں ۔ مثلاً جس وقت کفار و مشرکین نے آنحضرتؐ کو تیروں کا نشانہ بنانا چاہا تو آپ کے جاں نثاروں نے اپنے جسموں سے ڈھال کا کام لیا ۔ اسی طرح اگر ایک علمبردار شہید ہوگیا تو علم کے گرنے سے پہلے ایک اور مجاہد نے اسے تھام لیا ۔ آنحضرت صلعم بھی انتہائی ماندہ اور زخمی ہونے کے باوجود دشمن سے برابر لڑتے رہے ۔ بھالے سے لڑنے میں آپ نے اس کمال کا ثبوت دیا کہ مسلمانوں کی ہمتیں دو چند ہوگئیں ۔ لُوٹ مار میں عجلت اور تیراندازوں کے مورچوں سے ہٹ جانے کی وجہ سے لشکرِ اسلام کو سخت نقصان پہنچا تھا مگر آپ انتہائی مُستقل مزاجی سے باقی آدمیوں کو ساتھ لے کر جنگ کرتے رہے ۔

کفار نے یہ سمجھ کر کہ محمدؐ مارے گئے اپنی دانست میں جنگ جیت لی تھی لیکن چونکہ باقی ماندہ مجاہدین برابر بے جگری سے لڑ رہے تھے اس لئے ابوسفیان کو کچھ شُبہ ہوا ! وہ ایک دستہ لے کر اس بات کی تصدیق کرنے کے لئے پہاڑ پر چڑھا کہ محمدؐ کام آئے یا نہیں ۔ وہاں جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ آپؐ نہ صرف حیات ہیں بلکہ برابر جوابی حملے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی جمعیت برابر بڑھتی جا رہی ہے تو اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ میدان سے نکل جائے تاکہ یہ کہہ سکے کہ میدان اس کے ہاتھ رہا اور جنگ کا اختتام میرے بل بوتے پر ہوا ۔ لیکن پہاڑ سے واپس آتے وقت اس نے مسلمانوں سے بآوازِ بلند کہا کہ اگلے سال پھر تم سے بدر میں مقابلہ ہوگا ۔ جواب میں مسلمانوں نے بھی کہا ہم ضرور تم سے بدر میں لڑیں گے ۔ اس طرح بہ حیثیت سالارِ فوج آنحضرتؐ نے حریف سالار سے اپنے عزم و شجاعت کا اعتراف کرا لیا اور ہمت و جوانمردی ، عزم و استقلال اور شجاعت و دلیری کی زندہ مثال بن کر عارضی نقصان و ہزیمت کو پھر فتح میں تبدیل کر دیا ۔ یہ آپ کا بہترین کارنامہ ہے ۔ ایک طرف کفار اپنے مقتولین کی لاشیں اُٹھائے بغیر میدان چھوڑ کر اپنے پڑاؤ کی طرف بھاگ رہے تھے ۔ دوسری طرف اسلامی

لشکر اپنے سپہ سالار کی اولوالعزمی کی بدولت دوبارہ اسلامی جھنڈے کے گرد جمع ہو رہا تھا +

جب دشمن کی مزاحمت ختم ہو گئی اور ابوسفیان بھی واپس چلا گیا تو آنحضرتؐ نے علی ابن ابی طالب کو ایک دستہ دے کر دشمن کے لشکر کی طرف یہ معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا کہ اب وہ کیا کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پھر مدینے پر حملہ نہ کرے +

حضرت علیؓ نے دیکھا کہ کفار و مُشرکین خود تو اونٹوں پر سوار ہیں اور گھوڑوں کو کوتل کر دیا ہے۔ اس کا مطلب صاف یہ تھا کہ وہ واپسی کے طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں تاکہ گھوڑے صعوبت سے بچیں اور خود بھی آرام سے سفر کر سکیں۔ اگر وہ مدینے پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کرتے تو اُن کا رسالہ گھوڑوں پر سوار ہو کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ روانہ ہو چکا ہوتا +

حضرت علیؓ کی اس اطلاع پر آپؐ نے مقتولوں اور زخمیوں کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ مشرکین نے گو مسلم شہداء کی لاشوں کی بے حرمتی کی تھی مگر آپ نے ان کے مُردوں کی بے حُرمتی کرنے سے منع فرمایا اور کہا کہ مشرکین کی ناجائز حرکتیں معاف کر دینی چاہئیں اور صبر سے کام لینا چاہئے۔ اس کے ساتھ آپ نے ان کے مُردوں کے دفن کرنے کا بھی انتظام کیا +

مُسلم خواتین کا جذبۂ ایثار

شہیدانِ اسلام کے انفرادی واقعاتِ شہادت اور ایثار پیشگی کو چھوڑ کر یہاں مُسلم خواتین کے جذبۂ ایثار اور صبر و تحمل کی ایک مثال پیش کرنا مناسب ہو گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ لشکرِ اسلام کے فدائیوں کے علاوہ عام مُسلم خواتین کے جذبات کا کیا عالم تھا۔

لشکرِ اسلام کی ہزیمت اور آنحضرت صلعم کی شہادت کی خبر مدینے پہنچی تو دوسری عورتوں کے ساتھ انصار میں سے ایک خاتون بھی میدانِ جنگ میں پہنچیں جن کا باپ، شوہر اور بھائی تینوں شہید ہو چکے تھے۔ مگر اُنہوں نے آتے ہی پوچھنا شروع کیا کہ رسُول اللہ کا کیا حال ہے۔ اُن سے کہا گیا کہ تمہارا باپ شہید ہو گیا' اُنہوں نے کہا

کوئی بات نہیں، مگر رسول اللہ کا کیا حال ہے؟ کسی نے کہا تمہارا شوہر بھی شہید ہو گیا۔ اُنہوں نے کہا، مجھے اس کی فکر نہیں یہ بتاؤ کہ رسول اللہ کیسے ہیں، اُنہیں بتایا گیا کہ تمہارا بھائی بھی شہید ہو گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ خدا کی راہ میں یہ بھی بڑی بات نہیں۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ وہ حفظ و امان میں ہیں۔ یہ سُن کر انہوں نے کہا کہ جب آپ موجود ہیں تو سارے غم ہیچ ہیں +

اسی طرح حضرت حمزہؓ کی لاش کو دیکھنے کے لیئے ان کی بہن صفیہ مدینے سے آئیں۔ آنحضرت نے حمزہؓ کے بیٹے سے فرمایا کہ انہیں روک دو۔ زبیرؓ نے فرمانِ رسولؐ کے مطابق انہیں روک دیا۔ اس پر صفیہؓ نے کہا میں نے سنا ہے کہ میرے بھائی کا مُثلہ کیا گیا ہے مگر خدا کی راہ میں یہ ادنیٰ بات ہے۔ میں رسولؐ کا حکم مان کر صبر سے کام لوں گی۔ اس پر آپؐ نے دیکھنے کی اجازت دے دی۔ ابو سُفیان کی بیوی ہندہ نے حمزہؓ کا مُثلہ کرنے کے علاوہ پیٹ چاک کر کے ان کا کلیجہ بھی چبالیا تھا۔ جب آپ بھائی کی لاش کے پاس لائی گئیں تو آپ نے اسے غور سے دیکھا۔ پھر انکے حق میں دُعا مانگی، مُطلق گریہ و بُکا نہ کیا۔ اس کے بعد لاش کو دفن کر دیا گیا +

مدینے کو مراجعت اور دشمن کا تعاقب

دوسرے دن ۱۶ر شوال کو آنحضرتؐ مدینے تشریف لائے اور اعلان کے ذریعے تمام مسلمانوں کو دشمن کے تعاقب کا حکم دیا۔ مگر جن لوگوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں ملی تھی انہیں تعاقب میں بھی حصّہ لینے کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ ان کے سپرد مدینے کی حفاظت کی گئی۔ فوراً تمام مسلمان جمع ہو گئے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ مدینے آکر تعاقب کا ارادہ ایک مسلمان بدو کی مخبری کی بنا پر کیا گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ مشرکین اُحد سے نکل کر تھوڑی دور جا کر ٹھہر گئے ہیں اور عتبہ بن ابی جہل اور ابوسفیان کی رائے یہ ہے کہ ہم نے بڑی غلطی کی کہ مدینے پر حملہ نہیں کیا۔ اب ہمیں پلٹ کر مدینے پر حملہ کرنا چاہیئے اس کے بغیر مسلمانوں کی شکست مکمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ابوسفیان اس وقت مدینے پر حملہ کرنے کے لئے اپنی فوج کو ترتیب دے رہا ہے۔ یہ خبر سُن کر آپ نے فوجی تیاری کا اعلان کر دیا۔ مسلمان مجروحین ابھی مرہم پٹی

سے بھی فارغ نہ ہُوئے تھے کہ آنحضرتؐ کے حکم پر مجاہدینِ اسلام پھر جمع ہو گئے۔ آپؐ انہیں ساتھ لے کر حمرالاسد پہنچے۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے بنو خزاعہ کے سردار معبد الخزاعی کو بُلایا۔ یہ آپ کا ہمراز و حلیف تھا۔ یوں تو بنو خزاعہ میں مشرک اور مسلمان دونوں شامل تھے مگر پُورا قبیلہ آنحضرتؐ کا حلیف تھا۔ آپؐ نے اسے مشرکین کے پڑاؤ میں بھیجا تاکہ آپؐ کے منصُوبہ کے مطابق کام بھی کرے اور مشرکین کے حالات سے اطلاع بھی دے +

ابوسفیان مشرکین کا لشکر لئے آ ہی رہا تھا کہ راستہ میں اس کی ملاقات معبد سے ہوئی۔ ابوسفیان نے اس سے راز کی باتیں معلوم کرنے کی کوشش کی۔ معبد نے کہا محمدؐ اپنی جماعت کے ساتھ مدینے سے کئی میل باہر نکل آئے ہیں۔ میں نے ان جیسی شان اور بہادری کا کوئی انسان نہیں دیکھا۔ ان کے لوگوں کے حوصلے بلند ہیں۔ وہ اپنی غلطی پر نادم ہیں اور جو لوگ اُحد کی لڑائی میں شریک نہ ہو سکے تھے اب وہ بھی اس انتقامی لشکر کے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں کا یہ لشکر بڑا زبردست ہے اور وہ بہت جلد تمہارے لشکر پر حملہ کرنے والا ہے۔ انتظار صرف چند حلیف لشکروں کی آمد کا ہے۔ میں تمہیں یہ خبر دینے آیا ہُوں اور میرا خیال یہ ہے کہ وہ یہاں پہنچنے ہی والے ہیں +

ابوسفیان نے کہا کہ ہم بھی ان پر دوبارہ حملے کی نیّت سے جا رہے ہیں۔ مگر پھر کہنے لگا کہ آپ کی رائے کیا ہے۔ معبد نے کہا میں تمہیں رجز کے وہ چند اشعار سُناتا ہوں جو لشکریانِ اسلام نے انتقام لینے کے لئے بنائے ہیں۔ ان سے تم پر مسلم فوج کے ارادوں کا حال خود آشکارا ہو جائے گا۔ یہ کہکر اس نے وہ اشعار سنائے اور کہا رہی تمہارے جوابی حملے کی بات تو میں ہرگز دوبارہ حملے کی رائے نہ دوں گا بلکہ مناسب یہی ہے کہ اُحد میں اپنی فتح مشہُور کر کے آیندہ سال مزید تیاری کے بعد مسلمانوں پر حملہ کرو +

ایک طرف معبد کا یہ رازدارانہ مشورہ' دوسری طرف ہزیمت خوردہ لشکر کے جوابی حملہ و انتقام کے لئے فوراً مدینے سے روانگی اور تعاقب کا یہ جوش و خروش کہ نہ کل کی جنگ کی مصیبت یاد ہے نہ زخموں اور نقصانات کی پروا ہے۔ بڑے ہی حوصلہ مند اور بے جگر لوگ ہیں یہ۔ مشرکین حواس باختہ ہو گئے۔ ابوسفیان نے سوچا کہ اب تک تو ہمارے غلبہ و فتح کی شہرت ہے اب کے مقابلہ ہُوا تو خیر نہیں، مُسلم تیراندازوں اور لشکریوں نے کل جو غلطی کی تھی وہ اب نہیں ہو گی بلکہ اس کی تلافی کی کوشش کی جائے گی۔ یہ سوچ کر

وہ واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی دوران میں ابوسفیان کو خبر ملی کہ معاویہ بن المغیرہ بن ابی عاص اور ابوعزہ الجمحی مسلمانوں کے ہاتھ میں پڑ گئے ہیں تو اس نے اور بھی عجلت کی لیکن عبدالقیس سے جس کا قافلہ مشرکین کے پاس سے گذر کر مدینے کی طرف آرہا تھا کہا کہ اگر تو میرا یہ پیغام محمدؐ کو پہنچا دے گا کہ ابوسفیان کا لشکر مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے کو تیار تھا مگر اس ارادہ کو اس لئے ترک کر دیا ہے کہ اعلان کے مطابق اگلے سال بدر ہی میں ان سے مقابلہ کیا جائے گا تو جب تو عکاظ کے میلے میں آئے گا تو اس کے بدلے تیرے اونٹوں کو چھواروں سے لدوا دوں گا +

جب آنحضرتؐ کو ان چیزوں اور خفیہ نگاروں کی اطلاعات سے یقین ہو گیا کہ مشرکین مکے کو واپس چلے گئے تو تین روز حمراالاسد میں قیام فرمانے کے بعد مدینے واپس تشریف لے آئے اور اس طرح اپنے دفاعی منصوبہ پر عزم و استقلال سے عمل کر کے اُحد کی فتح کو جس میں تیراندازوں کی غلطی سے ہزیمت کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ محکم کر کے لشکرِ اسلام کو حوصلہ مند اور طاقتور بنا دیا۔ اعلان و تیاری کے باوجود مقابلے سے فرار مسلمانوں میں اور بھی جذبۂ خود اعتمادی کی تقویت کا سبب بنا +

استخراجِ نتائج

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا نتائج ہیں جو اس جنگ میں دفاعی حدیث کی حیثیت سے ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں +

سب سے پہلا سبق جو ہمیں ملتا ہے یہ ہے کہ دفاعی منصوبہ اپنے ذرائع و وسائل کے مطابق مرتب کرنا چاہئے یعنی نہایت دور اندیشی و حوصلہ مندی سے اپنے وسائل کو مدِنظر رکھ کر دفاعی منصوبہ ایسا بنایا جائے جو بساط سے باہر نہ ہو۔ اپنی بساط سے آگے بڑھنا اور اس سے زیادہ کے خواب دیکھنا بسا اوقات خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ دانائی اور ہوشمندی کا اقتضاء یہ ہے کہ صرف اُن وسائل کی بناء پر منصوبہ تیار کیا جائے جن پر اپنی دسترس ہو یا ہو سکتی ہو موہوم امیدوں پر ہوائی قلعے تعمیر کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ تقدیر پر بھروسہ کے معنی یہ نہیں کہ تدبیر نہ ہو۔ اگر اس اعتماد پر ضرورت سے زیادہ امیدوں کے محل استوار کئے جائیں گے تو نتیجہ

عموماً مایوسی اور ناکامی کی صورت میں برآمد ہوگا۔ وسائل آج کی مشینی دنیا میں انجن کے تیل کی مانند ہیں اور تقدیر و بساط سے زیادہ اعتماد کو بیٹری اور موٹر کا پٹرول کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسے موٹر کو چلانا چاہتے ہیں جس کے انجن میں تیل بہت کم ہے تو موٹر بیٹری اور پٹرول کی وجہ سے چلنے تو لگے گا مگر اس کا انجن جلد ہی بند ہو جائے گا کیونکہ اس کے پسٹن تیل کم ہونے کی بنا پر جل جائیں گے اور موٹر باوجود پٹرول اور نئی بیٹری کے نہ چل سکے گا۔ دفاعی منصوبے کے موٹر میں انجن کے تیل کا حکم اپنے وسائل اور اپنے افسر و سپاہی ہیں۔ جب ان میں سے کسی میں کمی ہو جاتی ہے تو نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور منصوبہ کا موٹر نہیں چلتا +

آنحضرت صلعم نے اس جنگ میں اپنا دفاعی منقصد دشمن کی شکست بنایا تھا۔ آپؐ کو دشمن کی طاقت اور اس کے منصوبے کا علم خفیہ نویسوں سے ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس دشمن نے آنحضرتؐ کے دفاعی منصوبے کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ مشرکین سمجھتے تھے کہ آنحضرتؐ عبداللہ بن ابی سلول منافق کے مشورہ پر عمل فرمائیں گے۔ اس خبر پر اعتماد کر کے وہ جبلِ اُحد کے درّہ کے جنوب میں جمع ہو گئے تاکہ مدینے سے لشکرِ اسلام کے نکلتے ہی رسالہ سے اس پر حملہ کیا جائے اور اس کی طاقت کو ختم کر دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو اپنے پرچہ نویسوں کے ذریعہ ان سارے منصوبوں کی مکمل اطلاعات مل چکی تھیں لہٰذا آپؐ نے رات کے وقت مدینے سے نکل کر نہایت پیچیدہ اور دُشوار گذار راستہ اختیار کیا یعنی جس راستہ کو مشرکین نے ناممکن تصوّر کر رکھا تھا اُسی سے روانہ ہوئے۔ عبداللہ بن ابی سلول منافق نے جب یہ دیکھا کہ وہ مشرکین کے منصوبے کے خلاف دوسرے راستے پر جا رہے ہیں۔ جسے نہ وہ سمجھ سکا تھا اور نہ معلوم کر سکا تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا تاکہ اگر مشرکین کے ساتھ ایفائے عہد نہ کر سکے تو ان کے خلاف بھی نہ لڑے۔ وہاں سے آپؐ بنو حارثہ کی بستی میں تشریف لے جاتے ہیں جس کے دو مقصد ہو سکتے ہیں۔ اوّل دشمن کو اپنی نقل و حرکت سے بے خبر رکھنا، دوسرے بنو حارثہ کے بعض کمزور دل اور پست حوصلہ لوگوں کے حوصلے بلند کرنا اور لشکرِ اسلام کی قوت و عظمت کا اثر قائم کرنا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ یہاں سے آپ نے اور زیادہ خفیہ راستہ اختیار کیا اور ایسی جگہ مورچہ لگایا جہاں دشمن کے سوار رسالہ کی فوقیت ختم ہو گئی اور اپنے تیراندازوں سے

نہایت موثر طریقے پر کام لے سکتے تھے۔ آپؐ نے دیکھ لیا تھا کہ ہوا پہاڑی درّہ سے میدان کی طرف آئے گی اس لئے اس سے جہاں مسلم تیراندازوں کے تیر دُور تک جائیں گے وہاں دشمن کے تیراندازوں کو مخالف ہوا میں تیر چلانے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ تیراندازوں کو بلندی پر تعینات کرنے سے ان کے تیروں کی پرواز اور بھی لمبی ہو گئی۔ پھر آپ نے انہیں یہ ہدایت کی کہ تیر دشمن پر ۶۰ درجے کے زاویے سے چلائیں تاکہ خاتمۂ پرواز پر عموداً یعنی ۹۰ درجہ کا زاویہ بناتے ہوئے گریں۔ اس طرح وہ مشرکین بھی ان کی زد میں آ گئے جو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی آڑ میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ فی الحقیقت یہی وہ اصول ہے جس پر آج کل ٹرنچ مارٹر یعنی خندقوں پر گولے برسانے والی توپ بنائی گئی ہے۔ آپ نے اپنے تیراندازوں کو یہ بھی حکم دیا کہ خواہ جنگ کے حالات کچھ ہی ہوں وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ تیراندازوں کی حفاظت کے لئے آپ نے ایک دستہ جبلِ اُحد کے دوسری جانب درّہ کی پگڈنڈی پر تعینات کیا۔ گویا زمانۂ جدید کے حربی اصولوں کے مطابق ایسے مضبوط مورچے (Strong Points) یا (Pivots of Manouvre) قائم کئے جن کے بل پر آنحضرتؐ کی فوج حملے کے وقت بحفاظت نقل و حرکت کر سکے اور اگر شکست ہو تو ہاری ہوئی فوج انہی مورچوں پر جمع ہو کر دشمن پر دوبارہ جوابی حملہ کر کے اُسے تباہ کر سکے +

دوسرے لفظوں میں جہاں آنحضرت صلعم نے اپنے دفاعی منصوبہ میں اپنی بساط کو مدِ نظر رکھ کر دُور اندیشی سے کام لیا وہاں مشرکین نے اس کے برعکس طاقت کے پندار میں حربی اصولوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اگر مسلم تیرانداز اپنی جگہ نہ چھوڑ جاتے تو اُحد کا میدان مشرکین کے لئے بدر سے بدتر ثابت ہوتا۔ اسی طرح اگر استخلاصِ کشمیر کی جنگ میں آزاد کشمیر کا لشکر سری نگر کے پاس لُوٹ مار کرنے کی بجائے دشمن کی ہوائی فوج کو اُترتے وقت دبوچ لیتا تو جنگِ کشمیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ آزاد کشمیر کے لشکریوں نے جب لُوٹ کا موقعہ دیکھا تو دشمن کی فوج کو تباہ کرنا بھول گئے۔ مجاہدین کی اس فوج کے افسر خام و ناتجربہ کار تھے۔ لہٰذا سری نگر کی شکست کے بعد ہندی فوج نے آزاد کشمیر کی فوج کو بہت دُور تک دھکیل دیا اور میلوں تک دم نہیں لینے دیا۔ مگر خوش قسمتی سے ہندی فوج کا سپہ سالار ابو سفیان کی طرح عزم و شجاعت نہ رکھتا تھا جس کی وجہ سے یہ فوج تباہی سے بچ گئی ورنہ اس کا زندہ بچ نکلنا دشوار تھا۔

اُحد میں چونکہ آنحضرتؐ جیسے قابل جرنیل کی کمان تھی لہٰذا آپؐ نے جنگ کا پانسہ پلٹتے دیکھ کر نہایت مستقل مزاجی اور اولوالعزمی سے دفاعی منصوبہ کے دوسرے حصے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ آپؐ عام سالاروں کی طرح امان حاصل کرنے کے لئے درّے کی طرف نہیں بڑھے بلکہ پہاڑ کی چوٹیوں کی طرف رُخ کیا تاکہ آپؐ کی فوج خالد بن ولید کے رسالے سے محفوظ ہو جائے اور قبل اس کے کہ مشرکین کی پیادہ فوج اس بلندی پر پہنچے انہیں اپنے بکھرے ہوئے آدمیوں کو جمع کرنے کا موقعہ مل جائے اور وہ اپنے مورچے کو مستحکم کر لیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور وہ کامیاب ہوئے۔ یعنی آنحضرتؐ نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے دفاعی منصوبہ کو تبدیل کیا اور وہ نہایت نازک موقعہ پر اسمیں کامیاب ہوئے اور اس لئے کامیاب ہوئے کہ یہ منصوبہ سادہ اور لچکدار تھا۔ آپؐ جانتے تھے کہ حصولِ مقصد کے طریقے ایک سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کا باہم توازن کر کے ترک و اختیار کا فوری فیصلہ کیا اور مشرکین کی طرح یہ غلطی نہ کی کہ خواہ کچھ کیوں نہ ہو جنگ ضرور کریں گے۔ اس طرح مشرکین اس دفیت کو کھو بیٹھے جو انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ گو ابتداء میں اُن کا منصوبہ صحیح اور صائب تھا مگر جب آنحضرتؐ کی جنگی چال نے انہیں الجھن میں ڈال دیا تو وہ گھبرا گئے۔ آنحضرتؐ نے ایسی جنگی چال چلی جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا یعنی بقول نپولین "دشمن کو جھانسہ دے کر ایسے شش و پنج میں مبتلا کر دینا کہ وہ بدحواسی میں غلط چال چلے اور اس غلط چال سے اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دے"+

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن نے ایسے میدانِ جنگ کا انتخاب کیا جو رسالے کی لڑائی کے لئے بہترین سمجھا جا سکتا ہے (آجکل اس کو ٹینکوں کی لڑائی کے لئے موزوں ترین تصوّر کرنا چاہیئے) یعنی کفار کا خیال یہ تھا کہ جبلِ اُحد ہمارے مورچہ کی پُشت پر ہوگا' وادیٔ قناۃ اور مدینے کے درمیانی علاقے کی ناہموار زمین میں رسالے کو مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کا موقع مل جائے گا' ایسی صورت میں ان کی کامیابی یقینی تھی بالخصوص اس لئے کہ ان کے رسالے کا سالار خالد بن ولید تھا۔ علاوہ ازیں انہیں عبداللہ بن ابی سلول کی منافقت اور غدّاری پر کافی بھروسہ تھا۔ مگر آنحضرت صلعم نے ان کی اس جنگی چال کو اپنی دفاعی سیاست سے بالکل مات کر دیا۔ پھر درّے کے پانی کے چشموں پر قبضہ کر کے مشرکوں کو پانی سے محروم

کر دیا۔ جس کی وجہ سے انہیں اپنے جانوروں کو پلانے کے لئے کئی میل دُور سے جا کر پانی لانا پڑتا تھا۔ تین ہزار فوج، اس کی بار برداری اور رسالے کے جانوروں کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ ان کے لئے روزانہ چارہ اور پانی کی فراہمی ایک بڑا اہم مسئلہ تھا۔ یہ بھی آنحضرتؐ کے دفاعی منصوبہ کی کامیابی تھی۔ بقولِ سُقراط آپ نے دشمن کی فوج کے سامانِ رسد کے انتظامات کو پیشِ نظر رکھ کر ایسا دفاعی منصوبہ بنایا اور اس پر اس طرح عمل کیا کہ دشمن کی عددی فوقیت خاک میں مل کے رہ گئی +

آغازِ جنگ سے قبل آپؐ نے فوج کی تقسیم و ترتیب اس طرح فرمائی کہ میمنہ، میسرو اور عقب سب محفوظ ہوگئے۔ اگرچہ آپؐ کے پاس سوار کم تھے لیکن چونکہ موسم اور فضا کی حالت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا لہٰذا آپؐ نے "سرابِ صحرا" سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ رسالے کے دو حصے کر کے ایک حصّہ کو زبیرؓ کے ماتحت گھاٹی میں چھپا دیا، دوسرے حصّے کے "سراب" سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ اس کی طاقت اصل سے کئی گنا زیادہ معلوم ہونے لگی۔ اس کے لئے آپؐ نے اس کی نقل و حرکت اس طرح رکھی کہ دشمن نے سمجھا کہ وہ اس کے میسرہ کی طرف بڑھ رہا ہے حالانکہ وہ برساتی نالوں میں سے ہو کر دوسرے دستے کے قریب دشمن کے پہلو پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ نے جو فنِ سپہ گری کے ماہر تھے خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ خالد بن ولید یہ سمجھا کہ میدان صاف ہے لہٰذا اس نے حملہ کر دیا تاکہ پیدل مسلم فوج کے میسرہ (بائیں پہلو) کو بیکار کر دے۔ عکرمہ مسلم رسالے کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لئے ٹھہر گیا۔ یہ اسکی بڑی حماقت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد کے رسالے پر جو مسلمانوں کے میسرہ پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا تھا، پہلے تو دو طرف سے تیروں کی سخت بوچھاڑ ہوئی اس کے بعد زبیرؓ کے سواروں نے خالد کے رسالے کے دونوں پہلوؤں میمنہ اور میسرہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ رسالے کو اس مشکل میں پھنسا دیکھ کر خالد نے اپنی غلطی کو محسوس کیا لہٰذا فوراً اسے وادیٔ قناۃ کی طرف لا کر واپس لوٹ گیا۔ اس نرغہ سے نکل جانا خالد جیسے بہادر ہی کا کام تھا اور شاید اسی جنگ کے ان مشاہدات نے آنحضرتؐ کو خالد کی حربی مہارت کا مداح بنا دیا تھا کہ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو اسلامی فوج کے بڑے حصے کے سپہ سالار مقرر کئے گئے +

اس کے بعد زبیرؓ کے سواروں نے عکرمہ کے رسالے پر حملہ کر کے اسے درہم برہم کر دیا پھر پیادہ لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ یہ لڑائی رسالہ (ٹینک) کی جنگ کا بہترین نمونہ ہے۔ کیونکہ مسلم رسالے کے اس حملے نے دشمن کے رسالوں اور پیدل فوج سب میں انتشار پیدا کر دیا۔ مسلم پیادہ فوج نے جو اپنے رسالے کے منصوبے سے اچھی طرح واقف تھی اس کے ساتھ ہی حملہ کر کے دشمن کو شکست دے دی۔

یہاں تک تو جنگ آنحضرتؐ کے حکم اور آپؐ کے منصوبے کے مطابق لڑی گئی مگر اس کے بعد دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک لوٹ مار جس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے، دوسرے دشمن کی پسپائی کے وقت اس کا تعاقب نہ کرنا۔ لوٹ مار کی ہوس میں تیر انداز اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور اس طرح دشمن کو اپنی فوج پر حملہ کرنے کا موقع دے دیا اور پیدل فوج نے دشمن کا تعاقب نہ کر کے دفاعی سیاست کے ایک اہم اصول کی خلاف ورزی کی۔ فاتح فوج کے لئے لازمی ہے کہ جس وقت میدان سے دشمن کے پاؤں اُکھڑ جائیں تو تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ مگر اس میں کامیابی اسی وقت ہوتی ہے جب دشمن کا عزم و بے باکی اور حوصلہ مندی سے تعاقب کیا جائے ورنہ ذرا سی کوتاہی اور غلطی سے بوکھلائے ہوئے دشمن کو سنبھلنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ مشرکین کی یہی غلطی تھی کہ جنگ کا پانسہ پلٹنے پر انہوں نے مُسلم فوج کا تعاقب نہیں کیا اور بالآخر یہ غلطی ان کی بربادی کا باعث بن کر رہی۔ دوسری جنگِ عظیم میں یہی غلطی ہٹلر نے کی کہ اس نے اتحادی فوجوں کو ڈنکرک سے بچ کر نکل جانے کا موقع دیدیا۔ اور پہلی عالمگیر جنگ میں اس کا ارتکاب اتحادیوں نے کیا تھا کہ ۱۹۱۸ء میں جرمن فوج کو ہنڈنبرگ لائنز سے نکال دیا۔ اگرچہ فتح ان کی ضرور ہوئی اور جرمنی صلح کی درخواست کرنے پر بھی مجبور ہوا۔ مگر اس کی فوج موجود و محفوظ رہی۔ اس نے شکست قبول نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ ہٹلر کو جرمن فوج کو انتہائی طاقت ور بنانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد جرمن فوج کا عزم و حوصلہ بلند تھا کیونکہ جہاں اس نے شکستیں کھائی تھیں وہاں اتحادیوں کو شکستیں دی تھیں۔ صلحنامہ پر دستخط کے وقت تک اسکے قبضے میں فرانس کا خاصہ حصہ تھا۔ اتحادی فوج کے کسی سپاہی کا قدم جرمنی کی سرزمین پر نہ پہنچا تھا۔ بالکل اسی طرح اُحد میں مسلم فوج کو وقتی طور پر نقصان ضرور پہنچا

تھا۔ مگر چوٹ برابر کی تھی۔ جہاں مشرکین کے دل میں یہ جذبہ تھا کہ ان مسلم دیوانوں سے لڑکر مفت میں جانیں گنوارہے ہیں وہاں مجاہدین کے دلوں میں عدول حکمی کی تقصیر پر ندامت تھی اور وہ اس داغِ تقصیر کو جلد سے جلد دھو دینا چاہتے تھے لہٰذا جان کی بازی لگانے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسے موقع پر فوج کو جانی نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا اور وہ انتہائی استقلال و پامردی سے لڑتی ہے۔

ایسے حالات کے بارے میں نپولین کی رائے یہ ہے کہ ان کے ماتحت جنگ کی تقادیر بعض اوقات سالار کی تدبیر کو مات کر دیتی ہے کیونکہ جس فوج کے سپاہی حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں اس کے سالار کی تدبیر بیکار ہو جاتی ہے اور اس طرح تقدیر تدبیر پر حاوی ہو جاتی ہے۔

ان واقعات اور شواہد سے ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ میں صرف اسی فوج کو فتح حاصل ہوتی ہے جو عزم و ہمت کے ساتھ حملہ کرتی ہے اور کامیاب ہونے پر بلا تاخیر دشمن کا تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

ناگہانی حملہ جنگ کا نہایت کارگر حربہ ہے جو فوج اس کو استعمال کرتی ہے کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے۔ ناگہانی حملہ سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے موقع شناسی کی سخت ضرورت ہے اور موقع شناسی وہی سالار کر سکتا ہے جو میدانِ جنگ میں مناسب موقع پر خود موجود ہو۔ پھر ماتحت سالاروں کو اپنے سالارِ اعلیٰ پر پورا اعتماد ہونا چاہیئے۔ مثلاً جب مسلم فوج کو آنحضرتؐ کی حکم عدولی کی پاداشں میں شکست ہونا شروع ہوئی تو آنحضرتؐ پہاڑ کی بلندی کی طرف بڑھے۔ حضرت حمزہؓ نے جوابی حملہ کیا۔ حضرت علیؓ نے درے پر قبضہ کر کے دشمن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا اور اس طرح ہزیمت خوردہ مسلم فوج میں دوبارہ ہمت و حوصلہ پیدا ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر سپہ سالار اور ماتحت سالار اپنے دفاعی منصوبے کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے۔ ایسے نازک اور خطرناک موقعہ پر حالات کا سنبھال لینا صرف اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ مسلم سپہ سالار کی شخصیت، ان کا عزم و حوصلہ مندی اور خوش تدبیری اور اختراعی ملکہ حریف و مقابل سالار سے بہت اعلیٰ و ارفع تھا اور اس سے آپ نے پورا پورا کام لیا۔

مغرب کے دفاعی مبصرین۔

اب اس قسم کے جنگی مورچوں کے متعلق مغرب کے دفاعی مبصرین کے افکار

و آراء پیش کیئے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ آنحضرتؐ کی دقیقہ رس نگاہ مورچہ بندی کی باریکیوں کو کس طرح دیکھتی تھی اور آپؐ کو اس میں کتنا کمال حاصل تھا۔ ان افکار و آراء کا خلاصہ یہ ہے :-

"پہاڑی علاقوں میں بعض باتیں دفاعی جنگ کے لئے مفید ہوتی ہیں بعض سے دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں حسبِ ذیل موافق ہیں :-

۱۔ جب دشمن پہاڑ کی بلندی پر چڑھتا ہے تو اس کے حملے کی رفتار سست ہوتی ہے۔ اس لئے اس پر موثر گولہ باری کی جا سکتی ہے۔ ایسے مورچے پر دشمن آسانی سے حملہ نہیں کر سکتا۔ اس کے ٹینک (رسالہ) اس کی پیدل فوج کی مدد نہیں کر سکتے +

۲۔ پہاڑی مورچے والے دشمن کی نقل و حرکت کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں اس لئے وقت پر مدافعت کی تدبیر کر سکتے ہیں +

۳۔ پہاڑوں کے اوپر اکثر غار وغیرہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے دشمن کی گولہ باری (اس زمانے میں تیر اندازی) سے امان ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کو مضبوط مورچوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے +

۴۔ پہاڑی مورچوں پر پہاڑ کے نشیب و فراز، ہوا کی رفتار اور سمت کی وجہ سے نشانے پر گولی مارنا مشکل ہے (گویا تیر اندازی اور بھی زیادہ دشوار ہے)

۵۔ پہاڑ پر مورچہ لگانے والوں کے لئے حملہ اور پسپائی آسان ہے۔ پہاڑی مورچوں سے دشمن پر زمین کے نشیب و فراز کی وجہ سے جوابی حملہ بہت آسانی سے کیا جا سکتا ہے +

ذیل کے پہلو ناموافق اور موجبِ نقصان ہیں :-

۱۔ ایسے مورچوں کا انتخاب جہاں سے دشمن پر موثر فائر کیا جا سکے آسان نہیں۔ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے +

۲۔ پہاڑی علاقے میں ایسے نشیبی علاقے ہوتے ہیں جہاں حملہ آور دشمن گولیوں کی زد سے بچ سکتا ہے +

ان کو مدِ نظر رکھ کر دیکھئے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آنحضرتؐ کی تمام حربی تدبیریں ایسی تھیں جو آج تک صحیح ہیں اور جن پر اب بھی عمل کیا جاتا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ کیا جائے گا۔ صرف وسائلِ جنگ بدل گئے ہیں۔ پہلے تیروں اور تلواروں سے کام لیا جاتا تھا۔ اب

ہوائی جہازوں سے بم اور توپخانوں سے گولے برسائے جاتے ہیں یا راکٹ وغیرہ چلائے جاتی ہیں۔ پہلے سواروں کے رسالے ہوتے تھے اب ان کی جگہ ٹینکوں اور آہن پوش گاڑیوں نے لے لی ہے اور فضا سے چھاتہ فوج اور اسلحہ اتارے جاسکتے ہیں مگر ان سب کے استعمال کا اصول وہی ہے ؛

زمانۂ جدید کے دفاعی ماہرین اس بات پر اب زور دے رہے ہیں کہ ماتحت سپہ سالاروں کو اپنے اوپر اعتماد کرکے جنگ میں مناسب موقعوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے دشمن کے خلاف فوراً کارروائی کرنی چاہیئے تاکہ جوابی حملے کے وہ مواقع جو دشمن کی غلطیوں سے پیدا ہوں ان کو دُور کرکے تلافی کردی جائے۔ آنحضرتؐ کے ماتحت سالاروں کو معلوم تھا کہ ان کے سالارِ اعلیٰ ان کارروائیوں کو سراہیں گے لہٰذا اُنہوں نے اپنی ذمہ داری پر دشمن پر حملے کئے ؛

آپؐ نے اپنے دفاعی منصوبہ کی تکمیل ایسے وقت میں اتنے رازدارانہ طریقے سے کی کہ دشمن کے پاس بجز اس کے چارہ نہ رہا کہ وہ آپ کی دفاعی چالوں پر ناچے۔ آپؐ کو مخبروں خفیہ نگاروں کے ذریعے دشمن کی تمام اطلاعات برابر ملتی رہتی تھیں۔ مسلم تیراندازوں کا دشمن پر حملہ جسے موجودہ زمانے کی حربی زبان میں فائر پلان (Fire Plan) کہنا چاہیئے نہایت بروقت اور صحیح تھا۔ اس نے دشمن کے رسالے اور پلٹن کو عاجز و پریشان کر دیا۔ تیراندازوں کا مورچہ ایسی جگہ تھا جہاں سے وہ دشمن کے خلاف سارے میدان جنگ میں مؤثر طریق پر تیر برسا سکتے تھے اور حملہ سے قبل، اس کے دوران میں اور اس کے بعد مختلف مقامات سے حسبِ ضرورت اسے نشانہ بنا سکتے تھے۔ آپؐ نے فوج کا ایک حصہ بطور ریزرو اپنے پاس محفوظ رکھا تاکہ وقت پر اس سے کمک کا کام لیا جاسکے۔ چنانچہ اسی دستے نے حضرت حمزہؓ کی ماتحتی میں جوابی حملہ کرکے آثارِ ہزیمت کو کامیابی سے بدل دیا۔ یہ حملہ بہت ناگہانی اور بے باکانہ تھا +

تیراندازوں کے مقررہ جگہ چھوڑنے سے جب جنگ کا پانسہ پلٹنے لگا اور ناکامی کے آثار نمودار ہونے لگے تو آنحضرتؐ نے حالات کا جائزہ لے کر فوراً دفاعی منصوبے کی دُوسری شق پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ دفاعی اصول یہ ہے کہ ہزیمت کے وقت فوج کے ہر چھوٹے سے چھوٹے افسر حتیٰ کہ ہر سپاہی پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جہاں موقع کے دشمن پر

بے دھڑک جوابی حملے کر کے اس کو روکنے کی اور اپنے مورچہ کو مضبوط بنا کر اپنے آدمیوں کو جمع کرنے کی کوشش کرے اور ان تھکے ماندے ہمت شکستہ اور زخمی لوگوں کو حوصلہ مند اور جری بنا کر دشمن سے لڑے +

ہزیمت خوردہ فوج کو دوبارہ جمع کر کے صف آراء کرنا بہت مشکل کام ہے خصوصاً اس وقت جبکہ لڑائی پہاڑی علاقے میں جاری ہو۔ مگر آنحضرتؐ نے اس میں جو معرکتہ الآراد کامیابی حاصل کی وہ جنگ کے نتائج سے بخوبی ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں پہلے آپؐ نے اپنی فوج کے لئے مورچہ ایسی جگہ تجویز کیا جہاں دشمن کو ہر قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر آپ نے اس کو مستحکم تر کیا اور اس کے لئے جو وقت درکار تھا وہ آپؐ کے ماتحت سالاروں نے دشمن پر جوابی حملے کر کے حاصل کیا۔ اس قسم کے جوابی حملے والی جماعتوں کو جدید دفاعی سیاست کی اصطلاح میں ریئر گارڈ (Rear Guard) عقبی حفاظتی دستہ اور فلینک گارڈ (Flank Guard) یعنی پہلوؤں کو بچانے والا دستہ کہتے ہیں۔ یہ دستے حضرت علیؓ اور حضرت حمزہ کی کمان میں نہایت بہادری سے لڑے۔

اس معاملے میں دفاعی مبصرین کی رائے میں اختلاف ہے کہ شکست خوردہ فوج کو منتشر ہو جانا چاہیئے یا فوراً ہی دوبارہ جمع ہو کر جوابی حملہ کرنا چاہیئے۔ مگر عام طور پر مناسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ شکست خوردہ فوج کو منتشر ہو کر محفوظ جگہ چلا جانا چاہیئے تاکہ پھر مجتمع ہو کر لڑ سکے۔ مگر دوسری رائے یہ ہے کہ شکست کی صورت میں اگر فوج بکھر جائے گی تو دشمن کو اس کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر اس پر کاری ضرب لگانے کا موقع مل جائے گا +

ہماری رائے میں ان میں سے کسی رائے کو بھی ہر موقعہ کے لئے اصولِ عمل بنانا صحیح نہیں۔ اگر ہزیمت زبردست ہے تو مناسب یہی ہے کہ فوج کے کچھ حصے کو اپنے عقب کا حفاظتی دستہ بنا کر باقی فوج کو پیچھے ہٹا لیا جائے۔ اس طرح عقبی دستہ قربانی کا بکرا تو ضرور بن جائے گا مگر فوج کا بڑا حصہ دوبارہ منظم ہو کر دشمن کے خلاف لڑ سکے گا۔ اس قسم کے واقعات دوسری عالمگیر جنگ میں کئی دفعہ پیش آئے۔ سخت ہزیمت یافتہ فوج کی ایک مثال ڈنکرک کا واقعہ ہے۔ اسی طرح روس پر جرمن حملے کے دوران میں روسی سالاروں نے کئی ہزار روسی فوج کو قربان کر کے اپنی فوج کے بڑے حصے کو بچا لیا۔ اس سے مُراد صرف یہ ہے کہ سپہ سالار کو ہمت و استقلال

سے کام لے کر اور وقت و حالات کو مدِ نظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیئے +

واقعاتِ مابعد اور اخلاقی سبق

اب ہمیں ان واقعات پر نظر ڈالنی چاہیئے جو جنگِ اُحد کے بعد پیش آئے ۔ جنگِ اُحد کے آخری دور میں بلاشبہ مشرکین کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ اُنہوں نے فتح حاصل کئے بغیر میدان چھوڑ دیا اور اس کی بڑی وجہ سپہ سالار ابوسفیان کی اخلاقی کمزوری تھی ۔ اسے اس کوتاہی کا احساس ضرور تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ پہاڑ پر آنحضرتؐ کے آخری مورچہ پر آیا مگر اس کی ہمت جواب دے چکی تھی ۔ وہ پیچھے ہٹنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا ۔ اسے اس کا یقین و اطمینان نہیں تھا کہ اس کے ماتحت سالار اس کے حکم کی تعمیل کریں گے ۔ وہ واپسی کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے مگر اسے اپنی کوتاہی و کمزوری کا احساس رہتا ہے ۔ چنانچہ جب وہ پہلے ہی پڑاؤ پر پہنچتا ہے تو مسلمانوں اور میدانِ جنگ کے خطرات سے دُور ہونے کی وجہ سے اپنے خیالات پر قابو پاتا ہے اور پچھتاتا ہے کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ۔ لہٰذا آخری چارۂ کار کے طور پر جوابی حملے کی تیاری کا حکم دیتا ہے مگر ہمت ساتھ نہیں دیتی ۔ اور مزید حیلہ جوئی پر آمادہ کرتی ہے ' چنانچہ معبد الخزاعی سے راستے میں ملاقات ہوتی ہے ' وہ حملہ نہ کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے مکّے واپس چلا جاتا ہے +

اس کے برعکس آنحضرت صلعم کو آپؐ کے خفیہ نگار دشمن کے ٹھہر نے اور مدینے پر حملہ کرنے کی تیاری کی اطلاع دیتے ہیں تو آپؐ جنگ و سفر کی تکان اور زخمیوں کی مجروحیت کو نظر انداز کر کے فوراً حملہ کی تیاری کا حکم دیتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو ساتھ لیتے ہیں جنہیں جنگِ اُحد میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی تھی تاکہ نئے لوگ لاف و گزاف سے کام نہ لیں ۔ آپؐ نے مقابل سالار ابوسفیان کی کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھا یا تھا ۔ اگرچہ آپؐ کو یقین نہ تھا کہ ابوسفیان جوابی حملہ کرے گا تاہم مقاومت کی تدبیر فرمائی ۔ پھر آپؐ یہ بھی جانتے تھے کہ اس فوجی نقل و حرکت سے مسلمانوں کی ہمت بڑھے گی اور کفار پر اس کا اثر بہت گہرا ہوگا ۔ اس طرح آپؐ نے ان چند لوگوں کا احساسِ زیان و کمتری بھی دُور کر دیا جو واقعاتِ اُحد سے کسی درجہ میں بھی متاثر تھے ۔ اخلاقی فتح میدانِ جنگ کے نقصان کو بھلا دیتی ہے اور اخلاقی قوت دشمن کے مقابلے میں تعداد کی کمی اور سامان کی قلت کے اثر کو دور کر دیتی ہے ۔

اخلاقی قوت کے اسی فقدان اور پستی کے اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ آج کروڑوں مسلمان مجبور و معذور بنے بیٹھے ہیں حالانکہ اسی قوت نے نہ صرف جنگ بدر اور جنگ اُحد میں بے سر و سامان اور قلیل التعداد مسلمانوں کو کامیاب کیا بلکہ دُنیا کے بڑے حصّے کو مسخر کر لیا تھا۔ اُحد میں صرف آنحضرت صلعم کی اخلاقی قوت تھی جس نے شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ میدانِ جنگ سے دور لوگ اکثر لاف زنی کرتے ہیں۔ ابوسفیان نے بھی یہی کیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ اُحد کی ابتدائی کامیابیوں کے بعد تیر اندازوں کے دستے کی طرح ہم نے بھی اپنا اخلاقی و مذہبی مورچہ چھوڑ دیا ہے اور ادنیٰ درجے کے خزف ریزوں کی لوٹ مار کی پاداش میں ذلت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ کیا ہمیں اپنی اس غلطی اور بانیٔ اسلام و خدائے اسلام کی حکم عدولی کا احساس ہے؟ کیا ہم نے اپنی ہزیمت و انتشار کو کامیابی سے بدلنے کے لئے کوئی تیاری کی ہے؟ کسی مورچے کا انتخاب کیا ہے، کوئی دفاعی منصوبہ بنایا ہے؟ اس کے عمل میں لانے کا کوئی طریقہ سوچا ہے؟ اپنے کردار و اخلاق کے معیار کو درست کیا ہے؟ اگر نہیں کیا ہے تو کب کریں گے؟ آنحضرت کی دفاعی حدیث سے کب کام لیا جائے؟ آپؐ کی سُنّت کو کب زندہ کیا جائے گا؟ شکست و پستی کی ذلت کو کامیابی کی مسرت سے کب بدلا جائے گا؟ رسولِ اکرمؐ نے آن کی آن میں ہار کو جیت اور ناکامی کو کامیابی بنا دیا، اور اس طرح بنا دیا کہ لشکرِ کفار بدحواس ہو کر میدان چھوڑ گیا، سالارِ لشکر مقابلہ پر آنے کی ہمت کرتا تھا مگر بن نہیں پڑتی تھی، کیا آپؐ کے جادۂ مستقیم پر چلنے کا دعویٰ کرنے والے، جبکہ قیادت و سیادت کی باگ ڈور بھی انہی کے ہاتھوں میں ہے انہی کو لشکر اور انہی کو سالارِ لشکر بننا ہے، صدیوں کے بعد بھی شکست کی ذلت کو فتح و کامیابی کی عزت سے بدلنے کے لئے کھڑے نہیں ہو سکتے؟ ؎

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

بہرحال اُحد کی خونریز جنگ کے بعد آنحضرت صلعم نے اپنی ان تھک کوشش، ذاتی مثال اور اخلاقی قوت سے مدینے کو دشمن کے حملے سے محفوظ و مامون بھی بنا دیا، مسلمانوں میں عزم و شجاعت اور حوصلہ مندی کی رُوح بھی پھونک دی اور کفّار و اغیار کے دلوں پر ان کے وقار و ہیبت کا سکہ بھی بٹھا دیا۔

ہمارا یقین محکم ہے کہ آنحضرتؐ کی دفاعی حدیث کے سامنے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے ماہرِ دفاع اور سپہ لشکر کے تجربات و مشاہدات اور غیر اسلامی فنِ حرب و ضرب کے کسی اصل و فرع کی کوئی حقیقت و اہمیت نہیں اور دنیائے اسلام کو مطلق ضرورت نہیں کہ وہ آنحضرتؐ کے علاوہ کسی اور سے فنِ دفاع کا کوئی درس لے۔ آنحضرتؐ کی ذات اور آپ کے اصولِ عمل ہر لحاظ سے اعلےٰ و ارفع و افضل ہیں اور اتنے افضل ہیں کہ زمانۂ جدید کے تجدّد فروش پندارِ ہمہ دانی و ہمہ بینی کے باوجود آپؐ کے قریب نہیں پہنچتے۔ نہ دفاعی سیاست و چارہ گری میں، نہ حربی حکمتِ عملی اور منصوبہ آرائی میں۔ لیکن اس کے باوجود علم و بصیرت کے دروازوں پر تعصب کا تیغہ چڑھا کر بیٹھ رہنا بھی مسلمان کا شیوہ نہیں ہونا چاہیئے دوسروں کے تجربات و مشاہدات سے استفادہ کرنا اور دل و دماغ کی آنکھیں کھلی رکھنا اور بات ہے اور خود فراموشی و کورانہ تقلید اور۔ بہر حال ہمت و استقلال اور جوانمردی و اولوالعزمی، دقیقہ رسی و دُور اندیشی اور صبر و تحمل کی صفات درکنار۔ غزوۂ اُحد کے دفاعی منصوبے پر نظر کیجئے کہ کس درجہ مکمّل و اکمل تھا۔ ابوسفیان کا لشکر تعداد میں مضاعف در مضاعف، مگر کس درجہ مجبور و بے بس تھا، آنحضرتؐ کی دفاعی چالوں پر معمول کی طرح کس طرح ناچ رہا تھا اور غلطیاں کر کر کے کس طرح اپنے آپ کو تباہی میں ڈال رہا تھا اور بالآخر خود ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، ہوش و حواس اس درجہ پراگندہ تھے اور آنحضرتؐ کی جنگی مہارت کی ہیبت اتنی طاری تھی کہ بھاگتے جا رہے ہیں اور سر میں فتح و کامیابی کا سودائے خام مچل رہا تھا۔ رُکتے ہیں اور جوابی حملے کا خود ہی ارادہ کرتے ہیں مگر پھر خود ہی حیلہ جوئی کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور ان کی ہر حماقت، ہر بے تدبیری اور ہر کم ہمتی مسلمانوں کی تقویت، ان کی شجاعت، ان کی حوصلہ مندی اور ان کی عظمت و برتری کا سبب بنتی ہے۔

آپ میں مردم شناسی کا ایسا ملکہ تھا کہ کبھی غلط فیصلہ نہ ہوتا۔ حریف رسالار کو پرکھ کر اسے ایسی غلطیاں کرنے پر مجبور کرتے کہ ہمت و حوصلہ کی ساری متاع برباد ہو جاتی۔ نئے اور پرانے سپہ سالاروں میں نپولین کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھی اس فن میں مہارت رکھتا تھا۔ مگر ماسکو پر حملہ کر کے اس نے زبردست غلطی کی اور اسی وجہ سے اسے ماسکو کی شکست کے بعد کہنا پڑا کہ عظیم الشان فتوحات کے بعد عموماً شکست ہوتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ دُور اندیشی اور صحیح قوتِ فیصلہ اس سے رخصت ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا آنحضرتؐ کے معاملہ میں بھی کسی ایسے قول یا فعل کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ دوسری مثال فریڈرک دی گریٹ کی ہے۔ کولن کے میدانِ جنگ میں اس کا بھی وہی حشر ہوا جو نپولین کا ماسکو میں ہوا تھا اور اس وجہ سے ہوا کہ اس نے مقابل سپہ سالار کی قابلیت اور طاقت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ نپولین نے دو مرتبہ غلط فیصلہ کا ارتکاب کیا۔ دوسری مرتبہ اس نے ۱۸۱۳ء میں یہ اندازہ لگایا کہ جرمن فوج اس کے خلاف میدانِ جنگ میں نہ آسکے گی۔ مگر یہ غلط نکلا اور اس کی شکستِ فاش کا سبب ہوا +

ابوسفیان کی غلطی یہ تھی کہ اس نے خیال کیا، مدینے کے مشرق و مغرب کے میدان لاوے کے پتھروں سے بھرے ہوئے ہیں لہٰذا فوجی نقل و حرکت کے قابل نہیں ہیں۔ لشکرِ اسلام یقینی طور پر جنگ کے لئے شمالی میدان کی طرف بڑھے گا۔ مگر آنحضرت صلعم ان میں دن تو دن رات کے وقت بھی نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے رات کی تاریکی میں نقل و حرکت فرما کر دشمن کو بالکل بے خبر رکھا اور ابوسفیان کو لشکرِ اسلام کی آمد کی خبر اس وقت ملی جب آنحضرتؐ درۂ اُحد میں مورچہ بندی فرما چکے تھے +

آنحضرتؐ کی بصیرت اور مآل اندیشی دیکھئے۔ آپؐ کو اطلاع مل چکی تھی کہ خالد بن ولید بھی اُحد کے عقب (شمال) سے آکر پہاڑ کے جنوب میں مورچہ لگائے گا اس لئے چارۂ کار یہ تھا کہ یا تو درۂ اُحد پر مورچہ قائم کیا جائے یا اسے اس طرح رکھا جائے کہ لشکرِ کفار کو مسلم فوج کی نقل و حرکت کا پتہ نہ چل سکے اور غلط موقع اور غلط جگہ پر خالد سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ اس سلسلے میں آپؐ نے پہلا صحیح اندازہ یہ لگایا کہ خالد بن ولید کا رسالہ دن کے وقت سفر کرے گا، رات کو نہیں کرے گا لہٰذا آپ راتوں رات سفر کر کے اپنے مقررہ مورچے پر پہنچ گئے اور ابوسفیان اور خالد کی فوجی چال کو ناکام بنا دیا۔ اس کے علاوہ دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ بغیر میرے حکم یا دشمن کی طرف سے وار ہونے کے حملہ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد آپؐ نے دشمن کو حملہ کرنے کی ترغیب یا موقعہ دیا +

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا جواب آسان ہے۔ آپؐ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپؐ نے جو دستے مختلف مقامات پر متعین کئے ہیں۔ وہ

جلد بازی میں بلاسوچے سمجھے دشمن کو غافل پاکر حملہ کر دیں اور اصل مقصد میں رکاوٹ کا سبب بنیں۔ مثال کے طور پر بالکل ممکن تھا کہ اُحد کے عقب میں جو دستہ مقرر کیا گیا تھا وہ دشمن کے ہراول کو نقصان پہنچا دیتا مگر بعد میں اصل لشکر کے پہنچنے پر نہ صرف خود مارا جاتا بلکہ اُسے مسلم فوج کی دفاعی چال کا پتہ چل جاتا۔ لیکن جب آنحضرتؐ کی فوج آپؐ کے منصوبے کے مطابق اپنی جگہ پہنچ گئی تو آپؐ نے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل شروع کر دیا۔ نپولین کا قول ہے کہ "دفاعی سیاست سے مراد یہ ہے کہ فوج کا جنرل صحیح جگہ۔ صحیح وقت پر پہنچے۔ مَیں جگہ کے مقابلے میں صحیح وقت پر پہنچنے کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں، کیونکہ میرا خیال ہے کہ جگہ تو دشمن سے لڑکر حاصل کی جاسکتی ہے مگر گیا ہوا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔" حقیقت یہ ہے کہ جگہ اسی وقت صحیح ہوگی جب وقت صحیح ہوگا۔ وقت کو نپولین نے اس لئے ترجیح دی ہے کہ صحیح یعنی مقررہ وقت پر صحیح جگہ پہنچنا بہت ضروری ہے تاکہ ماتحت سالار یہ نہ سمجھیں کہ جگہ پر چند منٹ بعد پہنچنا غالباً بڑا جرم نہیں ہے +

آنحضرتؐ دُور بینی و مآل اندیشی ہی میں منفرد نہ تھے بلکہ اپنے دفاعی منصوبے پر عمل کرنے میں بھی نہایت مستقل مزاج اور عزمِ محکم کے مالک تھے۔ اگر آپؐ کا حریف سالار ابوسفیان بھی ان خوبیوں سے متصف ہوتا تو اُحد کی لڑائی اس جگہ نہ لڑی جاتی جہاں لڑی گئی۔ آنحضرتؐ کو دوسرے منصوبے پر عمل کرنا پڑتا۔ یہ قول مشہور ہے کہ میدانِ جنگ میں فتح عزمِ محکم کا ساتھ دیتی ہے۔ اسی کو انگریزی میں "فارچون آف وار (Fortune of War) یا تقدیرِ جنگ کہتے ہیں +

جنگِ بدر میں ابوجہل کی اور جنگِ اُحد میں ابوسفیان کی کمزوریوں کو دیکھ کر مشہور دفاعی مبصر جرمنی (Jomini) کا مقولہ یاد آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے "جنگ محض سائنس نہیں ہے بلکہ یہ خون سے بھرا ہوا ڈرامہ ہے" یعنی اس ڈرامہ میں انسانی فطرت کے سارے قویٰ کا سخت امتحان ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات مشہور و معروف سپہ سالار کے دل و دماغ بھی کبھی مایوسی، کبھی شک و شبہ اور کبھی خطرے کا شکار بن جاتے ہیں لیکن جو اس آزمائش میں پورے اُترتے ہیں اور ہر حال میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ شہرت و عزتِ جاوید حاصل کر لیتے اور ابد الآباد تک زندہ رہتے ہیں۔ ان دو قسم کے سپہ سالاروں میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ آخر الذکر فطری جذبات و امکانات کا عزمِ صمیم سے مقابلہ کر کے ان پر

فتح پالیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اپنے دشمن کو بھی زیر کر لیتا ہے +

آنحضرتؐ میں فطری جذبات تھے کیونکہ مکمل خود اعتمادی کے باوجود وہ مدد اور فتح کے لئے بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہوتے۔ آپؐ متفکر بھی ہوتے مگر کبھی ہراساں اور پریشان نہ ہوتے۔ آپؐ میں یہ کمال تھا کہ دفاعی سیاست کے ماتحت بچاؤ کی لڑائی لڑنے کے باوجود دفاعی پیشقدمی بھی اپنی ہی طرف سے فرماتے اور ایک دفعہ اسے حاصل کر لینے کے بعد ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن آپ کی دفاعی چالوں کے مطابق نقل و حرکت کرنے پر مجبور ہوتا۔ ممکن ہے بعض دفاعی مبصر یہ کہیں کہ آنحضرتؐ نے بدر اور اُحد کی لڑائیوں میں دشمن کا تعاقب نہ کر کے مسلمہ دفاعی اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کا جواب اوّل تو یہ ہے کہ آنحضرتؐ اس معاملے میں اجتہاد و امامت کے منصب پر فائز ہیں پھر آپ کا تعاقب نہ کرنا بغیر مصلحت نہ تھا۔ جو لوگ ان غزوات کے واقعات و حالات پر پوری طرح غور کریں گے وہ لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دشمن کا تعاقب نہ کرنا صحیح تھا۔ اس کے علاوہ اُس زمانے میں فوج کا عددی تفوّق بعض لحاظ سے بہت اہم ہوتا تھا۔ آج کل اس کا اندازہ ہوائی جہازوں، بحری بیڑے اور جدید ترین آلاتِ حرب سے آراستہ فوج کے مقابلے میں پرانے زمانے کے ہتھیاروں سے مسلح فوج سے کیا جاسکتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں جرمن فوج کے پاس جدید مشینی اسلحہ یعنی ہوائی جہاز اور ٹینک وغیرہ تھے اس لئے پولینڈ کی بہادر فوج چند ہی روز میں کٹ کر ختم ہو گئی۔ آنحضرتؐ کو دشمن کے لشکر کی تعداد اور خالد کے رسالے کی طاقت کا صحیح اندازہ تھا، آپؐ نے اس کا توڑ اپنی حربی سیاست سے کیا اور بے نظیر کامیابی حاصل کی۔ اُحد کی جنگ درحقیقت آج کے دفاعی مبصرین کے لئے علم و بصیرت کا سامان مہیا کرتی ہے اور اس کے ذریعے آنحضرتؐ نے دفاعی سیاست اور حربی تدبر کا ایسا اعلیٰ نمونہ چھوڑا ہے جو ہمیشہ مشعلِ ہدایت کا کام دے گا +

ان غزوات میں ایک اور اہم دفاعی نکتہ جو آنحضرتؐ کی کامیابی میں خاص مقام رکھتا ہے۔ آپؐ کی تیز رفتار بلکہ برق رفتار نقل و حرکت ہے۔ آنحضرتؐ کو اپنے منصوبے کے ماتحت بڑے بڑے لشکروں کو نہایت سُرعت سے نقل و حرکت دینے میں کمال حاصل تھا جس طرح بجلی کے دفعتہً چمکنے سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اسی طرح دشمن آپؐ کی برق رفتار نقل و حرکت کو دیکھ کر حیران و پریشان ہو جاتے تھے۔ نپولین کے متعلق اس کے فوجی کہا کرتے تھے

کہ اس نے دفاع کا ایک نیا اصول وضع کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری سنگینوں کے مقابلے میں وہ ہماری ٹانگوں سے زیادہ کام لیتا ہے ۔" معلوم ہوتا ہے کہ نپولین جس نے تاریخ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ اصول آنحضرت صلعم سے سیکھا تھا کیونکہ آنحضرت صلعم ہی وہ سب سے بڑے سپہ سالار ہیں جنہوں نے اسے اختیار کر کے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں اور ایسے مقامات و حالات میں کیں جہاں اس قسم کی تیز رفتار پیشقدمی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا +

معرکۂ کارزار میں ہوش و حواس کی قائمی بڑی ضروری ہے ۔ اکثر و بیشتر فتح و شکست کا مدار اسی پر ہوتا ہے ۔ سپہ سالار کے ہوش و حواس گم ہوئے اور فوج ختم ہوئی ۔ کثرتِ تعداد اور حرب و ضرب کے سامان کی بہتات کچھ کام نہیں آتی ۔ لیکن آنحضرت صلعم کے اطمینان و استقلال اور حاضر دماغی کو دنیا کا کوئی سالار بھی نہیں پہنچتا ۔ تیراندازوں کی غلطی سے اُحد میں مسلمانوں کے خلاف پانسہ پلٹا تو کچھ جاں نثاروں نے پکار کر کہا رسُول اللہ کی جان بچاؤ ' مگر آپ بصیرت کی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ خالد کے رسالے سے محفوظ ہیں اور باقی لشکرِ کفّار کو ابتدائی ہزیمت کے اثرات سے سنبھلنے اور جوابی حملہ کرنے میں وقت لگے گا ' آپ نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ دشمن کے کئی ماتحت سالاروں کو ابوسفیان کی قابلیت پر شبہ ہے ۔ آپ اپنی جگہ قائم رہے اور نہ صرف قائم رہے بلکہ ایک طرف کمان بھی فرماتے رہے اور دوسری طرف دست بدست مقابلہ بھی کرتے رہے ۔ البتہ آپ نے بارگاہِ ایزدی میں یہ دعا ضرور فرمائی کہ الٰہی میری قوم والوں کا قصور معاف کر دے " اور یہ بھی اسی اطمینان و استقلال کی علامت ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔ اس کے بعد جو جوابی حملہ فرمایا تو دشمن بھاگتا نظر آیا ۔ نہ اس کی جمعیت قائم رہی ' نہ عزم و حوصلہ +

اس میں شبہ نہیں کہ اس صورتِ حال کی بڑی وجہ جہاں آنحضرت کی ہوش مندی و دانائی اور حربی مہارت تھی وہاں ابوسفیان کی غلطیاں بھی تھیں ۔ لیکن یہ غلطیاں بھی آنحضرت صلعم کی قابلیت ہی کی وجہ سے سرزد ہوئی تھیں ۔ مثلاً ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے لشکر کے لئے خوراک اور پانی کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا تھا ۔ جو کچھ تھوڑا بہت کیا تھا وہ زبیرؓ کے رسالہ اور لشکرِ اسلام کے حملے سے درہم برہم ہو گیا ۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ جب لشکرِ اسلام کے انتشار کو دیکھ کر کفار کے کئی دستے مسلمانوں کی شکست اور اپنی کامیابی کے خیال میں بھوک پیاس سے

نڈھال اپنے پڑاؤ کی طرف جانے لگے تو یکے بعد دیگرے دوسرے دستوں نے بھی اسی طرف کا رُخ کیا اور جنگ کے قطعی نتیجہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ ۴۵-۱۹۳۹ء کی جنگ میں بھی ایسے واقعات ایک سے زیادہ مرتبہ ظہور میں آئے اور ان کے نتائج بھی ویسے ہی مضر برآمد ہوئے +

ایک غلط فہمی۔

بعض مورخین نے آنحضرتؐ کے دفاعی منصوبے پر غور کئے بغیر یہ لکھ دیا ہے کہ آنحضرتؐ مدینے میں قلعہ بند ہو کر لڑنا چاہتے تھے اور عبداللہ بن ابی سلول کے مشورہ پر مدینے سے باہر نکل کر لڑنے پر آمادہ ہوئے۔ اس مشورے کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے اور اس پر اظہارِ خیال بھی کیا جا چکا ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان کی غلطی اور واضح کر دی جائے تاکہ اس سے آنحضرتؐ کی دُور بینی اور قائدانہ صلاحیتوں پر جو حرف آتا ہے وہ دُور ہو جائے +

اس میں شبہ نہیں کہ آپ ہر اہم معاملہ میں صحابہ اور اہل الرائے مسلمانوں سے مشورہ کر لیا کرتے تھے اور ہر غزوہ سے پہلے بھی آپ نے مشورے کئے۔ آپ ان مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ مثلاً غزوہ بدر سے پہلے آپ نے جو مشورہ فرمایا اس کی بڑی غرض یہ تھی کہ کمزور دلوں اور ڈانواڈول قسم کے لوگوں کا پتہ چل جائے۔ پھر آپ ایسے لوگوں کو دشمن سے لڑانے والے تھے جن کے عزیز و اقارب دشمن کے ساتھ تھے، پرانے جنگی اصولوں کی پابندی کرانا چاہتے تھے، آپؐ کو مدینے کے پہلے عہد نامے کی شرطوں میں تبدیلی کرنا تھی اور حلیف قبائل کی حفاظت کی ذمہ داری کو پورا کرنا تھا۔ جنگِ اُحد سے پہلے مشورے کی غرض یہ تھی کہ مخبروں اور جاسوسوں کی اطلاعات کی صحت معلوم ہو جائے، مشورے میں عبداللہ بن ابی سلول کی شرکت اور اس سے آنحضرتؐ کا استفسار خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عبداللہ منافق تھا اور اس کے ساتھ تقریباً تین سو آدمیوں کی جمعیت تھی۔ آنحضرتؐ کو اس کا علم تھا کہ وہ دشمن کا آدمی ہے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے، مگر آپؐ نے مشورہ کیا اور اس وجہ سے کیا تاکہ دشمن کے منصوبے کا پتہ چل جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب اس نے کہا کہ آپؐ کو مدینے سے باہر نکل کر لڑنا چاہیئے تو آپ کو مشرکین کے نقشہ جنگ کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ یہ سمجھنا کہ آنحضرتؐ مدینے کے اندر قلعہ بند ہو کر لڑنا چاہتے تھے اور عبداللہ کے

کہنے پر باہر نکلے بدیہی طور پر غلط اور مضحکہ خیز ہے۔ اگر ایسا ہوتا اور آپ کا اپنا دفاعی منصوبہ تیار نہ ہوتا تو آپ مدینے سے نکل کر عبداللہ کی مرضی کے مطابق وہ راستہ اختیار کرتے اور اس جگہ پہنچتے جہاں مشرکین اس کے ذریعے آپ کو پہنچا کر پھنسانا چاہتے تھے یا اس کی منشاء پر نہیں چلے تھے تو مدینے کے اندر ہی رہ کر لڑتے، لیکن واقعات ان دونوں کی تغلیط کرتے ہیں اور صاف طور پر بتاتے ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے منصوبے کے مطابق مدینے سے باہر آئے اور طے شدہ اسکیم کے مطابق شیخین پہنچے۔ عبداللہ نے دیکھا کہ میرا منصوبہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا تو اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ بگڑ کر الگ ہو گیا۔ اس سے اس بات کی مزید تائید ہو گئی کہ یہ منافق آنحضرتؐ کو دھوکہ دینا چاہتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ آنحضرتؐ کو اپنے جال میں پھنسا کر مشرکین کے انعام واکرام کا مورد بنے گا۔ مگر آنحضرتؐ نے اس منافق کو اپنی چال سے ایسی مات دی کہ وہ علیحدہ ہو کر نہ اِدھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ بقولِ شخصے دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ نہ وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا سکا اور نہ مشرکوں کو کوئی فائدہ بلکہ اس کی پوزیشن دونوں طرف سے خراب ہو گئی +

اس سے یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ نے مشورے کے وقت، اس سے پہلے یا اس کے بعد اپنے دفاعی منصوبے کا راز کسی پر ظاہر نہیں فرمایا۔ یہی وجہ تھی کہ بعض مجاہدین کو بھی اس کا شبہ ہوا کہ آنحضرت صلعم عبداللہ کے کہنے پر مدینے سے باہر نکل کر لڑنے کو تیار ہوئے ہیں اگرچہ بعد کو انہیں اپنی غلطی معلوم ہوئی اور توبہ کرنی پڑی +

بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ نے اپنا دفاعی منصوبہ بنا لیا تھا اور آپ کو اسی پر عمل کرنا تھا تو مشورہ کی کیا ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ آپ کا ہر فعل، ہر عمل اور ہر قول مسلمانوں کے لئے اُسوہ اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اہم اجتماعی معاملات میں مشورہ کرنا ضروری ہے۔ بحث اور اختلاف رائے کے بعد جو فیصلہ ہوتا ہے وہ بہتر ہوتا ہے اور اس کی پشت پر اجماع کی اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ قطعاً یقینی اور ضروری بھی نہیں ہے کہ ایسا فیصلہ صائب و صحیح ہی ہو، قائد وامیر اپنی فہم وبصیرت سے بہتر لائحہ عمل بنا سکتا اور اس پر عمل کر سکتا ہے۔ مشورہ لینے کے معنی لازمی طور پر مشورہ کی پابندی کے نہیں +

اس لحاظ سے آپؐ کی شخصیت دُنیا کے دوسرے سالاروں سے بالکل مختلف ہے۔ مثلاً نپولین کہتا ہے "مَیں نے تمام لڑائیاں بغیر کسی کا مشورہ لئے لڑیں۔ اگر مَیں مشورہ لیتا تو کامیاب جرنیل نہ بنتا" گویا اختلاف رائے سے بچنے کا سہل طریقہ اختیار کیا، مگر اس کے ساتھ اسے یہ بھی اعتراف کرنا چاہئے تھا کہ ان لڑائیوں کو اس نے اپنی ذاتی لڑائیاں بنالیا۔ اور نتائج کا کچھ خیال نہیں کیا۔ آگے چل کر کہتا ہے، "ہر شخص کی رائے مختلف ہوتی ہے، اختلاف رائے ہر آدمی کا پیدائشی حق ہے۔ اسی طرح ہر جرنیل اپنے طریقوں سے لڑائی لڑنا چاہتا ہے۔ مجھے جنرل کیلرمن (Kellermann) کے تجربہ کا اعتراف ہے اور بلا شبہ وہ مُلک کے لئے مجھ سے بہتر لڑائیاں لڑ سکے گا۔ مگر ہم دونوں مل کر گڑبڑ پیدا کریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہار جائیں گے۔ میری رائے میں فوج کے لئے بہتر اصول یہ ہے کہ معمولی قابلیت کا ایک سالار دو قابل سالاروں سے بہتر ہے ـــــ" نیز "بادشاہ اور جنرل کے طرزِ عمل میں یہ فرق ہے کہ بادشاہ دُور اندیشی سے ہر فتح کے نتائج پر غور کرتا ہے (یعنی میدانِ جنگ میں فتح اس کی حکومت کے لئے کیا نتائج پیدا کرے گی) مگر جنرل اپنے دفاعی مقصد کے تحت صرف فتح چاہتا ہے"۔

آنحضرت صلعم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی، نوعِ انسان کے ہادی اور مسلمانوں کے قائد و حاکم تھے۔ آپؐ کو بادشاہ سے زیادہ مآل اندیشی و دُور بینی سے کام لینا ضروری تھا۔ آپؐ کے سامنے محض فتح اور فقط حکومت کی بہتری و خوش انتظامی کا خیال نہ تھا بلکہ گمراہ انسانیت کو صراطِ مُستقیم پر لانا اور اعمال و اخلاق کا ایک مکمل نمونہ قائم کرنا تھا، لہٰذا آپؐ کے لئے مشورہ کرنا بھی ضروری تھا اور انسب و صائب پر عمل کر کے فلاح و نجاح کی شاہراہ کھولنا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ آپؐ کا ہر فیصلہ، ہر فعل اور ہر قول و عمل خطا و نسیان سے پاک اور شک و شبہ سے بالاتر ہے اور زندگی کے ہر شعبہ، ہر مرحلہ اور ہر منزل میں شمعِ راہ کا حکم رکھتا ہے۔ آپؐ کے غزوات دفاع کے ہر چھوٹے بڑے رُکن کے لئے نمونہ و مثال کی حیثیت رکھتے۔ خود اعتمادی، قوتِ تخلیق و اختراع، فکر و تدبر، موقع شناسی و مُستعدی اور دشمن کے منصوبے کو اپنی حکمت عملی سے معطل کرنا ہر جنرل ہی کے لئے نہیں، ہر انسان کی کامیابی کے لئے لازمی ہے۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے دفاعی منصوبے پر بڑی جرأت و بیباکی

سے عمل کیا۔ آپؐ کے سامنے اور دائیں بائیں دشمن تھا، دفاعی مرکز مدینے اور آپؐ کی فوج کے درمیان دشمن کا لشکر تھا۔ عزم و استقلال کے امتحان کا نہایت ہی نازک وقت تھا لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایسا منصوبہ صرف وہی سالار بنا سکتا اور اس پر عمل کر سکتا ہے جو کوہِ عزم اور پیکرِ استقلال ہو۔ پھر جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے، آنحضرتؐ محض سپہ سالار ہی نہ تھے۔ آپ بادشاہ بھی تھے اور دینی پیشوا اور مذہبی رہنما بھی۔ لہٰذا آپ کو اپنا منصوبہ بناتے وقت بعض دفاعی اصولوں کو سیاسی اصولوں کے ماتحت کرنا پڑا۔ آنحضرتؐ نے ایسے حالات میں بے عیب اور کامیاب ترین دفاعی منصوبہ بنا کر دنیا پر ثابت کر دیا کہ آپؐ یکتائے روزگار سپہ سالار ہیں +

آنحضرت صلعم کی ذاتِ ستودہ صفات اس سے مستغنی ہے کہ اس کی ستائش کے لئے کسی دنیوی بادشاہ سے متعلق کوئی توصیفی بیان بطور تائید و سند پیش کیا جائے تاہم چونکہ ہم دفاعی سیاست و حربی مہارت کے سلسلے میں مغرب کے موجودہ و گذشتہ سالاروں دفاعی مبصروں کے افکار و مشاہدات سے استفادہ کرتے چلے آئے ہیں —— اور اس لئے کرتے چلے آئے ہیں کہ بغیر اُس کے چارہ نظر نہیں آتا —— اس لئے یہاں اس کے پیش کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یورپ کے ایک قابل دفاعی مبصر نے ایک بادشاہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :۔

"وہ سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے بہت سے ہم عصروں سے بہتر و فائق تر تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں فاتح بننے اور شہرت حاصل کرنے کا شیدائی نہ تھا، اُسے اُن سالاروں سے حسد نہ تھا جو بہ حیثیت فاتح شہرۂ آفاق تھے۔ اس کے لئے جنگ ایک خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی اور وہ مقصد امن کا مقصد تھا۔ اس نے میدانِ جنگ میں بہت سی فتوحات حاصل کیں مگر اس نے کئی ایسی مہموں میں بھی حصّہ لیا جنہیں اس نے عہدناموں سے فتح کیا اور یہ فتح اس کے نزدیک میدانِ جنگ کی فتح سے زیادہ اہم تھی۔ اسی لئے وہ دوسرے سپہ سالاروں سے مختلف تھا ——"

غور کیجئے کہ کیا اس تحسین و ستائش کے مورد آنحضرت صلعم نہیں بنتے؟ چونکہ اس رائے اور اس تعریف کو دُنیائے مغرب میں مثالی شخصیت کی تعریف سمجھا جاتا ہے اس لئے ہم نے اسے یہاں پیش کرنے کی جرأت کی ہے کہ آج کل مغرب کی رائے کو سب سے زیادہ

اہم و وقیع سمجھا جاتا ہے ورنہ جیسا کہ ہم نے لکھا ہے' آنحضرتؐ کی ذات اتنی ارفع و اعلیٰ ہے کہ کسی دوسرے کو مقابل لاکر اسے مثال بنانا بڑی گستاخی اور سوءِ ادب ہے۔ بہرحال اس سے مُراد صرف یہ ہے کہ آنحضرتؐ مغرب کے دفاعی مبصرین کے معیار و نقطۂ نظر سے بھی مکمل سپہ سالار اور مکمل بادشاہ تھے ورنہ نپولین تو ہر اُس شخص کو افضلیت و ارفعیت کے مقام پر فائز سمجھتا ہے "جو خطرات کے مقابلے کے لئے تیار ہو اور یہ اندازہ لگا سکے کہ کس وقت ان خطرات کو مول لیا جا سکتا ہے اس کی اسپہ سالار کی) یہ خصوصیت تمام دوسرے خصائص سے افضل و برتر ہے کیونکہ ایسا کرنے کی قابلیت اسے بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دینے کا اہل بنا دیتی ہے ——" گویا پیش بینی اور صحیح فیصلہ کا ملکہ اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ نپولین اس کے حامل کو مکمل سپہ سالار تسلیم کرتا ہے۔

اب آنحضرتؐ کے دُوسرے ملکات و خصوصیات کو خاطر میں لائیے اور آپ کی شان کی رفعت کا اندازہ کیجئے۔ کوئی دُوسرا اسپہ سالار آپ کی شان کو پہنچتا ہے؟ اُس زمانے میں جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ متحارب فریق ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے لیکن آنحضرتؐ نے وہ طریقہ اختیار فرمایا جسے آج کی دُنیا کے چوٹی کے ماہرین حرب جدید اور ترقی یافتہ طریق جنگ کہتے ہیں۔ پھر تمام غزوات میں ایک ہی طریقے سے کام نہیں لیا' بلکہ آپؐ کی مورچہ بندی کے منصوبے میں ہر دفعہ جدت رہی۔ اگر بدر میں آپؐ نے لشکرِ اسلام کو دشمن کے ایک پہلو (Flank) پر متعین کیا تو اُحد میں دشمن کے منصوبے کو ناکام کرنے کے لئے اس کے دفاعی مرکز یعنی غابہ اور اس کے لشکر کے درمیان مورچہ بند کیا۔ آج کی دُنیا میں ایسی ماہرانہ نقل و حرکت اور ایسی مورچہ بندی کی مثال ہمیں جرمن' روسی اور اتحادی فوجوں کی ان محاذ آرائیوں میں ملتی ہے جو انہوں نے ۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ میں کئی دفعہ کیں۔ مگر اس قسم کی جنگی چال میں بصورتِ شکست' کسی دفاعی مصلحت یا کسی حربی اصُول کے ماتحت فوج کو پیچھے ہٹانا بہت مشکل ہو جاتا ہے اس لئے اس پر وہی سالار عمل کر سکتا ہے جو فنِ حرب میں کامل' عزم و حوصلہ کا سرمایہ دار اور جری اور بے باک ہو۔

اُحُد کے بعد

واقعۂ رجیع۔

جنگِ اُحد سے قبائلِ عرب میں ایک بے چینی سی پھیل گئی۔ ان کے دلوں پر قریش کے زبردست لشکر کو دیکھ کر بہت اثر ہُوا اور ان کی ہمتیں آنحضرت صلعم کے خلاف پھر بندھنا شروع ہو گئیں۔ یہودیوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور یہود و مشرکین نے مل کر مسلمانوں کو کمزور بنانے کا منصوبہ بنایا تاکہ ان کی قوت و جمعیت کو شکستہ کر کے انہیں ختم کر دیا جائے +

اس منصوبہ کے تحت عضل اور قارہ کی ایک جماعت آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہُوئی اور عرض کیا کہ ہماری قوم اگرچہ ایمان لے آئی ہے مگر ان میں بہت سے لوگ احکامِ اسلام سے قطعاً ناواقف ہیں لہٰذا ہمارے ساتھ ایسے واقفِ دین اور قابل آدمیوں کو روانہ فرما دیں جو ہمیں دین کی باتیں سکھائیں اور شریعت کے احکام سے آگاہ کریں۔ آنحضرتؐ نے دس صحابہ کو جن کے سردار عاصمؓ بن ثابت تھے ان کے ہمراہ کر دیا۔ جب یہ لوگ صحابہؓ کی اس جماعت کے ساتھ رجیع کے مقام پر پہنچے جو عسفان اور مکّے کے وسط میں ہُدہ کے اُتار پر ایک چشمہ ہے تو اُنہوں نے بدعہدی کر کے قبیلہ بنو لحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ بنو لحیان نے دو سو آدمی لے کر جن میں ڈیڑھ سو تیر انداز تھے مُسلمانوں کو گھیر لیا اور مطالبہ کیا کہ اپنے آپ کو ہمارے سپرد کر دو۔ صحابہؓ نے ایک ٹیلے پر پناہ لی۔ کفّار نے کہا، اُتر آؤ، ہم تمہیں پناہ دیتے ہیں۔ صحابہؓ نے کہا ہم کفّار کی پناہ میں نہیں آتے۔ یہ کہکر انہوں نے ہتھیار سنبھالے اور پہلے ان پر تیر برسائے جب تیر ختم ہو گئے تو نیزوں سے لڑے۔ اس طرح لڑتے لڑتے آٹھ صحابہؓ شہید ہو گئے۔ کفّار نے باقیماندہ صحابہ کو یقین دلایا کہ ہم تمہاری جان نہیں لیں گے تو وہ ٹیلے سے نیچے اُترے۔ کفّار و مشرکین نے

انہیں قید کر لیا اور مکّے لے گئے اور قریش کے ہاتھ بطور غلام فروخت کر دیا۔ ان میں سے ایک کا نام خُبیبؓ بن عدی تھا اور دوسرے کا زیدؓ بن وثنہ۔ خُبیبؓ نے جنگِ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں نے خرید لیا تاکہ باپ کے قتل کے انتقام میں قتل کریں۔ زید کو صفوان بن اُمیّہ نے قتل کے ارادے سے خریدا تھا۔
اس کے چند روز بعد کفّار ان دونوں صحابہ کو حرم مکّہ سے باہر لے گئے اور کہا اگر اسلام چھوڑ دو تو تمہاری جان بخشی کی جا سکتی ہے۔ اُنہوں نے جواب دیا جب اسلام ہی نہ رہا تو جان کا کیا ہو گا۔ خُبیبؓ نے دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد انہوں نے اپنے آپکو شہادت کے لئے پیش کر دیا اور کفار نے صلیب پر چڑھا کر ان کا کام تمام کر دیا۔
زیدؓ بن دثنہ کے قتل کا تماشا دیکھنے کے لئے قریش کے بڑے بڑے سردار آئے تھے جنہیں ابوسفیان بھی تھا۔ انہوں نے بدر و اُحد میں کئی قریشیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ انہوں نے بھی بڑی بہادری سے خالصاً لوجہ اللہ اپنی جان دے دی +

بیرِ معونہ کا واقعہ۔

غزوۂ اُحد کے تقریباً چار ماہ بعد صفر میں ابو براء عامر بن مالک بن جعفر جو بنی عامر کا رئیس تھا اور فنِ نیزہ بازی میں ماہر تھا رسولِ اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں بہت سے تحفے تحائف لے کر حاضر ہُوا۔ وہ اگرچہ مسلمان نہیں ہُوا تھا مگر مسلمانوں کا مخالف بھی نہیں تھا لیکن آنحضرتؐ نے اس کے تحفے قبول نہیں کئے اور فرمایا کہ مَیں نے کبھی کسی مُشرک کا ہدیہ قبول نہیں کیا۔
جب اس نے اصرار کیا تو آپؐ نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ ابو براء عامر دعوتِ اسلام اور تلقینِ ایمان سُن کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عرض کیا کہ آپؐ کا دین اچھا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ آپؐ اپنے چیدہ صحابہؓ کو نجد روانہ فرمائیں تاکہ وہاں جا کر اہلِ نجد کو اسلام کی دعوت دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ اسے قبول کر لیں گے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے وہ لوگ میرے آدمیوں کو ایذا پہنچائیں گے۔ ابو براء نے کہا کہ مَیں ان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔
اس وعدہ پر بھروسہ کر کے آنحضرتؐ نے تقریباً چالیس صحابہؓ پر مشتمل ایک وفد تیار کر کے منذر بن عمرو انصاری کو سردار مقرر فرمایا اور انہیں حاکمِ نجد عامر بن الطفیل کے نام ایک خط لکھوا کر دیا تاکہ آنحضرتؐ کی طرف سے دوستی کے اظہار کے طور پر اسے دے دیا جائے +

جب یہ قافلہ مدینے سے چار منزل پر بیر معونہ پہنچا تو سردار قافلہ نے آنحضرتؐ کا نامۂ گرامی ایک قاصد کے ہاتھ عامر بن الطفیل کے پاس بھیج دیا اور خود وہیں قیام کیا۔ جب قاصد حرام بن ملحان نامۂ مبارک لے کر پہنچا تو حاکم نجد نے اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور قاصد کو پکڑ کر قتل کرا دیا اور ایک لشکر لے کر بیر معونہ پر چڑھائی کر دی۔ بیر معونہ بنی عامر اور بنی سلیم کے پتھریلے علاقوں کے درمیان واقع تھا۔ حاکم نجد نے بنی عامر کو بھی مسلمانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے کہا کہ ابو براء نے اس وفد کو پناہ دی ہے ہم بدعہدی نہیں کرینگے۔ ان سے مایوس ہو کر عامر بن الطفیل بنی سلیم کے پاس پہنچا، وہ اس کی باتوں میں آ گئے اور انہوں نے مسلمانوں پر ایسے وقت حملہ کیا جبکہ وہ سو رہے تھے۔ مسلمانوں نے بہادری سے مقابلہ کیا مگر چونکہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور حملہ ناگہانی ہوا تھا سوائے ایک مسلمان کے باقی سب شہید ہو گئے اور وہ بھی اس طرح بچا کہ زخمی ہو کر مسلمان شہداء کی لاشوں کے نیچے دب گیا تھا۔ موقع ملا تو وہاں سے نکل بھاگا۔

اس وقت اتفاق سے عمر بن عوف کے مسلمان جن کے سردار عمرو بن اُمیہ الضمری تھے اور ان کے رفیق انصاری بنو سلیم کے حدود میں تھے۔ اُنہوں نے بہت سے پرندوں کو ایک جگہ چکر لگاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے وہ وہاں پہنچے تو مسلمان شہداء کی لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ دشمن کا رسالہ وہیں موجود تھا۔ پہلے اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ سوچا کہ مدینے جا کر آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع دی جائے پھر یہ خیال کر کے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم دشمن کے خوف سے بچ کر چلے آئے ہیں۔ پہلے اُن پر تیروں سے حملہ کیا۔ پھر دست بدست لڑائی لڑی۔ اس میں انصاری تو شہید ہو گئے اور عمروؓ کو دشمنوں نے گرفتار کر کے عامر بن الطفیل کے سامنے پیش کر دیا۔

عامر بن الطفیل نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کی کامیابی پر ایک غلام کو آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔ لہٰذا جب اسے معلوم ہوا کہ عمرو بنی مضر سے ہے تو اس نے اس کی پیشانی کے بال کاٹ کر اسے آزاد کر دیا۔

عمرو بن اُمیہ وہاں سے چل کر قناۃ پر پہنچا۔ ابھی وہ قرقرہ کی بلندی پر چڑھ کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھا ہی تھا کہ دوسری طرف سے دو آدمی آتے دکھائی دیئے۔ وہ بھی سستانے کے لئے اسی درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ عمروؓ نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو تو اُنہوں نے

کہا، بنی عامر ۔ یہ سُن کر وہ خاموش ہو گیا ۔ وہ دونوں تھوڑی دیر میں لیٹ کر سو گئے ۔ عمرؓو نے انتقام میں دونوں پر حملہ کر کے قتل کر دیا +

اس کے بعد مدینے پہنچ کر ساری داستان آنحضرتؐ کو سُنائی ۔ بنی عامر کے قتل کا حال سُن کر آپؐ نے فرمایا کہ مجھے ان دونوں کا خوں بہا دینا ہو گا +

ادھر ابو براء کو بنی عامر کی وعدہ خلافی کا علم ہوا تو اسے سخت صدمہ ہوا ۔ اور اس کے چند اہلِ خاندان نے اس کی پاداش میں عامر بن الطفیل کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا ۔ مگر عامر بن الطفیل حملہ میں زخمی ہو کر بچ گیا +

بنو نضیر ۔

مدینے کے جنوب مغرب کی جانب تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر بنو نضیر کی بستی تھی ۔ بنو نضیر اور بنو عامر آپس میں حلیف تھے ۔ بنو عامر کے دو آدمیوں کے واقعۂ قتل کی بنا پر آپؐ حضرت علیؓ ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر دیارِ بنی نضیر تشریف لے گئے ۔ اور اپنے آنے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ عمرؓو بن امیہ نے غلطی سے بنو عامر کے دو آدمیوں کو ایسے حالات میں قتل کر دیا ہے چونکہ میں نے بنو عامر کو امان دی تھی لہٰذا میں ان کا خوں بہا دینا چاہتا ہوں ۔ بنو نضیر نے آنحضرتؐ کے سامنے کچھ نہ کہا مگر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے ۔ آنحضرتؐ اس وقت ایک دیوار سے پشت لگائے بیٹھے تھے الہٰذا انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ آپؐ کے اوپر بڑا سا پتھر پھینک کر آپؐ کا خاتمہ کر دیا جائے ۔ آپؐ نے اس سازش کو سمجھ لیا ۔ آپؐ کسی عذر کی بنا پر وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے اور باقی صحابہؓ وہیں بیٹھے رہے ۔ جب آپؐ بہت دیر تک تشریف نہ لائے تو انہیں فکر ہوئی ۔ آس پاس تلاش کیا مگر کہیں پتہ نہ چلا تو مدینے واپس آئے ۔ وہاں دیکھا تو آپ مسجد میں تشریف فرما تھے ۔ صحابہؓ نے اپنی فکر و تشویش کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہودیوں نے میرے قتل کا منصوبہ بنایا تھا جس کا مجھے علم ہو گیا لہٰذا مصلحت اسی میں تھی کہ صرف میں ہی بچ کر نہ نکلوں بلکہ تم بھی محفوظ رہو ۔ اس لئے تنہا اُٹھ کر آیا ۔ اگر سب یک وقت اُٹھتے تو ممکن تھا منصوبہ کی ناکامی کی مایوسی میں وہ ہمیں تھوڑی سی تعداد میں دیکھ کر اچانک حملہ کر دیتے +

روایت ہے کہ جس وقت بنو نضیر یہ مشورہ کر رہے تھے کہ پتھر پھینک کر آپؐ کو ہلاک کر دیا جائے تو سلام بن مشکم نے مزاحمت کی اور کہا کہ اس سے مسلمان ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں گے مگر یہودی نہ مانے اور عمرو بن جحاش جب پتھر پھینکنے کے لیئے مکان کی چھت پر چڑھا تو اس وقت آنحضرتؐ اپنی جگہ سے اُٹھ کر جا چکے تھے +

اس کے بعد آنحضرتؐ نے محمدؐ بن مسلمہ کو بُلایا اور ان سے کہا، بنو نضیر کے یہودیوں سے کہہ دو کہ چونکہ اُنہوں نے نہ صرف وعدہ خلافی کی بلکہ دغابازی بھی کی لہٰذا وہ اس بستی کو چھوڑ کر چلے جائیں اور مدینے کے قریب نہ رہیں +

جب محمدؐ بن مسلمہ نے یہودیوں کو آنحضرتؐ کا پیغام پہنچایا تو پہلے تو انہوں نے ان کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی اور کہا کہ کسی شخص سے اس کی توقع نہ تھی کہ وہ ہمارے قدیم معاہدوں کی خلاف ورزی کر کے ہمیں آباو اجداد کے گھروں سے نکلنے کا مطالبہ کرے گا اور بنو اوس کے دل تبدیلِ مذہب سے اس درجہ بدل جائیں گے۔ بہر حال ہم اس پر غور کریں گے، ممکن ہے اس سخت حکم کی بجا آوری کو برداشت کر جائیں +

ادھر عبداللہ بن ابی سلول نے ان سے کہلا بھیجا کہ تم اپنی بستی کو ہرگز نہ چھوڑنا میرے ساتھ دو ہزار عربوں کی جمعیت ہے، تمہاری اپنی جمعیت بھی کافی ہے پھر بنی قریظہ بھی تمہاری مدد کے لیئے موجود ہیں +

چونکہ بنی قریظہ اور آنحضرتؐ کے درمیان معاہدہ تھا اور کعب بن اسد نے اس پر بنی قریظہ کی طرف سے دستخط کیئے تھے لہٰذا اس نے کہلا بھیجا کہ جب تک میں زندہ ہوں میرے قبیلہ کا کوئی شخص اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا +

سلام بن مشکم نے حیّیؓ بن اخطب سے کہا کہ آنحضرتؐ کے حکم کی تعمیل کرو۔ مگر اس نے اس کے مشورہ کو نہ مانا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں جُدی بن اخطب کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ہم آپ کا حکم نہیں مانیں گے۔ آپ جو چاہیں کریں۔ گویا آپؐ کو جنگ کی دعوت دی۔ آپؐ نے اسے قبول کر لیا۔ آنحضرتؐ کا اعلانِ جنگ سُنکر جُدی بن اخطب ابنِ ابی سلول کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور آنحضرتؐ کا نقیب لوگوں کو جنگ کی تیاری کی اطلاع دے رہا تھا +

جُدی نے دیکھا کہ عبداللہ بن ابی سلول اپنے باپ کے سامنے گھر میں داخل ہوا

اور ہتھیار لے کر مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو گیا۔ یہ دیکھ کر جُدی عالمِ مایوسی میں حُیّی کے پاس پہنچا اور اسے سارا ماجرا سُنایا +

آنحضرتؐ نے اپنا لشکر لے کر دیارِ بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ روز کے محاصرے کے بعد یہودیوں نے صلح کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے یہ شرط پیش کی کہ جس قدر سامان تم اپنے اونٹوں پہ لاد کر لیجا سکتے ہو لے کر جلاوطن ہو جاؤ مگر ہتھیار نہیں لے جا سکتے۔ یہودیوں نے اسے منظور کر لیا اور وہاں سے نکل گئے +

غطفان کے قبائل۔

اس غزوہ کے بعد آنحضرتؐ نے کچھ عرصہ مدینے میں گذارا۔ مگر نجد کا فتنہ بڑھتا جارہا تھا لہٰذا مجاہدین کو لے کر نجد کی طرف روانہ ہوئے۔ بنو نضیر کے مُلک بدر کرنے کی وجہ سے تمام یہودیوں میں سخت بے چینی پھیل گئی تھی لہٰذا اُنہوں نے مدینے آنے والے قافلوں کو دومتہ الجندل کے آس پاس لوٹنا شروع کر دیا تاکہ مدینے کی غلّہ کی تجارت کو نقصان پہنچے۔ اس کے علاوہ انہوں نے نجد کے قبائل کو آنحضرت صلعم کے خلاف اُبھارنا شروع کیا اور مدینے جانے والے قافلوں کی لوٹ گھسوٹ کے لئے غطفان کے چند قبائل کو خاص طور پر تیار کر کے انہیں روپے پیسے کا بھی لالچ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے +

جب آپؐ مجاہدین کا لشکر لے کر نخل پہنچے تو آپؐ کو ایک طرف تو غطفان کے قبائل بنو محارب اور بنو ثعلبہ کی حربی تیاریوں کی خبر ملی۔ دوسری طرف یہ اطلاع آئی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ نجد کے راستے سے مکّے کی طرف جارہا ہے۔ یہ قافلہ شام سے آیا تھا اور آپؐ کے نخل پہنچتے پہنچتے مکّے کی طرف بہت دُور نکل چُکا تھا۔ پھر آپ کو ابو سفیان کی جنگی تیاریوں کی خبر بھی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے لشکرِ عظیم کے ساتھ بدر کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا غطفان کے قبائل کو متاثر کرنے کے لئے آپؐ نے چند روز نخل میں قیام فرمایا۔ جس کا اُن پہ اچھا اثر ہُوا۔ اس کے بعد موجود الوقت حالات کے پیشِ نظر آپؐ نے یہ مناسب سمجھا کہ مدینے کو مراجعت کی جائے اور تجارتی قافلے کا تعاقب نہ کیا جائے۔ جب غطفان کے قبائل کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور اُنہوں نے کوئی شرارت نہ کی

تو آپؐ مدینے تشریف لے آئے اور جمادی الاولیٰ کے آخری حصّہ سے رجب تک کا زمانہ آپؐ نے مدینے میں گذارا +

اب چونکہ سب سے زیادہ اندیشہ ابوسفیان کی طرف سے تھا لہٰذا آنحضرتؐ نے اس کے منصوبوں کو درہم برہم کرنے کی طرف توجہ فرمائی اور عمروؓ بن امیہ الضمری اور ایک انصاری کو اس غرض سے مکّے روانہ فرمایا کہ وہاں جاکر دہشت پھیلائیں اور وہاں کے نظم میں کمزوریاں پیدا کریں۔ انہیں یہ بھی اجازت دی گئی کہ اگر موقع ملے تو ابوسفیان کو قتل کر دیا جائے۔ جب یہ دونوں مکّے کے قریب بطن میں پہنچے تو انہوں نے اپنے اونٹ کو ایک درّے میں باندھ دیا اور خود مکّے میں داخل ہُوئے۔ مگر ان سے غلطی یہ ہُوئی کہ اُنہوں نے اس کی احتیاط نہ کی کہ طوافِ کعبہ کے وقت پہچانے نہ جائیں پھر انہوں نے مکّے میں گھومنے پھرنے کے وقت کا انتخاب بھی صحیح نہیں کیا اور روشنی کا لحاظ نہیں رکھا۔ چنانچہ جب وہ ایک مجلس کے قریب سے گذرے تو ایک شخص نے عمروؓ کو پہچان لیا اور جب وہ چلّایا تو لوگ ان کے تعاقب میں دوڑے +

عمروؓ اپنے رفیق کے ساتھ ایک غار میں چھُپ گئے۔ جس وقت وہ غار میں چھُپے ہوئے تھے تو ایک شخص عثمان بن مالک بن عبیداللہ التیمی گھوڑے پر سوار غار کے مُنہ پر آکر کھڑا ہوگیا، پھر اُتر کر بیٹھ گیا۔ عمرو نے خاموشی سے نکل کر اس کے سینے میں خنجر پیوست کر دیا اور ابنِ مالک ایک چیخ مار کر گر گیا۔ مکّے والے اس کی آواز سُن کر دوڑے، ابنِ مالک نے کہا کہ مجھے عمروؓ بن امیہ نے خنجر مارا ہے۔ اتنا کہکر وہ مرگیا۔ لوگ لاش اُٹھا کر مکّے لے گئے۔ یہ دونوں دو دن تک غار میں چھپے رہے۔ پھر وہاں سے تنعیم کے شہر میں آئے۔ جہاں اُنہوں نے خبیبؓ کی لاش کو سُولی پر لٹکے ہُوئے دیکھا۔ عمروؓ پہرہ داروں کی نگاہ بچا کر آگے بڑھا اور لاش اُتار کر اور پیٹھ پر اٹھا کر تقریباً چالیس گز جاچکا تھا کہ پہرہ داروں نے دیکھ لیا، لہٰذا وہ اس کے پیچھے بھاگے، عمروؓ لاش کو چھوڑ کر بھاگ گیا اور صفرا کی راہ لی۔ وہاں سے خود مدینے کی طرف پیدل روانہ ہوا اور اپنے ساتھی کو تمام خبروں کی اطلاع دینے کے لئے اونٹ پر سوار کر کے آگے بھیج دیا +

جب عمروؓ غلیل جحنان پہنچا تو وہاں اس نے بنی الدئل بن بکر کے ایک قوی جوان کو سوتے میں قتل کیا اور رکوبہ روانہ ہوگیا۔ یہ جوان ابوسفیان کا جاسوس تھا اور اُسے مسلمانوں

کی خبریں پہنچایا کرتا تھا۔ رکوبہ سے نقیع پہنچا۔ یہاں اسے مکے کے دو آدمی ملے جو جاسوسی کے لئے مدینے گئے تھے اور وہاں سے خبریں لے کر قریش کے پاس واپس جا رہے تھے۔ عمرؓ نے انہیں پہچان کر ان سے لڑائی لڑی اور ایک کو تیر سے ہلاک کر کے دوسرے کو پکڑ کر مدینے لے آیا +

غزوۃ السّویق یا بدرِ ثانی۔

غزوۃ السّویق ۳ھ ہجری میں واقع ہوا۔ ابوسفیان نے اُحد سے جاتے وقت پکار کر کہا تھا کہ اگلے سال بدر میں پھر جنگ ہو گی۔ اس کے مطابق قریش نے زبردست تیاری کی۔ دُور دُور کے قبائل کو حلیف بنا کر ان سے رفاقت کے وعدے لئے، مشہور مقامات سے اچھے اچھے ہتھیار منگائے گئے، بہت سے قبائل مکے میں جمع ہوئے اور رسد وغیرہ کا بھی بہت عمدہ انتظام کیا گیا۔ غرض ہزاروں پیادوں اور سواروں کی جمعیّت فراہم کر کے ابوسفیان مکے سے روانہ ہو کر مرالظہران کے نواح میں مجنّہ کے مقام پر اس غرض سے ٹھہرا کہ دوسرے حلیف قبائل آ کر مل جائیں کہ وہاں اسے نعیم بن مسعود جو مدینے سے عمرہ کی غرض سے مکے جا رہا تھا ملا۔ اس نے اس سے آنحضرتؐ کی جنگی تیاریوں کا حال پوچھا تو اس نے کہا وہ بالکل تیار ہیں۔ اس سے وہ بہت گھبرایا اور سہیل بن عمرو کو ضامن بنا کر نعیم بن مسعود سے کہا کہ اگر تم آنحضرتؐ کو کسی بہانہ سے بدر کی طرف بڑھنے سے روک دو تو بہت بڑی رقم انعام میں دوں گا۔ خشک سالی کی وجہ سے ہم اتنے بڑے لشکر کا خاطر خواہ انتظام نہیں کر سکے۔ مگر ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ وعدے کی خلاف ورزی ہماری طرف سے ہو۔ نعیم نے اس بات کو مان لیا۔ اور مدینے آ کر مسلمانوں سے خفیہ طور پر کہنے لگا کہ ابوسفیان بہت بڑا لشکر لے کر آ رہا ہے اور اس کے ساتھ بہت سے قبائل بھی ہیں لہٰذا آنحضرتؐ کو بدر جا کر خواہ مخواہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتے بلکہ مدینے ہی میں رہ کر دشمن کا انتظار کرنا چاہئے۔ یہ سُن کر مسلمانوں میں تشویش پیدا ہوئی اور عبداللہ بن ابی سلول کہنے لگا کہ ہمیں شہر ہی میں محصور ہو کر لڑنا چاہئے۔ بہت سے مسلمانوں پر بھی دشمن کے اس پروپیگنڈے کا اثر ہوا +

آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو آپ نے جہاد کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمان جاری

کیا کہ اہلِ لشکر اپنے ساتھ سامانِ تجارت بھی لے چلیں تاکہ بدر کے بازار میں دشمن کے آنے سے قبل اور اسے شکست دینے کے بعد تجارت کر سکیں۔ اس کے بعد آپؐ مجاہدین کے لشکر کو لے کر بدر پہنچ گئے۔ بدر کے قیام کے دوران میں مخشی بن عمرو الضمری جس نے بنی ضمرہ کی طرف سے دورانِ قیام کے لئے مصالحت کی تھی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب آنحضرتؐ کو اس کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ بدر میں اسلامی لشکر کے آنے سے خوش نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا اگر تم مصالحت توڑنے کی غرض سے آئے ہو تو بہتر ہے میں تم سے بھی لڑنے کو تیار ہوں۔ وہ خوف زدہ ہوگیا اور آنحضرتؐ سے معذرت کر کے چلا گیا۔ اسی اثناء میں معبد بن ابی معبد الخزاعی بھی اُدھر سے گذرا مگر اسے بھی آنحضرتؐ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

آنحضرتؐ نے بدر میں آٹھ روز تک قیام کیا۔ چونکہ اس وقت گرد و نواح میں قحط پڑا ہُوا تھا اس لئے مسلمانوں کا لایا ہُوا سامان دس گنی قیمت پر بکا۔ جب آپؐ کو یقین ہوگیا کہ ابوسفیان پیشقدمی کی بجائے پسپائی اختیار کر کے مکے کو واپس چلا گیا ہے تو مدینے تشریف لے آئے۔ اب مسلمانوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے اور مشرکین و دشمنانِ اسلام کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونے لگے۔

نتائج و اسباق۔

گو ان مہموں میں جنگ و جدال نہیں ہُوا مگر آنحضرتؐ کی ان دفاعی کارروائیوں سے بہت سے مفید سبق ملتے ہیں:۔

۱۔ موجودہ زمانے کے دفاعی مبصرین کی متفقہ رائے ہے کہ جب قبائلیوں سے جدال و قتال کرنا پڑے تو لازمی طور پر بے باکی و دلیری سے کام لیا جائے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ان کا دشمن مورچوں پر ان سے پہلے پہنچ جائے گا تو ان کی ہمت جواب دے دیتی ہے۔ آنحضرتؐ کے اقدامات سے اس رائے کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲۔ اس قسم کی جنگوں اور مہموں کے لئے لازمی ہے کہ خبر رسانی کا خفیہ سلسلہ نہایت مرتب و مکمل ہو تاکہ دشمن کی نقل و حرکت کی تمام اطلاعات بر وقت ملتی رہیں۔

۳۔ ایسے علاقوں میں متحارب فوجوں کو جنگی اہمیت کے تمام انتظامات کا علم ہونا ہے

لہٰذا جو فوج پیشقدمی کرکے ان پر قبضہ کر لیتی ہے وہ اپنے حریف کو نہتا اور کمزور کر دیتی ہے ۔ مثلاً پانی کے چشمے، درّے اور سامانِ رسد کی فراہمی کے مقامات یعنی نخلستان وغیرہ گویا ایسی جنگوں میں دفاعی پیشقدمی نہایت ضروری ہے +

۴ ۔ دشمن پر ہر وقت نظر رکھی جائے اور اس غرض کے لئے خفیہ نگار، چھوٹے چھوٹے فوجی دستے، یا بڑے فوجی دستے جو بوقتِ ضرورت دشمن کا مقابلہ بھی کر سکیں روانہ کئے جائیں +

گویا آج کے دفاعی مبصرین نمبر ۳ اور ۴ میں جو کچھ کہتے ہیں وہ آنحضرتؐ کے پوری طرح مدِنظر تھا ۔ نجد کی طرف آپؐ ایک طاقتور دستہ لے کر اسی لئے تشریف لے گئے کہ وہاں کے حالات سے صحیح واقفیت حاصل کریں ۔ یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے نہ تو قافلے کا تعاقب کیا اور نہ بنو غطفان کے قبائل سے جنگ کی ۔ یہ مہم محض طاقت کے مظاہرہ اور صحیح حالات کے مطالعہ کے لئے تھی +

۵ ۔ دشمن کے علاقوں میں ففتھ کالم یعنی چالباز دستے اور کمانڈو یعنی جانباز دستے روانہ کئے جائیں ۔ آپؐ نے یہ دستے روانہ کئے اور اس قسم کے دستوں سے مدافعت کا نہایت عمدہ انتظام فرمایا +

۶ ۔ بدعہد اور معاند قبیلوں کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ رحمدلی اور نرمی کو کمزوری پر محمول کرتے ہیں ۔ اس طرح نہ صرف وہ دلیر بنتے ہیں بلکہ باقی قبائل کے سامنے بُری مثال پیش کرتے ہیں اور بدامنی پھیلاتے ہیں +

آنحضرتؐ نے بنو نضیر کی بدعہدی پر ان کو جو سزا دی وہ اس اصول پر نہ صرف صحیح تھی اور اس سے نہ ہی صرف اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ اس کا ضروری و لازمی ہونا بھی ثابت ہوتا ہے +

۷ ۔ ان فوجوں کی تربیت و تنظیم جنہیں اس قسم کے قبائلی دشمنوں سے لڑنا پڑے حسبِ ذیل طریقہ پر مکمل ہونی چاہئے ۔ اسی تربیت و تنظیم سے وہ دشمن کے خلاف کامیابی حاصل کر سکتی ہیں :-

(ا) تمام سپاہیوں اور افسروں کی جسمانی حالت بہترین ہو تاکہ وہ محنت کش ۔ بُردبار اور متحمل ہوں اور طویل سفر کر سکیں ۔ آرام طلب نہ ہوں، بلکہ سخت کوشش و

سخت جان ہوں +

(ب) دن اور رات کو سفر کرنے کے یکساں عادی ہوں +

(ج) تمام فوجی دفاعی عیاری سے واقف ہوں تاکہ دشمن ان پر دھوکہ سے اچانک حملہ نہ کر سکے +

(د) ہر سپاہی اور افسر کے دل میں دشمن پر ناگہانی حملہ کرنے کا جذبہ ہو اور ہر شخص جوابی حملہ کی مدافعت کے لئے تیار رہے - اس کام کی تربیت و تکمیل کے لئے فوج میں سے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف مہمات پر بھیجے جائیں تاکہ ہر سپاہی اکا دکا استقلال و دور اندیشی سے دشمن پر دفاعی پیشقدمی کر سکے +

(ر) دشمن کو اپنے دفاعی منصوبے اور نقل و حرکت سے بے بہرہ اور مبتلائے فریب رکھا جائے +

(س) ہر سپاہی کو اپنے اور دشمن کے علاقے میں گشت لگانے کے قابل بنایا جائے +

(ش) دشمن پر فوقیت رکھنے کا اعتماد ساری فوج میں ہونا چاہئے - فوقیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ فوج کا ہر فرد اپنے اسلحہ کے استعمال میں ماہر، نظم وضبط کا پابند اور قوتِ ارادی کا حامل ہو +

پچھلے اوراق میں اس کا بارہا ذکر آچکا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مجاہدین میں سے متعدد افراد اور متعدد جماعتوں کو مختلف موقعوں پر دشمن کی جاسوسی کرنے، ان کا تعاقب کرنے، ان میں ہراس پھیلانے ان سے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا کبھی کبھی آپؐ خود بھی ایسے دستوں کے ساتھ تشریف لے گئے - پھر ایسے راستوں سے بھیجا (اور بہ نفسِ نفیس بھی تشریف لے گئے) جو انتہائی دشوار گذار تھے - اس میں نہ دن کی قید تھی نہ رات کی - خفیہ مہموں میں انتہائی رازداری سے کام لیا گیا۔ اور آنحضرتؐ کے فیضِ تربیت سے آپؐ کی فوج کے اعلیٰ و ادنیٰ مجاہدین اتنے مکمل فوجی تھے اور ہدایاتِ مبارک پر اس طرح من وعن عمل کرتے تھے کہ ان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی تشنۂ تکمیل و تعمیل نہ رہتا تھا - دلیری و جان بازی میں

ہر شخص منفرد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجاہدین مٹھی بھر ہیں اور کفار و مشرکین غول در غول، مگر فتح و نصرت انہی کے قدم چوم رہی ہے۔ اگر دغا و فریب سے دشمن کے نرغے میں آ گئے ہیں تو جوہرِ مردانگی دکھا کر جام شہادت نوش کر لیا مگر ایمان و عمل پہ حرف نہ آنے دیا اور دنیا سے رخصت ہوئے تو اس طرح کہ دشمن بھی عش عش کر اٹھا۔ جرأت، بے باکی، استقلال، پامردی، شجاعت اور جانبازی و فداکاری ان کا طغرائے امتیاز تھا۔ آنحضرتؐ کو دشمن قبائل کا علم تھا مگر آپ کی طاقت و عظمت کا خوف اتنا تھا کہ کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ نہ دعوتِ اسلام قبول کرتے تھے، نہ انہیں آپ کا بڑھتا ہوا اقتدار بھاتا تھا۔ مگر مجبوری کی وجہ سے خاموش تھے۔ اس طرح آپؐ نے قریش کی طاقت ختم اور اپنا دفاعی مقصد حاصل کیا اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کی عملی تعبیر پیش کر کے بطور مشعلِ راہ ایمان والوں کے لئے دفاعی حدیث چھوڑی۔ صلی اللہ علیہ وسلم!

غزوۂ خندق

غزوۂ خندق کے اسباب کے متعلق مورخین کی رائے میں اختلاف ہے مگر ہمارے نزدیک اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ غزوۃ السّویق نے نہ صرف اہل مکہ میں مایوسی کے ساتھ انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی بلکہ دوسرے قبائل کو بھی خوف زدہ کر دیا تھا اور ان سب کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اب نہ روکا گیا تو ان کی طاقت کا سیلاب انہیں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ مسلمان فوج کے ضبط و نظم، اس کی جرأت مندی و بے باکی، اولوالعزمی و حوصلہ مندی، جاں بازی اور ایثار پیشگی کا منظر ایسا ہیبتناک تھا کہ اس کے سامنے کسی کو ٹھہرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ اپنی آزادی و اختیار کو چند روز کا مہمان سمجھنے لگے۔ جہاں دوسرے قبائل کو اس قسم کے خطرات لاحق تھے وہاں یہودیوں کو اپنی فتنہ پردازیوں اور بدعہدیوں کی وجہ سے کلّی استیصال کا اندیشہ تھا۔ انہوں نے سوچا کہ یہاں بھی وہی حشر نہ ہو جو شام میں ہوا تھا اس لئے قدرتی طور پر ان کی نظریں بھی قریش کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ اُحد کی جنگ نے ان کے دلوں میں امید کی ایک جھلک پیدا کر دی تھی مگر غزوۃ السّویق نے اس کو بھی ختم کر دیا۔

حیّی بن اخطب، کنانہ بن الربیع، بنو فزارہ، بنو وائل اور قبائل میں سے غطفان، عینیہ بن حصین بن حذیفہ بن بدر، حارث بن عوف بن ابی حارثہ، المری بنو مرہ، بنو اشجع وغیرہ مکّے میں جمع ہوئے اور قریش کو آنحضرتؐ کے خلاف منصوبۂ جنگ تیار کرنے کی دعوت دے کر اپنی طرف سے پُوری پوری مدد کا اطمینان دلایا +

آنحضرتؐ کو ان حالات کی اطلاعات برابر موصول ہو رہی تھیں۔ قریش اگرچہ انتقام لینے پر تُلے ہُوئے تھے مگر ان قبائل کے جذبۂ نبرد آزمائی کا امتحان لینے کے لئے انہوں نے یہود سے سوال کیا کہ کیا تم بت پرستوں کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہو،

کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کو اہلِ کتاب سمجھ کر ہمارے ساتھ دغا کرو۔ اس کے جواب میں یہودیوں نے انہیں اپنی مدد و تعاون کا پورا یقین دلایا جس سے قریش کو ان کی طرف سے کلی اطمینان ہو گیا۔

جب جنگ کا خطرہ نہ رہا اور قریش نے حملہ کی تیاریاں مکمّل کر کے مدینے کا رُخ کیا تو آنحضرتؐ نے بھی جہاد کا حکم دے دیا اور سامانِ حرب و ضرب اور رسد وغیرہ کا معقول انتظام فرما کر طے کیا کہ اتحادی مشرکوں کا مدینے میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ آپؐ نے سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مشرکین کو ایسے نئے طریقے پر جنگ کرنے کے لئے مجبور کیا جس کے وہ قطعاً اہل نہیں تھے۔ آپؐ نے چھوٹے چھوٹے آطاموں میں قلعہ بند ہونے کی بجائے مسلم اور حلیف بستیوں کو ایک خندق کے اندر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سے دوسرے فائدوں کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تمام مسلمان اور ان کے حلیفوں کی فوج براہِ راست آنحضرت صلعم کی کمان میں آ گئی۔ آنحضرتؐ نے خندق کے خطوط خود لگائے اور حدود مقرر کر کے ہر قبیلہ کو اپنی حد کا حصّہ خود کھودنے پر مامور کیا۔ کھُدائی کے کام میں آپؐ نے بھی بہ نفسِ نفیس حصّہ لیا۔ مسلم کیمپ کے منافقین نے خندق کھودنے میں کوئی شرکت نہیں کی اور اپنی غیر حاضری کی عذر تراشیاں کرتے رہے مگر کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔

جنگِ اُحد کے باب میں لکھا جا چکا ہے کہ آنحضرتؐ کے دفاعی نقطۂ نظر سے مدینے کو حملے کا سب سے زیادہ اندیشہ شمال کی جانب سے تھا، کیونکہ اس طرف ایک کھُلا ہُوا میدان ہے۔ لہٰذا جب مدینے کے گرد خندق کھودنے کا فیصلہ کیا گیا تو کھدائی کا کام سب سے پہلے اسی طرف سے شروع ہُوا۔ آنحضرتؐ نے چند انصار و مہاجرین صحابہؓ کو ساتھ لے کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کے چاروں طرف کے علاقے کا معائنہ فرمایا تاکہ مختلف آطام میں جتنی عورتیں، بچے اور مویشی رکھنے کی تجویز ہو اسی کے مطابق خوراک وغیرہ کا سامان جمع کیا جائے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر مجاہدین کے پڑاؤ چُنے گئے۔ شہر کے جس طرف باغات اور ان کے گرد احاطے تھے ان کو بغور دیکھ کر اور دشمن کے نفوذ کے امکان کو مدِّنظر رکھ کر طرح طرح کی مزاحمتیں پیدا کی گئیں۔ ایسے تنگ راستوں پر جہاں ایک ہی وقت میں ایک ہی اونٹ چل سکتا تھا

چوکیاں مقرر کی گئیں اور ان کو قلعہ بند کر دیا گیا تاکہ دشمن تنگ گلیوں کو بھی استعمال نہ کر سکے۔ بنی قریظہ کے یہود سے گو تعلقات اچھے تھے مگر اس طرف بھی پوری توجہ کی گئی ۔ اسی طرح جنوبی علاقے کو جہاں مختلف قبائل رہتے تھے مضبوط و مستحکم کر کے احاطوں کو جنہیں حائط کہا جاتا تھا ایک دوسرے سے ملا دیا گیا +

سامانِ رسد میں سب سے اہم مسئلہ پانی کا تھا۔ آپؐ نے اس کا بھی معقول انتظام فرمایا، تمام کنوؤں کا جائزہ لے کر پانی کی حفاظت و فراہمی کا پورا پورا بندوبست کیا اور ذُباب میں ایک نیا کنواں کھُدوایا +

شمالی خندق کو حُرۂ شرقی سے حُرۂ غربی تک اور جبل سلع کے مغربی دامن سے گذار کر دوبارہ وادیٔ بطحان سے ملایا گیا پھر یہاں سے وادیٔ بطحان کے اندر وادیٔ محفوظ سے گذار کر دیارِ بنی قریظہ تک لائی گئی۔ شمالی خندق کی لمبائی ساڑھے تین میل سے زیادہ تھی۔ اس کی تکمیل تین ہفتے میں ہوئی، اس کے ساتھ ہی دوسری جانب کی خندقوں کی تکمیل کا کام ہوا۔ چونکہ اس میں قدرتی نشیب و فراز اور وادیوں کا پوری طرح استعمال کیا گیا تھا لہٰذا خندق کا بڑا حصہ قدرتی رکاوٹوں سے بن گیا تھا۔ خندق کی گہرائی اور چوڑائی ایسی رکھی گئی کہ کوئی سوار اس کو پھاند کر اندر نہ آسکے +

جب خندق تیار ہو گئی تو اس کے دروازے مقرر کئے گئے اور ہر دروازہ پر ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی محافظ رکھا گیا اور زبیر بن عوامؓ کو ان سب کا سردار بنا کر آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ اگر لڑائی ہوتے دیکھیں تو لڑنا شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ اُونچی اُونچی چٹانوں اور آطاموں پر تیر انداز مقرر کئے تاکہ دشمن کو خندق پار نہ کرنے دیں +

آنحضرت صلعم نے اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر جبل سلع پر رکھا اور آپؐ کا خیمہ جبلِ ذُباب اور جبلِ سلع کے مابین ایک محفوظ مقام پر لگایا گیا جہاں اب بطور یادگار ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں چاروں نائب سالاروں یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سلمانِ فارسیؓ اور حضرت ابوذرؓ کے خیمے تھے وہاں بھی مسجدیں بنی ہوئی ہیں +

اسلامی لشکر کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ اس کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان حصوں میں سے گشت کے لئے چھوٹے چھوٹے دستے بھیجے جاتے تھے۔ تیر انداز

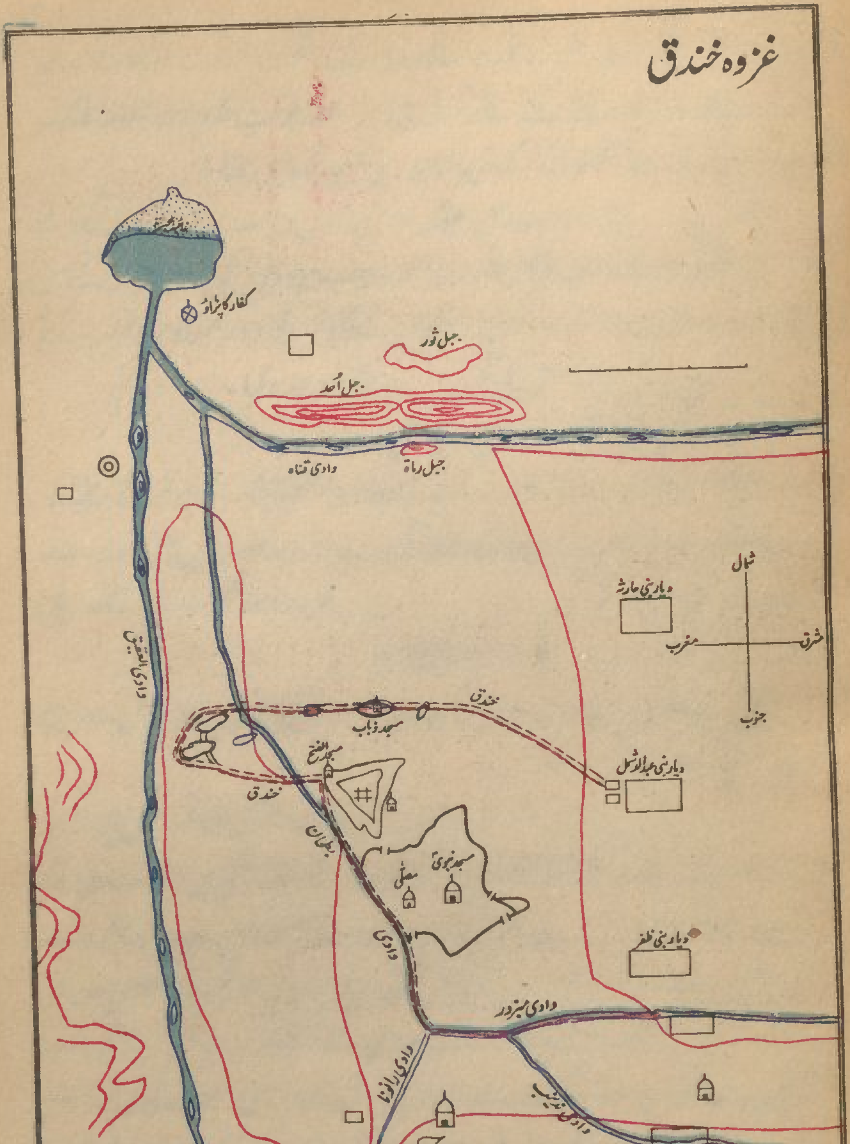
غزوہ خندق
کفار کا پڑاؤ
جبل ثور
جبل اُحد
وادی قناۃ
جبل رماۃ
شمال
مغرب
مشرق
جنوب
دیار بنی حارثہ
خندق
مسجد ذباب
مسجد الفتح
دیار بنی عبدالاشہل
خندق
وادی العقیق
بطحان
مسجد نبوی
مصلیٰ
وادی
دیار بنی ظفر
وادی مہزور
وادی رانونا
جبل عسیر

اپنے مورچوں پر مستعد تھے۔ ماتحت سالاروں کے ماتحت مختلف مقامات پر مختلف دستے تعینات کئے گئے تھے مگر فوج کا بڑا حصہ بوقتِ ضرورت بطورِ کمک روانہ کرنے کے لئے آنحضرتؐ کے زیرِ کمان اپنی کمین گاہ میں تھا +

بنونضیر چونکہ مدینے سے جلاوطن ہو کر اور اپنا مال و اسباب لے کر گئے تھے اس لئے انہوں نے مخالف قبائل خصوصاً ہم مذہب یہودیوں کو برانگیختہ کرنے میں بہت زیادہ حصہ لیا اور سب نے مل کر غطفان کے قبائل کو بطورِ معاوضہ خیبر کے تمام نخلستانوں کی ایک فصل کی کھجوریں دینے کا وعدہ کیا +

دشمن کے فوجی پڑاؤ کی ترتیب اس طرح تھی :۔

بنوقریش، بنوکنانہ اور بنواحابش بڑرومہ سے وادی العقیق تک پھیلے ہوئے تھے +

بنوغطفان اور بنواسد مدینے کے شمال کی جانب وادی النعمان میں جبل اُحد سے بڑرومہ کے مشرق تک خیمہ زن تھے۔ یعنی جہاں جہاں کھیت اور نخلستان تھے وہاں ان کے مختلف حصوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا +

قریش کے لشکر کی تعداد دس ہزار یا اس سے زیادہ تھی۔ اہلِ حجاز نے اس سے پہلے اتنا بڑا لشکر کبھی نہیں دیکھا تھا +

اگرچہ مورچہ بندی ہو چکی تھی اور جنگ چھڑنے کا ہر وقت احتمال تھا مگر منافق اپنی سرگرمیوں میں برابر مصروف تھے۔ بنوقریظہ آنحضرتؐ کے حلیف تھے لہٰذا حُیَیّ بن اخطب ان کے سردار کعب بن اسد کے پاس آیا تاکہ اسے ورغلا کر مسلمانوں سے الگ کر دے۔ شروع میں اُسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے یہ قبائل موقع کے منتظر ہوں اور یہ دیکھ رہے ہوں کہ قسمت جس کا ساتھ دے اسی کے طرفدار بن جائیں۔ چنانچہ جب مشرکین کے لشکر میں اضافہ کی وجہ سے محاصرہ کی شدّت بڑھی، خوراک کی کمی محسوس کی جانے لگی، اور تجارت رُک جانے سے معاشی کمزوری کے آثار ظاہر ہونے شروع ہوئے تو بنوقریظہ کے یہودیوں نے بھی رنگ بدلنا شروع کر دیا اور آخر کار حُیَیّ بن اخطب سے معاہدہ کر کے آنحضرت صلعم کے پیمانِ دوستی کو توڑ دیا +

آنحضرت صلعم کو اس کی خبر لگی تو آپؐ نے تصدیق کے لئے قبیلۂ اوس کے رئیس سعد بن معاذؓ اور بنوخزرج کے رئیس سعد بن عبادہؓ کو چند صحابہ کے ہمراہ بنوقریظہ کے

پاس بھیجا اور یہ ہدایت فرمائی کہ اگر یہ خبر صحیح نکلے تو نہایت رازداری سے مجھ سے علیحدہ گی میں بتا دینا تاکہ دوسرے حلیفوں کے حوصلے پست نہ ہوں اور اگر غلط ہو تو فرودگاہ میں پہنچکر اس کا اعلان کر دینا۔

یہ جماعت وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ کعب بن اسد نے نہ صرف دوستی کا عہد توڑ دیا ہے بلکہ دشمن سے مل کر درپئے آزار ہے۔ اس نے مسلمانوں کو دیکھ کر کہا کہ مَیں نے محمدؐ سے کبھی کوئی پیمان نہیں کیا۔ مَیں تو مدت سے ایسے وقت کا منتظر تھا کہ اُن سے انتقام لوں۔ آنحضرتؐ کو اس کی اطلاع ملی تو اہلِ لشکر سے فرمایا، مسلمانو! بشارت ہو کہ اب ہماری دُشواریاں بڑھ گئی ہیں مگر ہماری بھلائی اسی میں ہے۔

چونکہ حالات بظاہر بدل رہے تھے اس لئے منافقین کو باتیں بنانے اور طنز و تعریض کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اُنہوں نے اپنی منافقانہ سرگرمیوں میں پہلے سے زیادہ اضافہ کر دیا تاکہ مُسلمانوں کے جی چھُوٹ جائیں اور وہ اضطراب و مایوسی کا شکار ہو کر بیٹھ رہیں۔

اسی دوران میں بنو حارثہ کے اوس بن قیظی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ مَیں اپنی قوم کی طرف سے یہ درخواست لایا ہوں کہ چونکہ ہماری بستی خندق کے باہر ہے اور دشمن بہت قریب ہے اس لئے آپ ہمیں اجازت دیجئے تاکہ ہم اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ آپؐ نے یہ سُن کر انہیں کچھ روز صبر کرنے کی تلقین فرمائی۔

اب محاصرے کو تقریباً ایک مہینہ گذر چکا تھا مگر دست بدست لڑائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مُشرکین نے کئی مرتبہ خندق کو پار کرنے کی کوشش کی لیکن مجاہدین کی ہُشیاری و مُستعدی دیکھ کر ہر دفعہ اپنے ارادے میں ناکام رہے۔

غزوۂ خندق کا یہ وقت مسلمانوں کے لئے بڑا پریشان کن اور صبر آزما تھا۔ ایک طرف وہ دشمنوں سے گھرے ہُوئے تھے، دوسری طرف جنگ کے شدائد اور کھانے پینے کی تکلیف، تیسری طرف منافقوں کی غدّاریاں اور دغا بازیاں اور یہودیوں کی بدخواہیاں۔ اگرچہ جان نثارانِ اسلام اور شمع رسالت کے سچے پروانوں پر ان حالات کا کوئی اثر نہیں تھا تاہم آنحضرتؐ کو ان کا پُورا احساس تھا لہٰذا آپؐ بھی سیاسی تدبیروں سے غافل نہ تھے۔ آپؐ کی طرف سے بھی دشمن کو کمزور و پست حوصلہ کرنے کی کوشش جاری تھی۔ آپ کو اس میں کامیابی ہُوئی اور آپؐ نے قریش کے حلیفوں میں اختلاف و بدگمانی پیدا کر دی۔

چنانچہ اسی دوران میں قبیلہ غطفان کے سرداروں نے موقعہ سے فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ شرط پیش کی کہ اگر مدینے کی فصل کا ایک تہائی حصّہ ہمیں مِل جایا کرے تو ہم اپنی جمعیّت کو واپس لے جانے کے لئے تیار ہیں۔ آنحضرتؐ نے اس پر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ سعدؓ بن معاذ اور سعد بن عبادہؓ نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ ہم اللہ کے بھروسے پر جنگ جاری رکھیں گے۔ بنو غطفان مُدت سے مدینے کے نخلستانوں پر قبضہ کرنے کے آرزومند ہیں۔ مگر ہم اپنے حقوق کی حفاظت تلوار سے کریں گے اور اب تو خدا اور خدا کا رسولؐ ہمارے ساتھ ہے +

آنحضرتؐ نے ان کی شرط رد کر دی +

مشرکین بھی محاصرے سے تنگ آ گئے تھے۔ اس کی مُدت جتنی بڑھتی جا رہی تھی ان کی مشکلات میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عرب قبائل ہیں جو قریش کے ساتھ آئے تھے بد دلی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ لڑائی دو تین روز میں ختم ہو جائے گی اس لئے وہ ساتھ چھوڑنے پر آمادہ تھے۔ ایک دن ابوسفیان اپنے بہادروں کو لے کر خندق کے اندر اُتر گیا مگر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اس کے بعد چند سردارانِ مکّہ اور چند شہسوار عمر بن عبدود وغیرہ خندق کو عبُور کر کے اندر آ گئے۔ حضرت علیؓ نے جوابی حملہ کر کے ان کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دو آدمی نکل کر بھاگے۔ ان میں سے ایک گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا دوسرا خندق پار کرتا ہوا تیر سے زخمی ہُوا اور دُوسری طرف جا کر مر گیا۔ حملہ آور مشرکین کا یہ انجام دیکھ کر دشمنوں کے حواس جاتے رہے۔ اسکے بعد کسی نے خندق پار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لشکرِ اسلام پر اس کا بہت اچھا اثر ہُوا۔ میدانِ جنگ میں مسلمان عورتیں بڑی دلیری و مُستعدی سے طبّی امداد، زخمیوں کی خبر گیری اور کھانا وغیرہ پہنچانے کا کام کر رہی تھیں +

جس وقت محصوری کی وجہ سے مشکلات میں یوماً فیوماً اضافہ ہو رہا تھا اور جنگ کوئی فیصلہ کن صورت اختیار نہیں کر رہی تھی ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ آنحضرتؐ نے قبیلہ غطفان کی شرطِ مصالحت کو رد کر دیا تھا لیکن امتدادِ محاصرہ نے ان کے خیالات میں بھی بہت کچھ تبدیلی کر دی تھی۔ ایک روز غطفان کے رئیس نعیم بن مسعود بن عامر بن انیف بن ثعلبہ بن قنفذ بن ہلال بن غطفان آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور اسلام

قبول کر کے عرض کیا کہ اگرچہ میں مسلمان ہوگیا ہوں مگر اس کا علم میری قوم کو نہیں ہے تاہم آپؐ مجھے جو حکم دیں گے اس کی بسروچشم تعمیل کروں گا +

آنحضرتؐ نے انہیں علیحدگی میں لیجا کر ایک منصوبہ بتایا۔ اسے سمجھ کر وہ بنو قریظہ کے پاس گئے۔ بنو قریظہ نعیم کو بہت مانتے تھے۔ دوران گفتگو میں انہوں نے جنگ کے نتائج کا ذکر چھیڑ کر کہا کہ غطفان اور قریش محمدؐ سے لڑنے آئے ہیں مگر ان کی حالت آپ سے مختلف ہے۔ اگر انہیں شکست ہوئی تو وہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے اور محمدؐ کے لشکر سے محفوظ ہو جائیں گے۔ مگر تم لوگوں نے اپنے متعلق کیا سوچا ہے۔ تمہیں تو محمدؐ کے قریب ہی رہ کر زندگی بسر کرنا ہے۔ دُور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ تم قریش اور غطفان سے ان کے کچھ سردار بطور یرغمال لے کر اپنے پاس رکھو تاکہ وہ تمہارے ساتھ دھوکہ نہ کر سکیں اور آخر وقت تک لڑیں۔ اگرچہ وہ لوگ میرے قریبی عزیز ہیں مگر اس معاملے میں میری رائے یہی ہے۔ اب آپ جانیں آپ کا کام +

بنو قریظہ نے نعیمؓ کی اس رائے کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اب ان کے دماغوں میں انتشار پیدا ہوا اور سوچنے لگے کہ کہیں ہمارا حشر بھی بنو نضیر کی طرح نہ ہو۔ اُنہوں نے نعیمؓ کی بات گرہ میں باندھ لی +

نعیمؓ بنی قریظہ کے پاس سے اُٹھ کر قریش کے پاس پہنچے۔ وہاں اُنہوں نے اُن کی بہت آؤ بھگت کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر نعیمؓ نے ابو سفیان کو علیحدہ لیجا کر کہا کہ مجھے ایک ایسی اطلاع ملی ہے کہ اگر آپ پہ ظاہر نہ کروں تو حق دوستی ادا کرنے سے قاصر رہوں گا۔ پھر اس کو راز میں رکھنے کا وعدہ لے کر انہوں نے کہا' مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی محمدؐ کے ساتھ اپنے تعلقات کے انقطاع پر نادم ہیں۔ اس لئے اُنہوں نے محمدؐ سے کہلا بھیجا ہے کہ اگر ہم قریش و غطفان کے چیدہ چیدہ سرداروں کو آپؐ کے حوالے کر دیں تو امید ہے کہ آپؐ ہمارا قصور معاف کر دیں گے۔ ہم آپؐ کے ساتھ مل کر حملہ آوروں سے لڑنے کے لئے بھی تیار ہیں' ہمیں اس کارروائی سے کامیابی کی امید ہے کیونکہ حملہ آوروں کے دلوں پر سرداروں کے قید ہو جانے سے مایوسی چھا جائے گی۔ چنانچہ محمدؐ نے اس منصوبے پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی ہے +

ابو سفیان کمزور دل کا انسان تھا' وہ بھی اس چال میں آگیا اور اس کے خیالات بھی

پراگندہ ہوگئے +

قریش سے مل کر نعیم بنو غطفان کے پاس آئے اور اپنے قبیلے کے سرداروں سے رازداری کا عہد لے کر کہا کہ میں آپ ہی لوگوں میں سے ہوں لہٰذا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو دشمن کی چالوں سے آگاہ کر دوں۔ بنی قریظہ ابوسفیان سے اور ہم سے بطور یرغمال معزز سرداروں کو طلب کریں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم لوگ اپنے سرداروں کو قربانی کا بکرا نہ بننے دینا خواہ قریش اپنے سردار بھیجنے پر رضامند ہو جائیں +

ابوسفیان اور غطفان کے ذمہ داروں نے نعیم کی دی ہوئی خبر اور مشورہ کا ایک دوسرے سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ البتہ یہ طے کیا کہ عکرمہ بن ابی جہل کو چند سرداران قریش و غطفان کے ساتھ بنی قریظہ کے پاس بھیجا جائے اور ان سے یہ کہا جائے کہ کل صبح وہ اپنے دیار میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے تیار رہیں اور ابوسفیان کا حکم ملتے ہی چاروں طرف سے حملہ کر کے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ اتنی جلدی حملہ کرنے کی وجہ یہ پیش کی کہ جس جگہ ہم نے پڑاؤ ڈالا ہے وہاں اتنے بڑے لشکر کے لئے طویل عرصے تک قیام کرنا مناسب نہیں۔ جانوروں کے چارہ وغیرہ کی فراہمی میں بڑی دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے بہت سے جانور ہلاک ہو چکے ہیں لہٰذا اب ہم یہاں زیادہ عرصے تک قیام نہیں کر سکتے +

بنی قریظہ نے کہا کل تو شنبہ ہے، شنبہ کو ہم کوئی کام نہیں کرتے جس کسی نے بھی اس دن کی حرمت کی خلاف ورزی کی ہے وہ مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اُس وقت تک محمدؐ پر حملہ نہیں کریں گے جب تک آپ اپنے چند نامور سردار بطور یرغمال ہمارے سپرد نہ کر دیں گے کیونکہ بقول آپ کے آپ مشکلات سے گھرے ہوئے ہیں، اگر ہزیمت ہوئی تو آپ تو اپنے دیار کو چلے جائیں گے اور ہمیں مسلمانوں کے ظلم سہنے کے لئے چھوڑ جائیں گے ہم تنہا محمدؐ سے نہیں لڑ سکتے +

بنو قریظہ کے اس جواب سے ابوسفیان اور بنو غطفان کو یقین ہو گیا کہ نعیم نے سچی خبر دی ہے۔ انہوں نے بنی قریظہ سے کہلا بھیجا ہم تمہیں ایک آدمی یرغمال کے طور پر دینے کو تیار نہیں لیکن تم ہمارے ساتھ مل کر لڑنے کے لئے اپنے دیار سے چلے آؤ۔ بنو قریظہ کو بھی نعیم کی باتوں کی صداقت پر یقین آ گیا لہٰذا انہوں نے لڑنے

سے صاف انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ جب تک تم یرغمال نہ دو گے ہم جنگ نہیں کریں گے۔

ادھر تو آنحضرتؐ کی سیاست کاری اپنا کام کر رہی تھی اور دشمنوں کی صفوں میں اختلاف و افتراق پیدا ہو رہا تھا، دوسری طرف قدرت نے ان کے مصائب و شدائد میں اضافہ کر دیا۔ تیز و سرد ہواؤں کے جھکڑوں نے مشرکین کا خواب و خور حرام کر دیا۔ خیمے اڑ گئے، سامان تتر بتر ہو گیا، پانی کے برتن اُلٹ گئے، ایک عام ابتری۔ برہمی۔ پریشانی۔ سراسیمگی پھیل گئی۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ مصنّف کو یہاں کے موسمی شدائد کا ذاتی تجربہ ہے کیونکہ اس نے یہاں ایّامِ جنگ گذارے ہیں۔ یہاں کے موسم کی انتہاپسندیاں نہایت سخت اور ناقابلِ برداشت ہیں۔

اسی زمانے میں حُیَی بن اخطب نے بیس اُونٹ جَو سے اور متعدد بھُوسے اور کھجُوروں سے لدے ہُوئے مشرکین کی فوج کے لئے بھیجے۔ آنحضرتؐ کو وقت پر خبر لگ گئی۔ آپؐ نے اچانک حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ سے دشمن کے کیمپ میں بالکل مایوسی پھیل گئی۔ ان میں باہمی اعتماد کم ہو گیا، اور افتراق کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔

آنحضرتؐ نے دشمن کے کیمپ کے حالات معلوم کرنے کے لئے حذیفہؓ بن الیمان کو روانہ کیا۔ حُذیفہؓ چھُپ کر رات کے وقت وہاں پہنچے۔ اس وقت ابوسفیان کی مجلسِ مشاورت کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ابوسفیان نے تقریر شروع کرنے سے پہلے کہا کہ ہر شخص اپنے پاس بیٹھے ہُوئے لوگوں کے متعلق یہ اطمینان کرے کہ کوئی غیر تو موجُود نہیں۔ اس سے قبل کہ کوئی شخص حذیفہؓ سے سوال کرتا خود حُذیفہ نے دوسروں سے سوال کرنا شروع کر دیا۔ ابھی یہ سوال و جواب ہو ہی رہے تھے کہ ابوسفیان نے تقریر شروع کی اور کہا کہ "ہمارا سامانِ خوراک بہت کم رہ گیا ہے، اور موسم نہایت سرد اور خوفناک ہے جس کی وجہ سے سپاہیوں اور جانوروں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ پھر شوال کا مہینہ ہے اور ذلقعدہ سر پر ہے جس میں قریش مذہباً جنگ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں واپس چلا جانا چاہیئے اور سب سے پہلے میں اس میں پیش قدمی کرتا ہوں اور سب کو مشورہ دیتا ہوں کہ رات ہی کو چل دو تاکہ دشمن ہمارا تعاقب نہ کر سکے"۔ اس کے بعد وہ اپنے اونٹ کے پاس گیا اور اس پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی

دوسرے قریش بھی اس کے پیچھے چلدئے +

غطفان اور ان کے حلیفوں کو قریش کے چلے جانے کی خبر ہوئی تو وہ بھی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس وقت انہیں نعیمؓ کے نیک مشورے کا اور بھی احساس ہوا بنی قریظہ بھی مطمئن و مدّاح تھے کہ نعیمؓ نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ لیکن ان کی حالت قریش و غطفان سے مختلف تھی۔ وہ پریشان و سراسیمہ تھے +

جب پَو پھٹی تو مدینے کے چاروں طرف سناٹا تھا۔ آنحضرتؐ نے خبر لانے کے لئے سواروں کے دستے روانہ کئے، کچھ کو حملہ کرنے کے لئے بھیجا مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ دشمن کو ہراساں و پریشان کیا جائے جم کر لڑائی نہ لڑی جائے۔ آنحضرتؐ کو اس کا علم تھا کہ بنی قریظہ موجود ہیں اور ان کے پاس کم و بیش ایک ہزار ہتھیار بند جوان ہیں۔ اس لئے آپ مدینے کی حفاظت کے انتظام کو کمزور نہ کرنا چاہتے تھے۔ صبح کو آپؐ نے اعلان کرایا کہ اللہ اور اس کے رسُول کا ہر فرمانبردار عصر کی نماز قریظہ کے قریبی میدان میں ادا کرے۔ مگر حضرت علیؓ کو علَم دے کر اسی وقت روانہ فرما دیا +

غزوۂ بنی قریظہ۔

آپؐ نے حضرت علیؓ کو بنی قریظہ کے کنوئیں انّا پر قیام کرنے کی ہدایت کی پھر حضرت علیؓ کے وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد آپؐ بھی پہنچ گئے اور مجاہدین جوق در جوق جمع ہونا شروع ہو گئے +

بنی قریظہ کو قریش اور غطفان کے جانے کی خبر کچھ دیر پہلے ہو چکی تھی۔ ابھی وہ باہر نکلنے نہ پائے تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کے تعاقبی دستوں کو دیکھا پھر حضرتِ علیؓ کو اسلامی پرچم کے ساتھ آتے ہُوئے دیکھا۔ ان بدلے ہُوئے حالات سے وہ حیران ہو کر قلعہ بند ہو گئے +

قلعہ بند دیکھ کر اسلامی فوج نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ۲۱ دن تک اسی طرح محصُور رہے۔ اس کے بعد انہوں نے صلح کی درخواست کی اور کہا کہ ہم بھی بنو نضیر کی طرح جلاوطن ہونے کو تیار ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا گیا کہ ہتھیار رکھدو، آنحضرتؐ جو فیصلہ چاہیں گے کریں گے۔ لیکن چونکہ وہ مجرم تھے اور مجرم بھی غدّاری کے

اس لئے وہ بلاشرط ہتھیار ڈالنے پر رضامند نہ ہُوئے اور آنحضرتؐ سے یہ استدعا کی کہ ہمارے پاس ابولبابہ کو بھیج دیا جائے' ان کا قبیلہ ہمارا حلیف ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اُنہوں نے ابولبابہ سے دریافت کیا کہ ہم اپنے آپ کو مسلمانوں کے سپرد کر دیں' آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا سپرد کر دو مگر یاد اس جرم میں قتل کئے جاؤ گے۔ اُنہوں نے ہتھیار رکھنے سے انکار کر دیا اور محاصرہ طُول پکڑنے لگا۔ آخر بنی اوس (انصار) نے کہا کہ انہیں بھی جلاوطن کر دیا جائے۔ انصار کے اس مشورے پر آنحضرتؐ نے فرمایا اگر تم یہ چاہتے ہو تو اس کا فیصلہ تمہارے سردار سعد بن معاذؓ کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس کو مع یہودیوں کے سب نے خوشی خوشی منظور کر لیا +

سعد غزوۂ خندق میں زخمی ہو گئے تھے۔ لیکن اب ان کی حالت اچھی تھی۔ آنحضرتؐ کے طلب فرمانے پر آپ دیار بنی قریظہ پہنچے +

حُیّی بن اخطب قریش کے جانے کے بعد رفاقت کے وعدے کے مطابق بنی قریظہ کے پاس چلا آیا تھا تاکہ آخر وقت تک ان کے ساتھ رہے۔ اس نے انہیں بھی بنونضیر کی طرح ورغلایا اور کہا کہ ہتھیار نہ ڈالو بلکہ ان تین شرطوں میں سے کوئی پیش کر کے معاملہ کرو :-

اوّل یہ کہ ہم محمدؐ پر ایمان لائیں اور ان کی پیروی کریں۔ تمہاری کتاب میں لکھا ہُوا ہے کہ وہ نبی مُرسل ہیں۔ اس سے تمہاری اور تمہارے اہل و عیال کی جانیں بچ جائیں گی اور آرام و اطمینان سے زندگی بسر کر سکو گے +

دوم یہ کہ بال بچّوں کو قتل کر کے شمشیر برہنہ مقابلے پر کھڑے ہو جائیں تاکہ دشمن کو ہماری بہادری کا اندازہ ہو جائے۔ اگر جیت گئے تو اور بیویاں مل جائیں گی اور بچّے پیدا ہو جائیں گے اور دولت و اقبال ہمارے قدم چُومیں گے +

سوم یہ کہ دشمن پر اچانک حملہ کیا جائے۔ آج شنبہ کا دن ہے۔ دشمن کو یقین ہو گا کہ ہم آج لڑائی نہیں لڑیں گے لہٰذا وہ بے خبر ہو گا۔ ایسی حالت میں ہماری کامیابی یقینی ہے +

مگر یہودیوں نے حُیّی کے ان تینوں مشوروں کو رد کر دیا +

جب سعدؓ بنی قریظہ پہنچے تو آنحضرتؐ نے یہودیوں سے جنہیں بذریعۂ اعلان بُلاکر جمع کرلیا گیا تھا، دریافت فرمایا کہ کیا تمہیں وہ فیصلہ منظور ہے جو سعدؓ کریں گے؟ بنو قریظہ نے جواب دیا، ہاں! ہمیں منظور ہے اور اس کے ساتھ ہی آنحضرتؐ سے کہا کہ کیا آپؐ بھی ان کے فیصلے کو قبول کرکے اس پر قائم رہیں گے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا، ہاں! قائم رہوں گا +

سعد بن معاذؓ نے فیصلہ دیا جسے آنحضرتؐ نے بھی تسلیم کیا اور یہودیوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ اس فیصلے کے مطابق یہودیوں کا مال و متاع مسلمانوں میں تقسیم ہُوا +

اس لڑائی میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا اس کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ خمس (پانچواں حصہ) نکال کر سوار کو تین حصے (ایک حصہ اس کا اپنا اور دو حصے گھوڑے کے) اور پیدل کو ایک حصہ دیا گیا اور یہ اس لئے کہ آنحضرتؐ اپنی فوج کو طاقتور بنانے کے لئے مجاہدین میں یہ شوق پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ گھوڑے رکھیں اور زیادہ مُعزز و مُفتخر بنیں۔ جب تک فوج میں اسپ سوار رسالے رہے سوار اور پیادہ کی تنخواہ میں ہمیشہ اور ہر جگہ فرق رہا۔ آج ٹینکوں کے سپاہیوں کو فنی مہارت کی بنا پر زائد تنخواہ دی جاتی ہے۔ آنحضرتؐ کی اس دُور اندیشی سے اسلامی لشکر بہت جلد بہترین اور طاقتور ترین بن گیا +

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلعم کے پاس صرف دو گھوڑے تھے، اُحد میں سالاروں کی اپنی سواریوں کے علاوہ تیس اور خندق میں صرف چھتیس ۳۶ سواروں کا رسالہ تھا۔ ان میں اضافہ ضروری تھا اور اس زمانے میں رضاکارانہ اضافہ کی یہ بہترین تدبیر تھی +

نتائج و اسباق

آنحضرت صلعم کی دفاعی سیاست اب عیاں ہوتی جا رہی تھی۔ یہ دفاعی سیاست فنِ حرب کے اس دفاعی اصول پر مبنی تھی جس میں بچاؤ کو محض اپنا تحفظ ہی قرار نہیں دیا جاتا بلکہ اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ دشمن پر ایسے وقت اور ایسی جگہ حملہ کیا جائے جہاں وہ کمزور ہو۔ اس اصول پر برابر کامیابی کے ساتھ عمل ہو رہا تھا اور اب اس کی برتری و افادیت کے اظہار کا یہ تیسرا موقعہ تھا۔ آنحضرتؐ نے دشمن کو اپنی دفاعی سیاست کے منصوبے سے وہ ناچ نچایا کہ اسے جہاں چاہا دفاعی چال چل کر لے آئے اور لا کر

بُری طرح زک دی۔ پہلی دو بازیوں میں اس پر کاری زخم لگا اور چونکہ یہ زخم لڑائی کا تھا لہٰذا آشکارا ہو کر رہا۔ مگر آپؐ نے تیسری ضرب ایسی لگائی کہ اس نے مشرکین کی کمرِ ہمت ہمیشہ کے لیے توڑ دی +

یہ منصوبہ بالکل ایسا ہے کہ پہلے شکاری نے دانہ ڈال کر شکار کو جال میں پھنسایا۔ مثلاً بدر کے مقام پر قریش طاقت کے نشے میں مست آنحضرتؐ کا زور توڑنے آئے اور آنحضرت اپنے قلیل التعداد ساتھیوں کا مظاہرہ کر کے انہیں ایسے میدان میں لے آئے جہاں ان کے ہوش ہی بجا نہ رہے اور شکست و نامرادی کی ذلت اُٹھا کر بھاگے ـــ اُن کے زر و مال سے آپؐ نے اپنی فوج کو مضبوط بنایا۔ دوسری مرتبہ اُنہوں نے اُحد کے میدان کا انتخاب کیا۔ آنحضرت صلعم نے پہلے انہیں اپنا دفاعی منصوبہ اچھی طرح ظاہر کرنے دیا جب وہ اچھی طرح ظاہر کر چکے تو ایسی دفاعی چال چلی کہ انہیں مدینے کے شمالی میدان میں لڑنے کی بجائے اس کو اپنی پشت پر لینا پڑا، پھر چونکہ یہ عقب ان کو خطرناک معلوم ہوا اس لئے وادیٔ قناۃ میں جمع ہوئے اور مجبور ہو کر ایسے اصولوں پر لڑے جن پر آنحضرتؐ انہیں لڑانا چاہتے تھے۔

تیسری مرتبہ حالات بدل چکے تھے۔ دشمن نے زبردست جمعیت پیدا کر لی تھی۔ لہٰذا آپؐ نے بھی حربۂ دفاع کو دوسری شکل دی اور نقشۂ جنگ اس طرح تیار کیا کہ دشمن اس دفعہ بھی جال میں اندھا دھند پھنس گیا۔ یہ تیسری لڑائی اُس کی زندگی کی آخری لڑائی ثابت ہُوئی۔ آپؐ جانتے تھے کہ جنگ کبھی دو دفعہ ایک ہی میدان پر ایک ہی اصول سے کامیابی کے ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ آپؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ مدینے کا شمالی علاقہ دشمن کے رسالے کے لئے نہایت موزوں ہے اور اس کا بھی علم تھا کہ دشمن لاوے کے میدان کو اب ناقابلِ گذر تسلیم نہ کرے گا۔ نیز یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہودی دغابازی کریں گے۔ ایسے حالات میں نقشۂ حرب کو نئی شکل سے مرتّب کرنا ضروری تھا۔ آپؐ یہ بھی چاہتے تھے کہ جس طرح پہلے غزوات میں دشمن کے رسالے کو بے کار کیا گیا اسی طرح اس مرتبہ بھی کیا جائے لہٰذا سارے پہلوؤں پر غور کر کے آپؐ نے ایسی خندق تیار کی جسے مشرکین کے سوار پار نہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ اپنے مورچوں کو ایسا مضبوط بنایا کہ دشمن کی پیدل فوج بھی بڑی تعداد میں یک لخت حملہ نہ کر سکے بلکہ اسے تنگ راستوں اور گلیوں میں سے

گذر کر آنا پڑے تاکہ طرفین کے چند نفر ہی ایک دوسرے کا دست بدست مقابلہ کر سکیں پھر آپؐ نے ان تنگ راستوں پر آطام کو قلعہ بند کر کے ان میں تیر انداز متعین فرمائے تاکہ دشمن کی پیشقدمی میں اور زیادہ مشکلات پیدا ہوں۔

آپؐ نے اپنے لشکر کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے سارے محاذ کی حفاظت پر مامور نہیں کیا بلکہ ایک حصّہ تمام مورچوں پر مقرر فرمایا اور بڑی تعداد کو بطورِ کمک اپنے پاس علیحدہ محفوظ رکھا تاکہ چند لمحوں کے اندر خطرہ کی جگہ بھیجا جا سکے۔ مشرکین کے سواروں کا دستہ خالد بن ولید جیسے قابل اور بہادر سالار کے ماتحت تھا۔ اس کے مقابلے میں آپؐ نے مسلم سواروں کا سالار حضرت علیؓ جیسے نامور جرنیل کو مقرر کیا تاکہ مشرکین کے سوار جہاں بھی خندق کو پار کریں وہیں ختم کر دیئے جائیں، واپس نہ جانے پائیں۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہُوا اور عمرو بن عبدود اور نوفل بن عبداللہ بن المغیرہ جیسے مشہور بہادروں کو موت کے گھاٹ اُتار کر دشمن کے رسالے کی کمر توڑ دی گئی۔ حضرت علیؓ نے اس موقعہ پر اسلامی رسالے کی کمان ہاتھ میں لے کر ہجوم و دفاع کے فن میں بہترین اصول قائم کیا جو یہ تھا کہ اگر دشمن کسی جگہ مورچہ توڑنے میں کامیاب ہو جائے تو اس پر فوراً جوابی حملہ کر کے اسے ختم کر دیا جائے۔ جنگِ عظیم دوم میں اس اصول پر جرمنی کے سپہ سالار فیلڈ مارشل رومیل نے یورپ پر دوبارہ حملے کے وقت عمل کرنا چاہا مگر اتحادی افواج کے سالار نے اسے ناکام کر دیا۔ اگر رومیل اتحادیوں کے ان جانباز دستوں کو جو ہٹلر کی بحر اوقیانوسی (اٹلانٹک) دیوار کو توڑنے کے لئے فرانس کی سرزمین پر اُترے تھے برباد کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو جنگ کا نقشہ بالکل بدل جاتا۔ اسی طرح اگر حضرت علیؓ ان سواروں کو قتل نہ کر دیتے تو مدینے کا محاذ دگرگوں ہوتا اور مسلمانوں کو انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسلامی دنیا اگر حضرت علیؓ کو حیدر کے لقب سے یاد کرتی ہے تو یہ بالکل بجا ہے۔ اس سے آپؐ کے اسی تہوّر و شجاعت اور شہ زوری کا اظہار ہوتا ہے۔

غزوۂ خندق کو اگر آج کل کے دفاعی اصولوں پر منطبق کر کے دیکھا جائے تو آنحضرتؐ نے خندق بطور اینٹی ٹینک (Anti-tank) ٹینک سے بچاؤ کے لئے کھودی تھی۔ ٹینک دراصل رسالہ ہی کا قائم مقام ہے۔ لہٰذا آج کل ٹینکوں سے حفاظت

کے لئے جو خندقیں کھودی جاتی ہیں، یہ کوئی نئی ایجاد نہیں۔ اس کے بانی و موجد آنحضرتؐ ہی ہیں +

اس سلسلے میں آنحضرتؐ کی ایک جدّت اور بھی ہے یعنی آپؐ نے ثابت کر دیا کہ رسالے کو منصوبۂ دفاع میں کئی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس سے دشمن کے رسد و سامانِ حرب کے قافلوں پر چھاپہ مارنے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور متحرک کمک کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پچھلی جنگِ عظیم میں روس نے جرمنی کے خلاف اسی اصول پر عمل کیا۔ روس نے جرمن فوج کے زبردست دستوں کے لئے جال پھیلایا، جرمن فوج برق رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ مگر جب تک وہ ماسکو اور اسٹالن گراڈ کے سامنے نہ پہنچی روس نے جم کر مقابلہ نہیں کیا۔ روس کے فوجی ہزاروں کی تعداد میں قید ہو چکے تھے۔ جرمن کامیابی کے نشے میں سرشار بغیر سوچے سمجھے ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں کے موسمی حالات کا مقابلہ ان کے لئے انتہائی دشوار تھا۔ یہی غلطی نپولین نے بھی کی تھی اور اسی کا ارتکاب ہٹلر سے ہوا۔ اس وقت سوال یہ تھا کہ کیا اسٹالن سُرخ فوج کو جرمنوں اور اُن کے حلیفوں کے مقابلے میں ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ اسٹالن کو اپنی قوم اور فوج پر پورا اعتماد تھا۔ جرمنوں کی اتحادی فوج نے ان مورچوں کو فتح کرنے کے لئے بے دریغ قربانیاں دیں مگر وہ کامیاب نہ ہوئی۔ تاہم جرمنی نے ہمت نہ ہاری۔ ہٹلر اپنی بات پر اڑا رہا لیکن جب سرما برف اور خنک ہواؤں کی فوج لے کر آیا تو نقشہ بدل گیا۔ جرمنوں کو نہ کافی خوراک مل سکی نہ پوشاک، نہ توپوں کے لئے گولے اور نہ ٹینکوں اور گاڑیوں کے لئے پٹرول، روسیوں نے جوابی حملہ کیا، جرمنوں کے پاس پسپائی کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ جب وہ پیچھے ہٹے تو رومانیہ کے اتحادیوں نے اپنے وطن کی راہ لی اور روسی اُن سے بہت بڑا علاقہ واپس لینے میں کامیاب ہو گئے +

اس کامیابی کی وجہ جہاں موسم کی مساعدت تھی وہاں یہ بھی تھی کہ روس نے اپنی فوج کا بڑا حصہ بطور متحرک کمک محفوظ رکھا تا کہ جہاں جرمن روسی محاذ کو توڑنے کی کوشش کریں وہاں یہ کمک پہنچ کر جوابی حملہ کر سکے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روسیوں کو اپنے سپہ سالار پر پورا بھروسہ تھا مگر جرمنی کی اتحادی فوج کے متعلق یہ بات

یثرب نمبر ۴

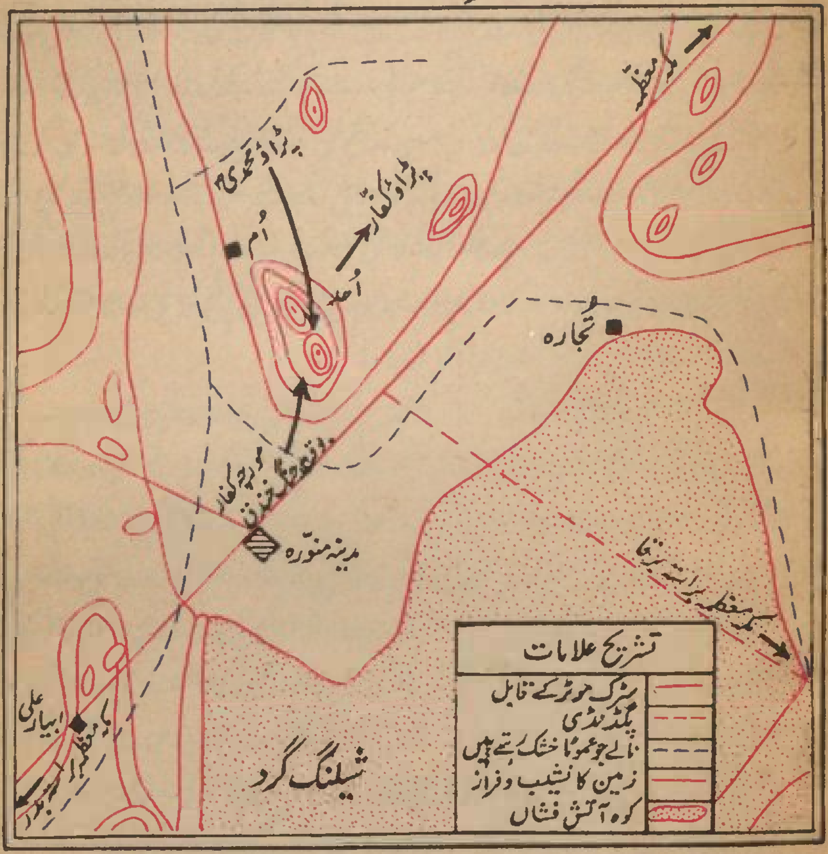
پڑاؤ محمدی
پڑاؤ کفار
اُم
اُحد
تجارہ
خندق
مدینہ منورہ
شیلنگ گرد
ابیار علی
تشریح علامات
سڑک موٹر کے قابل
پگڈنڈی
نالے جو عموماً خشک رہتے ہیں
زمین کا نشیب و فراز
کوہ آتش فشاں

وثوق سے نہیں کہی جا سکتی ۔ روسی سالار حوصلہ مند اور مستقل مزاج تھے مگر ان کے مقابل سالار فتح اور طاقت کے نشے میں چور تھے ۔ لہٰذا ماسکو پر روس اور جرمنی کی معرکہ آرائی میں جنگِ خندق کا جدید ترین طریقہ پر مطالعہ بخوبی کیا جا سکتا ہے ۔ جنگِ خندق نے مشرکین کے ذہن نشین کرا دیا تھا کہ دفاعی اصول اس وقت نہایت کارگر ہوتے ہیں جب بچاؤ کے منصوبے پر عمل کرنے والا سپہ سالار اپنے پاس بڑی تعداد میں متحرک کمک رکھتا ہے اور اسے ہر جگہ آسانی سے پہنچا سکتا ہے ۔ گویا یہ متحرک کمک شمشیر زن کی اس ڈھال کی طرح تھی جسے وہ دشمن کے وار کو کامیابی سے روکنے کے لئے استعمال کرتا ہے ۔ در اصل ماسکو اور اسٹالن گراڈ کی معرکہ آرائیوں نے دنیا کے دفاعی مبصرین کو پھر خوابِ غفلت سے جگا دیا اور سمجھا دیا کہ کامیابی کے لئے صرف حملہ اور پیشقدمی ہی کامیابی کی ضمانت نہیں ہے بلکہ اگر دفاعی منصوبہ بناتے وقت حملہ آور دشمن کو ایسی چال سے دھوکہ دیا جائے کہ وہ بچاؤ کے مورچے پر سر پٹخ پٹخ کر اپنی قوت کو ختم کر دے تو یہ اس سے کہیں زیادہ مفید و مؤثر ہے +

جنگِ خندق پر غور کیجئے ۔ مقابل فوجوں کی تعداد میں ایک اور تین کی نسبت تھی ۔ اس عددی تفوق کا علاج وہی تھا جو آنحضرتؐ نے کیا یعنی آپؐ نے اس کو مدِ نظر رکھ کر خندق کو اتنا طول دیا کہ مدافعت آسانی سے کی جا سکے ۔ کمک کی نقل و حرکت میں دشواری نہ ہو ، جس وقت جہاں ضرورت ہو آسانی سے بھیجی جا سکے ۔ اگر لشکرِ اسلام چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر آطاموں میں قلعہ بند ہو جاتا تو مشرکین چند روز میں غلبہ حاصل کر لیتے ۔ سامانِ رسد ، پانی اور چارے کا حصول دشوار ہو جاتا ۔ مجموعی طاقت چھوٹے چھوٹے مورچوں پر منتشر ہو کر کمزور ہو جاتی ۔ خندق کے طویل مورچے کی وجہ سے ایک تو اسلامی فوج کو نقل و حرکت کے لئے جگہ کافی ملی دوسرے دشمن کو اپنا لشکر بہت بڑے محاذ پہ پھیلانا پڑا ۔ آنحضرتؐ نے مقامی حالات کا مطالعہ کر کے اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ دشمن ہمیں چاروں طرف سے ہر وقت محصور نہیں رکھ سکتا ۔ لاوے کے میدان جو کئی میل لمبے اور کئی میل چوڑے تھے قابلِ گذر ضرور تھے مگر قابلِ قیام نہ تھے اس لئے آنحضرتؐ نے آسانی سے اندازہ لگا لیا کہ دشمن اپنی طاقت کس کس جگہ زیادہ لگائے گا اور بعد کے حالات و واقعات نے اس کی صحت کو ثابت کر دیا ۔ دشمن کو آنحضرتؐ کے اس

نئے حربہ کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ ان کے اصول وہی دقیانوسی تھے جن پر عرب میں لڑائیاں ہوتی تھیں لہٰذا ان کی جملہ تیاریوں میں یہی اصول کارفرما ہے۔ مگر جب انہوں نے مدینے پہنچکر آنحضرتؐ کا یہ حربہ دیکھا تو حیران وششدر رہ گئے۔ وہ اپنے ساتھ سامانِ رسد لائے، موسمی تبدیلیوں کے مطابق پوشش کا سامان لائے اور اس مقدار و تعداد میں لائے جس میں انہوں نے ضروری سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی فوج اگر چند روز میں نہیں تو چند ہفتوں میں ہتھیار ڈال دے گی، لیکن جب محاصرہ نے طول کھینچا تو ان کا سارا انظام بگڑ گیا۔ ان کے وہم میں بھی نہ تھا کہ جنگ حرم کے مہینے تک لمبی ہو جائے گی اور اس کا خاتمہ ہی نظر نہ آئے گا۔ اسی قسم کی غلطی ۱۹۴۰ء کے موسمِ گرما میں اتحادیوں نے بھی کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہماری نئی دفاعی چال ایسی انوکھی ہو گی کہ دشمن بدحواس ہو کر صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ انہوں نے اپنے خیال میں جرمنی کا کامیاب ترین اور مکمّل ترین محاصرہ کر رکھا تھا لہٰذا ان کے دفاعی مبصرین نے اتحادی حکومتوں کو مشورہ دیا کہ جنگ کے عاجلانہ اختتام کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ دشمن کے شہریوں کو ڈرا دھمکا کر صلح کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ چنانچہ اس منصوبے کے ماتحت ۱۹۴۰ء کے موسمِ گرما کے آغاز میں جرمنی کے بڑے بڑے شہروں پر پانچ ہزار ٹن سے زیادہ وزن کے بم گرائے گئے۔ اس کا نتیجہ عملاً خواہ کچھ نہ ہوا ہو پھر بھی اس پر اتحادیوں کا اعتقاد رہا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے جرمنی کے شہروں پر ۲۳ ہزار ٹن وزن کے بم گرائے اور ۱۹۴۲ء میں وزن کی مقدار بڑھا کر ۳۷ ہزار ٹن کر دی گئی۔ اس پر بھی جب کوئی مفیدِ مطلب نتیجہ نہ نکلا تو اعتقاد میں صرف اتنی تبدیلی پیدا ہوئی کہ ہم نے کافی تعداد میں بمباری نہیں کی لہٰذا ۱۹۴۳ء میں وزن کو بڑھا کر ۱۳۵ ہزار ٹن کر دیا گیا۔ پھر جب امریکہ بھی یورپ کے میدانِ جنگ میں آگیا تو اس کی مقدار ۱۸۰ ہزار ٹن کر دی گئی اور ۱۹۴۴ء میں پانچ ہزار ٹن بم روزانہ گرائے جانے لگے۔ مگر مُراد پھر بھی بر نہ آئی اور جرمنی برابر لڑتا رہا۔

اس میں شُبہ نہیں کہ فضائی جنگ سے دہشت پھیلتی ہے اور اس کا اثر ہر فرد پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اُس وقت تک فیصلہ کُن نہیں ہوتا جب تک حریف میں عزم باقی ہے اور وہ دشمن کا جواب دینے کی طاقت رکھتا ہے۔

مشرکینِ مکہ نے اپنی فوج کی تعداد، محاصرے کی تکمیل اور مختلف مقامات پر طاقت کے مظاہرے کر کے اہلِ مدینہ سے شکست تسلیم کرانے کی کوشش کی مگر ہمت ہارنے کی بجائے ان کا عزم و حوصلہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ خود عاجز و پریشان ہو کر بھاگ گئے +

آنحضرتؐ کے لڑائی لڑنے کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کے بعد امن ہو اور فاتح و مفتوح دونوں کو قلبی، ذہنی اور معاشی اطمینان و آسودگی نصیب ہو۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر آپؐ نے جنگ میں صرف اسی حد تک جانی و مالی نقصان جائز رکھا جتنا اختتامِ جنگ اور حصولِ امن کے لئے ضروری تھا ورنہ آپؐ نہ ایسے دفاعی منصوبے بناتے اور نہ ایسی جنگی چالیں چلتے کہ دشمن بغیر لڑے ہراساں و بدحواس ہو کر ہمت ہار دیتا اور بغیر زیادہ کشت و خون جنگ کا مقصد حاصل ہو جاتا۔ اسی حربی تدبیر کو برطانوی ماہرِ دفاع لیڈل ہارٹ کے قول کے مطابق جرمنی کے ایک مشہور دفاعی مبصر نے ان الفاظ میں دہرایا ہے "دفاعی تدبیر سے اس طرح کام لیا جائے کہ لڑنے کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی دشمن پر فتح حاصل کی جا سکے" گویا دفاعی منصوبہ ایسا ہونا چاہئے کہ دفاعی مقصد کے حصول کے ساتھ امن کے قیام کا مقصد بھی پیشِ نظر رہے اور یہ امن عارضی و چند روزہ نہ ہو بلکہ مستقل و دیرپا ہو۔ اس بیان سے مقصد یہ ہے کہ اگر تمام قوتیں اور ذرائع استعمال کر کے دشمن پر فتح بھی حاصل کر لی جائے تو اصطلاحی طور پر اسے فتح تو ضرور کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کی وجہ سے فاتح قوم کے خزانے خالی ہو جائیں تو وہ خود اپنی متاعِ امن کھو بیٹھتی ہے۔ کیونکہ اپنی معاشی و معاشرتی حالت کو درست کرنے کے لئے وہ دشمن یا مفتوح سے بہ جبر زر و مال وصول کرتی ہے اور اس طرح اسے پستی و مایوسی اور افلاس کی زنجیروں میں جکڑ کر مجبور و لاچار بنا دیتی ہے۔ اس کا ردِّ عمل انتقام و نفرت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے پھر ایک نئی جنگ کے بادل فضا پر چھا جاتے ہیں اور اس طرح نہ فاتح امن و اطمینان سے رہتا ہے نہ مفتوح۔ اور اگر ایسی فتح چند قوموں یا قبائل وغیرہ نے اتحادی بن کر حاصل کی ہو۔ اور اس کے حصول میں اپنے تمام ذرائع و وسائل سے بے دریغ کام لیا ہو تو گویا امن و امان اور بھی موہوم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فتح کے بعد یہ اتحادی جو مالی اعتبار سے بالکل دیوالیہ ہو گئے ہوتے ہیں، اپنے دیوالیہ پن کو دور کرنے اور خزانوں کو بھرنے کے لئے دشمن

سے تاوان وصول کرتے ہیں اب چونکہ اتحادی گروہ کا ہر ممبر اپنے مفاد کو مقدّم رکھتا ہے اور جنگ کے ہنگامی خطرات کی طرح کوئی چیز مابہ الاشتراک باقی نہیں رہتی، اس لئے یک جہتی بھی رخصت ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ، بدگمانی، بدمزگی اور کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آگے چل کر یہی کشیدگی ایک نئی جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے +

۱۸-۱۹۱۴ء اور ۴۵-۱۹۳۹ء کی جنگ ہائے عظیم کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم نے دوسری جنگِ عظیم کو جنم دیا اور دوسری جنگِ عظیم سے تیسری جنگ کا ہیولیٰ تیار ہو رہا ہے۔ پھر یہ بدگمانیاں اور کشیدگیاں صرف فتح ہی کے وقت پیدا نہیں ہوتیں بعض اوقات اس سے پہلے بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہیں۔ ایسی علیحدگی اکثر خطرناک ہوتی ہے۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ پہلی جنگ کے اتحادی دوسری جنگ میں ایک دوسرے کے حریف ہو گئے اور شانہ بشانہ لڑنے کے بعد ایک دوسرے کے لئے انتہائی سفاک اور ظالم بن گئے +

اب سوال یہ ہے کہ دفاعی سیاست کن اصولوں پر مبنی ہونی چاہئے۔ لیکن اس کے جواب سے پہلے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کا سیاسی نظریہ کیا ہونا چاہئے؟ کیا اس کی تمنا اور مقصد یہ ہو کہ وہ اپنے حدودِ مملکت کو فاتحانہ طور پر بڑھاتی اور پھیلاتی رہے یا پھر علیٰ حالہ قائم رکھے اور قناعت اختیار کرے۔ اگر مقصد و مطمحِ نظر اول الذکر ہے تو اسے اپنے مخالفین کی فوجوں کو تباہ اور ان کو اپنے تسلط میں کرنا اس کی ہر جنگ کا دفاعی مقصد ہو گا۔ لیکن چونکہ ایسی حکومت دوسری حکومتوں کو ہضم کرنا چاہتی ہے اس لئے قرب و بُعد کے تمام مُلکوں کو اپنا مخالف بنا کر ایک زبردست محاذ قائم کر لیتی ہے۔ نپولین اور ہٹلر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جن پر کسی مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں +

اس کے برعکس وہ حکومتیں جو ساری دُنیا سے الگ رہ کر صرف اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ پر قانع رہتی ہیں وہ رفتہ رفتہ غاصب فاتحین کی ہوسِ استعمار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ نپولین اور ہٹلر کی ابتدائی فتوحات میں اس کی بھی واضح مثالیں موجود ہیں۔ لہٰذا عقل و دانش اور تجربہ و مشاہدہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ حکومت جو اپنے حقوق و مفاد کے تحفّظ کے لئے جارحانہ عزم و حوصلہ مندی کا جامہ زیبِ تن کرتی ہے

وہ زندہ ہی نہیں رہتی بلکہ دوسری حکومتوں کی نظروں میں عزت و احترام کا بلند مقام حاصل کرتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی بہترین مثال برطانیہ ہے۔ اس نے آٹھ سو سال سے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ یہی ہے۔ یورپ میں جب کبھی بھی کوئی حکومت غاصب بن کر نمودار ہوتی ہے برطانیہ فوراً باقی یورپی ممالک کو ساتھ ملا کر اتحادی محاذ قائم کر لیتا ہے۔ ۱۹۳۹ء تک وہ اس پالیسی پر نہایت کامیابی سے کاربند رہا اور یورپ میں طاقت کے توازن کو برقرار رکھے رہا۔ ایسے بھی مواقع آئے جب اس نے یورپ میں اتحادی فاتح کی حیثیت اختیار کی مگر اس نے یورپ میں اپنی مملکت کی توسیع کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں لڑائی ختم ہوئی اپنے "تجارتی جہاد" میں مصروف ہو گیا۔ فرانس، روس اور جرمنی کو جب کبھی فاتحانہ حیثیت حاصل ہوئی وہ دوسرے ملکوں پر قابض و متصرف ہونے کی فکر کرنے لگے۔ لیکن برطانیہ ان قضیوں سے ہمیشہ الگ رہا البتہ ان قضیوں سے فائدہ اُٹھا کر اس نے اپنی نوآبادیات کو ضرور بڑھایا۔ بہرنوع کامیاب اور محفوظ و مامون حکومت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے حملہ آور کی حیثیت سے دفاعی پیش قدمی کرنے کو تیار رہے۔ قطع نظر اس کے برطانیہ کے اس نظریہ کی صحت و اہمیت آنحضرت صلعم کی دفاعی حدیث سے بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ہمارے فہم و شعور اور علم و بصیرت کا عالم یہ ہے کہ ہم نپولین وغیرہ کی شخصیتوں سے متاثر ہو کر انہیں تو آسمانِ سیاست و حکومت کا مہر و ماہ سمجھتے اور ان کے کارناموں کو حیرت و وارفتگی سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں لیکن آنحضرت صلعم کی جامع الصفات شخصیت اور دفاعی منصوبہ بندی سے اس طرح نابلد ہیں جیسے قومی و ملی زندگی کے اس اہم پہلو سے آنحضرتؐ کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور آپؐ نے سیاست و حکومت اور رزم آرائی کے سلسلے میں کوئی رہنمائی ہی نہیں فرمائی +

پہلی جنگِ عظیم نے ہمیں جھنجھوڑا، ہمارے زخموں پر نمک پاشی کی مگر ہم خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے۔ اُلٹا اغیار کے افسوں کا شکار بن کر ہوش و خرد اور جمعیت و اتحاد کی بچی کھچی پونجی بھی لٹا بیٹھے۔ دوسری عالمگیر جنگ کا خونیں سیلاب آیا اور سر سے گذر گیا مگر ہم نے کروٹ نہیں لی۔ آنحضرتؐ کے نام لیوا اور آپؐ کے نقشِ قدم پر

چلنے کے مُدعی دوسروں کے دامِ تزویر میں گرفتار اور اپنی بندگی و بے چارگی پر مطمئن ـــــ

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

بہر نوع آنحضرتؐ نے غزوۂ خندق کے ذریعے ہمیں یہ بتایا کہ طاقت کی آزمائش دودھاری تلوار ہے لہٰذا اس کا بیجا استعمال اور بغیر سوچے سمجھے اسکی آزمائش خطرناک ہے آنحضرتؐ نے شروع میں قریش کو حق کا پیغام سُنایا تو اُنھوں نے آپ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور برابر توڑتے رہے۔ جب کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا اور صبر و تحمل کی حد ہو گئی تو آپؐ نے ہجرتؐ کا دفاعی منصوبہ بنایا اور اس پر عمل شروع کیا۔ مکّے کے مقابلے میں مدینے کو حرم بنا کر اہلِ مکّہ سے عملاً کہا کہ تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔ مگر قریش نے اس کا جواب طاقت کے مظاہرہ سے دینا چاہا اور یکے بعد دیگرے متعدد لڑائیاں لڑیں۔ مُشرکین یہ نہ سمجھتے تھے کہ جنگ جہاں اپنی بات جبر و زور سے منوانے کے لئے شروع ہوتی ہے وہاں یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کا خاتمہ دشمن کی شرطیں تسلیم کرنے پر ہو۔ دوسرے لفظوں میں بسا اوقات اختتامِ جنگ کے حالات کے تحت حملہ آور حکومتوں کو حریف و مقابل کے دلائل و شرائط کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر حکومت میں اپنے حقوق کے تحفّظ کا عزم ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ جو لوگ میدانِ جنگ میں صبر و برداشت اور تحلّ و بُردباری سے کام لیتے ہیں وہ ناعاقبت اندیش و بے خوف بہادروں سے بہرحال افضل و برتر ہیں اور انجام کار وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ دلیری و بے باکی یقیناً عمدہ صفات ہیں لیکن ان کے ساتھ عقل کی پاسبانی اور میانہ روی کی احتیاط بھی نہایت ضروری ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں عنانِ اقتدار یا فوج کی باگ ڈور ہو ان میں پیش بینی و مآل اندیشی اور حزم و احتیاط کا ہونا لازمی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں لغزش کرتے ہیں تو مُلک و قوم کی تباہی یقینی ہے۔ لہٰذا ان اہم ذمہ داریوں کا بوجھ وہی لوگ صحیح طریقہ سے اُٹھا سکتے ہیں جو عاقبت نااندیش، جلد باز، حد سے زیادہ بے باک اور موقعہ پر ہوش و حواس کھو بیٹھنے والے نہ ہوں +

آنحضرت صلعم کے تمام غزوات عام دستور کے بالکل برعکس تھے۔ لڑائیاں عموماً

دشمن کے برباد کرنے، اس کا استیصال کرنے اور فخر و مباہات کے معراج پر فائز ہونے کے لئے لڑی جاتی ہیں۔ قریش نے آنحضرتؐ کے خلاف جنگ و جدال کی جتنی تیاریاں کیں وہ سب اسی لئے کیں، لیکن واقعات شاہد ہیں اور آنحضرتؐ کا طرزِ عمل اس کی دلیل ہے کہ آپؐ نے کوئی جنگ بھی اس غرض سے نہیں لڑی۔ نہ جنگِ بدر کا مقصد یہ تھا، نہ جنگِ اُحد کا، نہ غزوۃ السویق کا نہ غزوۂ خندق کا آپؐ کا مقصد صرف امن کا حصول اور اس کا قیام تھا۔ اسی کے لئے آپؐ نے وعظ و تبلیغ کا طریقہ اختیار فرمایا اور اسی کے لئے جہاد کیا+

جو حکومت یا جو قائد و سالار ذاتی اِعتلاء و استکبار کے لئے میدانِ کارزار میں آتا ہے اُسے امن و خوشحالی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ ملک کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل کر شہرت و ناموری کے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماضی قریب کی جنگوں کی مثالیں دنیا کے سامنے ہیں۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتیں جن مالی و معاشی تباہ حالی میں مبتلا نظر آرہی ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُنہوں نے جرمنی کی مکمل تباہی کے مقصد کے سامنے اپنی عافیت و فراغت کے معاملے کی مطلق پروا نہیں کی جس طرح بھی ہوا اسے مکمل طور پر برباد کر کے دم لیا۔ اسی طرح امریکہ نے ایٹم بموں کے استعمال سے جاپان اور کوریا پر قبضہ تو کر لیا مگر امن و اطمینان سے بہرہ اندوز نہ ہوا بلکہ اس کے برعکس اب کئی سال سے ایک دوسری جنگ میں مبتلا ہے +

بلاشبہ جنگ میں عزم و حزم ضروری ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر لڑتے لڑتے عارضی سکون حاصل ہو اور اس میں امن و صلح کا موقعہ ہاتھ آئے تو اسے محض طاقت کے پندار اور حصولِ فتح کے داعیہ کی وجہ سے ضائع کر دیا جائے۔ صلح کا امن، فتح کے امن سے کہیں زیادہ قیمتی اور طمانیت بخش ہوتا ہے۔ ایسی فتح مندی جو مالی و معاشی حیثیت سے ملک کو دیوالیہ اور مفلس بنا دے اور فتح کی خوشی مصائب و آلام میں تبدیل ہو کر مشکلات میں اضافہ کا سبب بن جائے اس امن کے مقابلے میں ہرگز قابلِ ترجیح نہیں جو مصالحت کے ذریعے قائم ہو۔ فتح مقصدِ امن کے حصول کا ایک ذریعہ ہے، نہ کہ فی نفسہ کوئی مقصد۔ اگر اس سے

حصولِ امن کا مقصد فوت ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مصائب و آلام کا ہجوم آتا ہے تو کوئی دانشمند اس فتح کو فتح نہیں کہہ سکتا +

ہر متحارب طاقت کا فرض ہے کہ وہ اختتامِ جنگ کے بعد کے حالات کو ہر وقت سامنے رکھے اور مجرد و مطلق فتح کے سراب کے پیچھے اندھا دھند نہ دوڑے۔ آنحضرتؐ کے سامنے ایسی فتوحات کے متعدد مواقع آئے مگر آپ نے ان پر کبھی توجہ نہیں فرمائی۔ اگر آپ غطفان یا قریش کے ہزیمت خوردہ اور تھکے ماندے لشکروں کا تعاقب کر کے ان کا خاتمہ کر دیتے تو کیا اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تھی؟ کیا آپ "شاندار فتح" حاصل نہ کر سکتے تھے؟ ضرور کر سکتے تھے مگر آپؐ کا مقصد محض "شاندار فتح" حاصل کرنا نہیں شاندار امن قائم کرنا تھا۔ آپؐ نے جنگ اور جنگ کی کامیابی کو حصولِ مقصد کا ذریعہ بنایا نہ کہ اصل مقصد۔ چنانچہ جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو امن و آشتی کے قیام میں مصروف ہو گئے اور دعوت و تبلیغ کے ذریعے شر و فساد کی بیخ کنی فرمانے لگے +

مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو ملک یا حکومت اخلاقی طور پر کمزور ہوتی ہے وہ صرف طاقت کے مظاہرے سے ہی رام کی جا سکتی ہے۔ اس کی مثال بالکل اس غنڈے کی سی ہے جسے ہر شریف آدمی کی پگڑی اچھالنے میں لطف آتا ہے لیکن جہاں اپنے سے زیادہ طاقت والے سے سابقہ پڑا اور پولیس کا ڈنڈا نظر آیا بھیگی بلی بن گیا۔ یہ مثال افراد ہی پر صادق نہیں آتی اقوام و ممالک پر بھی صادق آتی ہے۔ ایسی صورت میں منانے پر جانے یا نصیحت کرنے کی بجائے جارحانہ پیشقدمی کی ضرورت ہے۔ اگر انہیں ایک دفعہ لالچ دے کر خاموش کیا جاتا ہے تو ان کے دندانِ آز اور تیز ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں "کلوخ انداز را پاداش سنگ است" کے اصول پر عمل ہونا چاہیئے۔ آنحضرتؐ نے اسی اصول پر عمل فرما کر بنو قریظہ کے خلاف کارروائی کی اور اُمت کے لئے یہ حدیث چھوڑی کہ جب اس قسم کا موقعہ آئے اور شرافت و معقولیت کا جواب غدّاری، دغابازی، عہد شکنی اور مکر و ریا سے دیا جائے تو انتہائی قدم اُٹھانے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے ـــ اگر پاکستان کشمیر کے معاملے میں یہی طرزِ عمل اختیار کرتا اور اسی اصول پر عمل پیرا ہوتا تو وہ بجا طور پر اس کا حق رکھتا تھا +

اس سلسلے میں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی امن پسند

قوم کسی دوسری قوم کی جارحانہ کارروائی کے انتقام یا پاداش میں جوابی کارروائی کرتی ہے تو حد سے تجاوز کر جاتی ہے، ضروری و غیر ضروری اور جائز و ناجائز کے فرق و امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھتی اور جب حصولِ مقصد میں دشواریاں پیش آتی ہیں تو صلح کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتی ہے کہ جارحانہ کارروائی کرنے والی قوم حرص اور لالچ کی بنا پر ایسا کرتی ہے، جب اس کو حصولِ مقصد میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے تو مجبور ہو کر صلح پر آمادہ ہو جاتی ہے کیونکہ اس کا اصل الاصول غنڈہ گردی ہے، وہ کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہے اور طاقت کے سامنے جھکتی ہے۔ حالانکہ اس کو (امن پسند حکومت کو) نہایت سنجیدگی و دُور اندیشی سے سارے حالات پر غور کر کے جنگ جاری رکھنی چاہیئے اور غنڈہ حکومت کو آخر دم تک لڑنے پر مجبور نہ کرنا چاہیئے۔ کہ یہ وقار اور مآل کے خلاف ہے۔ تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں لیکن ایک تازہ مثال غیر منقسم ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ہے۔ اس نے سرحد کے ایک معمولی درویش کو اتنا پریشان کیا کہ بالآخر وہ باقاعدہ مقابلے پر آگیا اور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک برابر اس کی فوجی طاقت کا مقابلہ کرتا رہا۔ یہ درویش فقیر ایپی تھا۔ حکومت نے کئی ہزار نفوس پر مشتمل فوج کو تمام جدید ہتھیاروں سے لیس کر کے روانہ کیا۔ مگر وہ ہاتھ آیا نہ اس کی قوت و اثر میں کسی قسم کا ضعف پیدا ہوا۔ وہ فقیر ایپی اب بھی موجود ہے لیکن پاکستان کی حکمتِ عملی سے اب نہ وہ اثر ہے اور نہ طاقت، مقابلے و مجادلے کا سارا ہمہمہ ختم ہو چکا ہے۔

اکثر دفاعی مبصرین کا خیال ہے کہ اگر چرچل اور فرانس ہٹلر کی تجویزِ صلح پر غور کرتے اور نازیت کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے نہ ہوتے تو دوسری عالمگیر جنگ نہ اتنے جانی و مالی نقصان کا سبب بنتی اور نہ دُنیا پر یہ ہولناک معاشی تباہی نازل ہوتی۔ چونکہ فیصلۂ جنگ ہٹلر کی تجویز کے دونوں پہلوؤں پر غور کئے بغیر کیا گیا اس لئے ہٹلر کی زندگی صرف جنگ سے وابستہ ہو کر رہ گئی اور اتحادیوں نے یورپ کی طاقت کو نظر انداز کر کے مکمل فتح اور نازیت کی تباہی پر کمر باندھ لی۔ لہٰذا لڑائی جذبۂ انتقام کے ماتحت روز بروز خوفناک اور اخلاقی اعتبار سے پست ترین درجہ کی لڑائی بنتی چلی گئی۔ لیکن آنحضرتؐ

کا اصولِ عمل اس سے بالکل مختلف تھا ۔ آپؐ نے ہمیشہ یہ کوشش فرمائی کہ دشمن کو اس کی اخلاقی پستی کا احساس دلا کر زیر کیا جائے تاکہ نہ تو فوجی لڑائی کی نوبت آئے اور نہ کشت و خون ہو ۔ مکے کی فیصلہ کن جنگ میں آپؐ نے اس اصول کی افادیت قطعی طور پر ثابت کر دی ۔ اس کا مفصل ذکر اپنی جگہ آئندہ کسی باب میں آئے گا +

غزواتِ بنی لحیان و بنی مصطلق

پچھلے کسی باب میں عضل اور قارہ کے لوگوں کی دغابازی، بنو لحیان کی ظلم آفرینی اور وفدِ اسلام کے ارکان کی شہادت کا حال لکھا جا چکا ہے۔ غزوۂ بنی قریظہ سے فارغ ہوتے کے پانچ ماہ بعد آنحضرتؐ سنہ ۶ ھ کے ماہ جمادی الاولیٰ میں شہید صحابہؓ کا بدلہ لینے اور مشرکین کی سرزنش کرنے کے لئے مدینے سے باہر تشریف لے گئے اور یہ ظاہر کیا کہ آپؐ شام تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس طرح گویا آپؐ نے اصل مقصد کو پوشیدہ رکھا تاکہ بنی لحیان کو ان کے ظلم کی سزا دی جا سکے +

مدینے سے نکل کر آپؐ نے جبلِ غراب کی راہ لی۔ یہ پہاڑ شام کے راستے پر واقع ہے۔ یہاں سے آپؐ مخیض ہوتے ہوئے بین پہنچے، پھر صخیرات الیمام تشریف لے گئے۔ وہاں سے مکّے کی شاہراہ پر روانہ ہوئے اور تیزگامی کے ساتھ غرّان میں وارد ہوئے۔ غرّان اصبح اور عسفان کے درمیان ایک وادی ہے جو مقام سایہ تک برابر چلی گئی ہے۔ غرّان بنی لحیان کا وطن تھا، مگر چونکہ اس قبیلے کو کسی طرح آنحضرتؐ کی آمد کی اطلاع ہو گئی تھی اس لئے وہ لوگ بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے غرّان کو خالی دیکھا تو مع لشکر عسفان کے پہاڑ سے اتر کر عسفان میں قیام فرمایا۔ اس نقل و حرکت کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ مکہ آپؐ کے لشکر کو دیکھ لیں۔ آپ کے ساتھ دو سو شتر سوار تھے۔ عسفان سے آپؐ نے دو شتر سوار آگے روانہ کئے اور حکم دیا کہ کراع نعیم تک جا کر واپس چلے آئیں۔ اس کے بعد آپؐ مدینے واپس تشریف لائے۔ غزوہ بغیر کسی مقابلے کے کامیاب رہا +

غزوۂ بنی مصطلق۔

اسی مہینے میں آنحضرت صلعم کو خبر ملی کہ بنی مصطلق مسلمانوں سے لڑنے کی تیاری کر رہے

ہیں۔ ان کا سردار حارث بن ابی ضرار جویریہ تھا۔ آنحضرتؐ ایک لشکر لے کر مدینے سے روانہ ہوئے اور پیچیدہ راستے سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے تاکہ دشمن کو آپؐ کے پہنچنے کی اطلاع نہ ہو۔ ساحل سمندر سے ہوتے ہوئے قدیہ کے نواح میں چشمۂ مریسیع پر پہنچ کر اچانک اس قبیلہ پر حملہ کیا۔ سخت جنگ کے بعد بالآخر سرکشوں کو شکست ہوئی اور انہیں زبردست جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس سرکشی کی پاداش میں بہت سے مرد اور عورتیں مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ جن میں حارث کی بیٹی بھی تھی جس کی گریہ وزاری پر آنحضرتؐ نے اپنے پاس سے فدیہ کی رقم دے کر اُسے آزاد کرایا +

مختلف مُہمّات۔

اسی سال ربیع الآخر میں آنحضرتؐ نے مختلف شورش پسندوں کی تادیب کے لئے مختلف مہمات روانہ فرمائیں۔ ان میں سے ایک عکاشہ بن محصن کے ماتحت روانہ کی گئی۔ جس میں چالیس مجاہدین تھے۔ یہ مہم نہایت عجلت وتیزی سے غمر پہنچی مگر دشمنوں کو کسی طرح اس کی آمد کا قبل از وقت علم ہو گیا لہٰذا اُنہوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ مفسدوں کے دوسو اونٹ مجاہدین کے ہاتھ آئے۔ جنہیں لے کر وہ مدینے واپس آگئے۔ یہ مہم غمر کی مہم کہلاتی ہے +

مہم ذی القصہ و دیگر مُہمّات۔

اسی سال آنحضرت صلعم کو ذی القصہ کے بدوؤں کی شورش کی اطلاع ملی۔ آپؐ نے چالیس مجاہدین کے ساتھ ابوعبیدہ بن الجراح کو ذی القصہ روانہ کیا۔ شورش پسند ان کے آنے کی خبر ملتے ہی پہاڑوں میں جا چھپے۔ مسلمان ان کے اونٹ اور دوسرا مال و اسباب لے کر مدینے آئے +

پھر آپؐ نے بنی سلیم کی تادیب کے لئے زیدؓ بن حارثہ کو روانہ فرمایا۔ وہاں زیدؓ کے ہاتھ بہت سے اونٹ اور بکریاں آئیں اور متعدد آدمی قید ہو کر مدینے آئے +

اس کے بعد زیدؓ کو عیص کی مہم پر روانہ کیا گیا۔ وہاں ابوالعاص بن الربیع کا تمام مال و اسباب جو اس کے ساتھ تھا ان کے قبضے میں آیا۔ اس سے فراغت پانے کے بعد انہیں بنی ثعلبہ کی سرزنش پر مامور کیا گیا۔ یہاں بھی زیدؓ کا دستہ کامیاب رہا، بہت سے

اونٹ مالِ غنیمت کے طور پر ملے۔ اس کے بعد انہیں حسمیٰ بھیجا گیا کہ بنی جذام کو سزا دیں جنہوں نے دحیۃ الکلبی کو جو قیصرِ روم سے مِل کر اور انعام واکرام لے کر واپس آرہے تھے لُوٹ لیا تھا۔ اُنھوں نے قبیلے کو اس کے جُرم کی سزا دی +

دومۃ الجندل، فدک اور وادی القریٰ کی مہمیں۔

اسی سال آپؐ نے عبدؓ الرحمٰن بن عوف کو تبلیغ اسلام کے لئے بنی الاصبغ کے پاس بھیجا۔ ان کی تبلیغ سے سارے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا +

فدک:۔ شعبان ۶ھ میں حضرت علیؓ کو فدک روانہ فرمایا تاکہ بنی سعد بن بکر کی سرکشی پر ان کو سزا دیں۔ راستہ میں حضرت علیؓ کو اس قبیلے کا جاسوس مل گیا جسے انہوں نے خیبر کے یہودیوں کے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ اگر یہودی اس سال خیبر کے نخلستانوں کے پھلوں کا نصف حصّہ ہمیں دیں تو ہم محمدؐ کے خلاف یہودیوں کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ حضرت علیؓ دن کو چھُپ جاتے اور رات کو سفر کرتے، یہاں تک کہ وہ فدک پہنچ گئے اور بنی سعد کو سزا دے کر کامیابی کے ساتھ واپس آئے +

وادی القرایٰ:۔ زیدؓ بن حارث کو بنی فزارہ کی گوشمالی کے لئے وادی القریٰ بھیجا۔ باغیوں سے سخت لڑائی ہوئی جس میں زیدؓ بھی زخمی ہوئے۔ دوسری مرتبہ پھر انہیں فوج دے کر بھیجا گیا۔ اس مرتبہ اس قبیلے کو شکست فاش ہوئی اور بہت سا مالِ غنیمت اور قیدی ہاتھ آئے +

عرینین کے قبیلے نے آنحضرتؐ کے چرواہے کو قتل کر کے کچھ مویشیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ آپؐ نے اس کی سرزنش کے لئے کرزؓ بن جابر الفہری کی قیادت میں شترؐ سواروں کا ایک دستہ روانہ فرمایا جس نے اس کو سزا دی اور کامیابی کے ساتھ واپس آیا +

اسی طرح آپؐ نے اور بھی مہمات روانہ فرمائیں۔ طوالت کے خوف سے انہی پر اکتفا کیا جاتا ہے +

نتائج واسباق۔

ان مہمات سے صاف ظاہر ہے کہ غزوۂ خندق کے بعد آنحضرتؐ نے حالات پر قابو پاتے میں ادنیٰ توقف سے بھی کام نہیں لیا بلکہ تمام قبائل پر واضح کر دیا کہ فلاح وآسودگی

کی صورت یہی ہے کہ آپؐ کے احکام کی تعمیل کی جائے اور اسلامی سوسائٹی کے نظام کی مخالفت نہ کی جائے ورنہ اس سرکشی و بغاوت کی سخت سزا ملے گی۔ دوسرا ذیلی نتیجہ یہ برآمد ہؤا کہ مسلمانوں کے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت آگیا جس سے مالی و معاشی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت بہت کچھ بہتر ہو گئی +

اس کے علاوہ ان سے ایک خاص فائدہ یہ بھی ہؤا کہ آپؐ کے سالاروں کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا کیونکہ بعض طبقوں میں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ آنحضرت کے پاس اپنی ذات کے علاوہ ایسے آدمی نہیں ہیں جو توسیعِ اسلام کی کشتی کو کامیابی سے چلا سکیں +

دوسرا بڑا فائدہ یہ ہؤا کہ آنحضرتؐ کے اقتدار کی توسیع کے ساتھ مملکت کے نظم و نسق اور استحکام و استحفاظ کا موقعہ مل گیا اور آپؐ آیندہ کے منصوبوں پر عمل کرنے کی بہتر تدبیریں اختیار فرما سکے۔ عمرہ کرنے کے لئے مکہ جانے کا فیصلہ' اس کا خاص اہتمام اور بعد کے واقعات اس کا بیّن ثبوت ہیں +

فوجی نقطۂ نظر سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہؤا کہ مجاہدینِ اسلام اور ماتحت سالاروں کو مخفی نقل و حرکت' تیز رفتاری اور ناگہانی حملہ کی پوری مشق ہو گئی اور انہیں ذاتی تجربہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ جنگ میں ان کی اہمیت کیا ہے اور ان سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ مہمات اس اعتبار سے مجاہدین کی مزید تربیت کے لئے تھیں تاکہ جنگ کی اہم چالوں کی مشق کے ساتھ مجاہدین میں خود اعتمادی و حوصلہ مندی کی صفات ترقی کریں اور اقدامِ عمل کی صلاحیت پیدا ہو۔

سیاسی لحاظ سے خاص فائدہ یہ ہؤا کہ آنحضرتؐ کو مخالف و معاند قبائل کی طاقت اور جمعیت کا اچھی طرح علم ہو گیا اور وہ لوگ جو متحد ہو کر کسی وقت فتنہ و فساد برپا کر سکتے تھے' انہیں فرداً فرداً کچل کر سیاسی نظم و ضبط کے ایک رشتہ میں منسلک کر لیا گیا +

صُلحِ حُدیبیہ

قبائلِ عرب کی شورش فرو کرنے کے بعد جب حالات درست آگئے اور جنگی، سیاسی و معاشی اعتبار سے استحکام کی صورتیں پیدا ہو گئیں تو آنحضرتؐ عمرہ کرنے کے ارادے سے مدینے سے روانہ ہوئے۔ آپؐ نے مدینے اور قرب و جوار کے مسلمانوں کے علاوہ حجاز کے عربوں اور بدوؤں کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ان میں سے جو لوگ آگئے آپؐ انہیں اور مہاجرین و انصار کو ہمراہ لے کر مکّے کو روانہ ہو گئے۔ چونکہ آپؐ عُمرہ کی غرض سے تشریف لے جا رہے تھے جنگ و جدال مقصود نہ تھا اس لئے آپؐ نے اپنے ساتھ قربانی کیلئے ستّر اونٹ لئے۔ آدمیوں کی تعداد بعض مورخین نے ایک ہزار تین سو بتائی ہے۔ بعض نے ایک ہزار پانچ سو۔ بہرحال ہمراہیوں کی جمعیت کثیر تھی۔

مدینے سے چل کر آپؐ نے پہلا قیام عسفان میں فرمایا۔ یہاں بشر بن سفیان نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ قریش آپؐ کی روانگی کی خبر سُن کر مقابلے کے لئے مکّے سے باہر آگئے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے لوگوں کا بھی ایک جمِ غفیر ہے، اس وقت وہ ذی طویٰ میں مقیم ہیں اور انہوں نے اپنے معبودوں کی قسمیں کھا کر عہد کیا ہے کہ وہ آپؐ کو مکّے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ ان کے رسالے کا سالار خالد بن ولید اپنے رسالے کو لے کر کراع النعیم تک پہنچ گیا ہے۔

جب آپؐ ہدیٰ سے ذی الحلیفہ پہنچے تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ قریش جنگ پر تلے ہوئے ہیں لہٰذا ہمیں آگے بڑھنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ آپؐ نے قریش کی جنگی تیاری پر اظہارِ افسوس کیا اور فرمایا، میں اُن سے لڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر اس دین کی حفاظت کے لئے جس پر اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے اُنہوں نے لڑنے پر مجبور کیا تو مَیں ان سے لڑوں گا اور لڑائی کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہو گا۔

تاہم میں ان سے جنگ نہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

چنانچہ آپؐ نے عام راستے کو چھوڑ کر پہاڑوں کے درمیان نہایت دشوار گذار راستہ اختیار کیا۔ اہلِ قافلہ کو اس سے بڑی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد آپؐ نے اس راستے پر چلنا شروع کیا جو وادی کے داہنی جانب خمص کے درمیان دونوں سطوح مرتفع میں سے ہو کر مکّے کے زیریں علاقے میں حدیبیہ کے آثار پر ثنیۃ المرار میں جانکلتا ہے۔ دشمن کا رسالہ کراع الغمیم میں آپ کا انتظار کرتا رہا' جب اس نے آپؐ کے قافلے کی گرد ثنیۃ المرار کے قریب دیکھی تو وہ گھبرا کر وہاں سے ہٹا اور واپس جا کر لشکرِ قریش میں مل گیا۔

مشہور ہے کہ جب آپ ثنیۃ المرار سے گذرنے لگے تو آپؐ کی اونٹنی چلتے چلتے بیٹھ گئی۔ صحابہؓ نے کہا کہ ہٹ کر رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا' یہ اس کی عادت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طاقت نے اصحابِ فیل کو مکّے میں آگے جانے سے روک دیا تھا اسی نے اس کو روک دیا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے وہیں قیام کرنے کا حکم دیا۔ عام خیال یہ تھا کہ یہاں پانی دستیاب نہیں ہوگا لیکن جب آنحضرتؐ کے حکم سے ایک کھُدے ہُوئے گڑھے کو اور کھودا گیا تو اس میں سے کافی پانی نکل آیا۔

قافلۂ اسلام نے قیام کیا ہی تھا کہ بُدیل بن ورقاء الخزاعی آنحضرتؐ کی خدمت حاضر ہُوا اور عرض کی کہ کعب بن لوی اور عامر بن لوی حدیبیہ کے کنوؤں پر پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ بدمعاشوں کی ایک بڑی جماعت ہے وہ آپؐ سے ضرور لڑیں گے اور بیت اللہ کی زیارت نہ کرنے دیں گے۔ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا کہ "ہم عمرہ کرنے آئے ہیں' لڑنے نہیں آئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ پچھلی لڑائیوں میں قریش کا کس بل نکل گیا ہے اس لئے اگر وہ چاہیں تو ہمارے ساتھ مفاہمت کر لیں اور مزاحمت سے باز آئیں ورنہ مَیں اُن سے اس وقت تک لڑوں گا جب تک میری جان باقی ہے یا اللہ مجھے کوئی اور حکم دے"۔

یہ جواب سُن کر بُدیل قریش کے پاس آیا اور اچھی طرح سمجھا کر ان کے ذہن نشین کر دیا کہ آنحضرتؐ جنگ کرنا نہیں چاہتے لیکن اگر تم خواہ مخواہ لڑنا چاہتے ہو تو وہ اسکے لئے تیار ہیں۔ مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ سمجھوتہ کر لو یہ نیک مشورہ ہے۔

مکہ - حدیبیہ

نمبر ۸

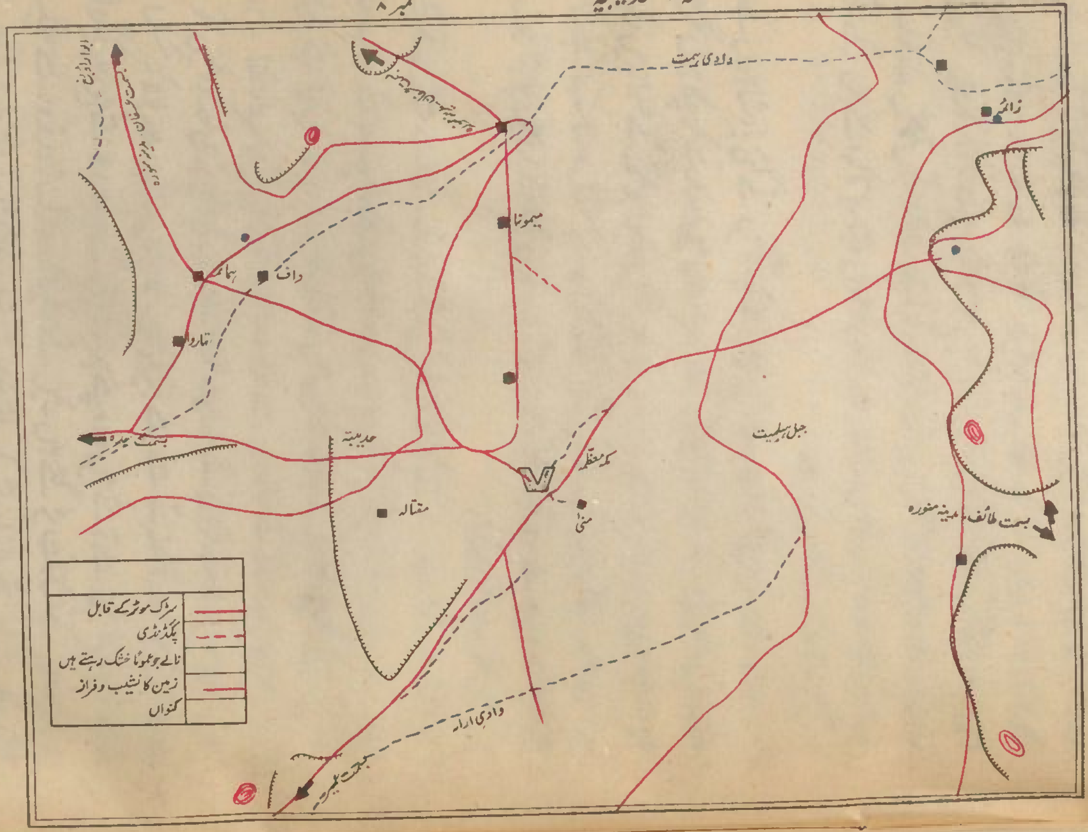

شروع ہونے والی تھی کہ ابوسفیان کے کچھ مشرکین نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ حملہ آوروں میں سے چھ آدمی گرفتار کر لئے گئے اور آنحضرتؐ کے سامنے پیش کئے گئے مگر آپؐ نے سب کو معاف کر کے مع ہتھیار واپس جانے کی اجازت دے دی +

اس کے بعد آپؐ نے عثمانؓ بن عفّان کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا۔ راستے میں انہیں آبان بن سعید بن العاص ملا اور انہیں اپنے پیچھے اونٹ پر بٹھا کر عمائدینِ قریش کے پاس لے گیا۔ جب حضرت عثمانؓ نے انہیں آنحضرت صلعم کا پیغام پہنچایا تو ابوسفیان نے کہا کہ آپ کعبہ کا طواف کر سکتے ہیں مگر انہوں نے جواب دیا کہ جبتک آنحضرتؐ طواف نہ کریں گے میں ہرگز نہ کروں گا۔ قریش اس پر بگڑ گئے اور انہیں وہیں روک لیا +

حضرت عثمانؓ کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مسلمانوں کے پاس یہ خبر پہنچی کہ انہیں قتل کر دیا گیا ہے۔ آنحضرتؐ کو بڑی تشویش ہوئی۔ آپؐ نے مسلمانوں سے بوقتِ ضرورت دشمن سے فیصلہ کن جنگ کرنے کی بیعت لی۔ یہی بیعت "بیعتِ رضوان" کہلاتی ہے۔ بیعت لینے کے بعد آنحضرتؐ کو خبر ملی کہ حضرت عثمانؓ زندہ و سلامت ہیں۔ اُدھر قریش نے سہیل بن عمرو کو جو بنی عامر بن لُویّ کے قبیلے سے تھا صلح کے لئے بھیجا اور یہ کہلایا کہ اس دفعہ محمدؐ عمرہ کئے بغیر واپس چلے جائیں تاکہ عرب یہ نہ کہیں کہ محمدؐ زبردستی ہمارے گھروں میں گھس آئے۔ بعض صحابہؓ نے اس شرط کو نامنظور کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر جب آنحضرتؐ نے موقعہ کی مصلحت اور صلح کے نتائج سے آگاہ کیا تو وہ بخوشی تیار ہو گئے۔ صلح کی مفصل شرطیں حسبِ ذیل تھیں :-

۱۔ مسلمان اور قریش دس سال تک آپس میں کوئی جنگ نہیں کریں گے +

۲۔ اس مدت میں ہر شخص محفوظ و مامون ہوگا، کوئی کسی پر دست درازی نہ کرے گا +

۳۔ قریش کا جو آدمی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آنحضرتؐ کے پاس آجائے گا۔ آنحضرتؐ اسے اس کے ولی کے پاس واپس بھیج دیں گے +

۴۔ اگر آنحضرتؐ کا کوئی آدمی قریش کے پاس چلا جائے گا تو قریش اسے آنحضرتؐ کے پاس واپس نہ بھیجیں گے +

۵۔ اب ہمارے درمیان کوئی لڑائی نہیں رہی۔ نہ تلوار نکالی جائے، نہ تیر اندازی

ہو، نہ سنگ اندازی۔ جس کا جی چاہے وہ اب رسول اللہ کے ساتھ ان کے عہد و پیمان میں داخل ہو جائے اور جس کا جی چاہے قریش کے ساتھ مل جائے۔ مگر مکے میں جو مسلمان ہیں آنحضرتؐ ان کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں گے +

۶- اس سال آنحضرتؐ حدیبیہ سے عمرہ کئے بغیر واپس چلے جائیں اور مکے کے اندر نہ آئیں۔ اگلے سال ہم خود تین دن کے لئے آپ کی خاطر مکے کو چھوڑ دیں گے۔ آپ اپنے صحابہؓ کے ساتھ مکے میں داخل ہوں مگر سب لوگوں کے پاس صرف شتر سوار کا ہتھیار یعنی تلوار ہو مگر وہ بھی نیام میں +

مسلمانوں کی طرف سے صلح نامہ کی تحریر حضرت علیؓ نے لکھی۔ چند روز حدیبیہ میں قیام فرمانے کے بعد آنحضرتؐ نے قربانی کی اور سر منڈوایا۔ آپؐ کی تقلید سارے صحابہؓ نے کی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے مدینے کو مراجعت فرمائی +

صلح نامہ حدیبیہ کے شرائط کو سرسری نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی طرف سے کمزوری کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ واقعات نے ثابت کر دکھایا کہ یہ اعلیٰ درجہ کی سیاسی فتح تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی آیت کریمہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ؈ ارشاد فرما کر اس صلح حدیبیہ کو کھلی فتح سے تعبیر کیا۔ مثال کے طور پر ابوبصیرؓ عتبہؓ بن سعد بن الجاریہ جو مسلمان تھے قریش کی قید میں تھے۔ عہد نامہ کے بعد وہ کسی طرح بھاگ کر مدینے آ گئے۔ ازہر بن عوف نے آنحضرتؐ کو لکھا کہ معاہدہ کے مطابق ابوبصیرؓ کو ان کے ولی کے حوالے کر دیجئے اور اپنی طرف سے بنی عامر بن لوئی کے ایک آدمی ایک غلام کی معیت میں آپؐ کے پاس بھیجا۔ آنحضرتؐ نے ابوبصیرؓ سے فرمایا کہ ہم وعدہ خلافی نہیں کر سکتے لہٰذا تم ان لوگوں کے ساتھ مکے واپس چلے جاؤ۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم جیسے کمزور مسلمانوں کا حامی و ناصر ہو اور تمہارے لئے کوئی نیک سبیل پیدا کر دے +

ابوبصیرؓ آپؐ کے ارشاد کے مطابق واپسی کے لئے روانہ ہو گئے۔ جب ذی الحلیفہ پہنچے تو موقعہ دیکھ کر بنی عامر کے شخص کو قتل کر دیا۔ غلام جان بچا کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع دی۔ ابوبصیرؓ کی اس حرکت پر آپ نے فرمایا ایسا نہ ہو کہ اس قسم کے لوگ جمع ہو کر قریش کے خلاف جنگ برپا کر دیں +

یہ بات سن کر عروہ بن مسعود الثقفی نے جس پر قریش کو اعتبار تھا اپنی قوم کو سمجھوتہ کرنے کی صلاح دی اور کہا کہ اس کام کے لئے مَیں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ سب نے عروہ کی بات مان لی۔ چنانچہ وہ قریش کا سفیر بن کر آنحضرتؐ کے پاس آیا۔ آپؐ نے اس سے بھی وہی کہا جو بدیل سے کہا تھا۔ وہ ہوشیار، تجربہ کار اور نہایت چالاک آدمی تھا۔ اس نے آزمائش کے لئے کئی باتیں ایسی کیں جو صحابہؓ کو بہت ناگوار گذریں۔ لیکن آنحضرت خاموش رہے۔ عروہ برابر کنکھیوں سے دیکھتا رہا کہ آپؐ کے صحابہ کس قماش کے لوگ ہیں اور اسی وجہ سے وہ کسی نہ کسی بہانے سے باتوں کو طول دیتا رہا تاکہ اسے ان کے سمجھنے اور صحیح اندازہ کرنے کا موقع ملے۔

یہاں سے واپس جاکر عروہ نے اپنی قوم سے کہا کہ "مَیں نے کئی بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ مَیں قیصر، کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں سفارت کر چکا ہوں مگر میں نے عزت و احترام اور جاں نثاری کا وہ جذبہ کہیں نہیں دیکھا جو محمدؐ کے صحابہ میں دیکھا ہے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ لوگ ان کی شرط قبول کریں۔ یہ معقول و مناسب ہے۔ اس پر بنی کنانہ کے نمایندے نے کہا کہ قبل اس کے کہ آپ کوئی فیصلہ کریں میں چاہتا ہُوں کہ میں بھی محمدؐ سے مل لوں۔

بنی کنانہ کے نمایندے کے آنے کی خبر سُن کر آنحضرتؐ نے اسے متاثر کرنے کے لئے قربانی کے جانوروں کو ایسی جگہ کھڑا کر دیا جہاں وہ انہیں دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ آپ جانتے تھے کہ قربانی کے جانوروں کے معاملے میں اس خاندان کا جذبۂ دینداری کیا ہے۔ یہ نمایندہ بنی حارث بن عبد مناۃ کے خاندان سے تھا اور اس وقت حبوش کا سردار تھا۔ جب اس نے وادی کے اندر قربانی کے نہایت عمدہ جانوروں کی اتنی بڑی تعداد دیکھی تو وہ بہت متاثر ہؤا اور آنحضرتؐ سے ملے بغیر قریش کے پاس چلا گیا۔ اور بولا کہ مسلمان صرف عمرہ کی غرض سے آئے ہیں وہ اپنے ہمراہ قربانی کے جو جانور لائے ہیں ان کی گردنوں میں قلادوں کے نشانات پڑ گئے ہیں۔ مَیں نے دیکھا کہ وہ لوگ زور زور سے لبیک! لبیک! کہہ رہے تھے لہٰذا وہ شر کے لئے نہیں آئے ہیں عمرہ کرنا چاہتے ہیں، انہیں مکے آنے کی اجازت دے دینی چاہیئے۔

اس کے بعد قریش کی طرف سے صلح کرنے کے لئے ایک وفد آیا۔ گفت وشنید

ابو بصیر اس خوف سے کہ انہیں پھر مکّے نہ بھیج دیا جائے شام جانے والے راستے پر ذی المروہ کے نواحی جنگل میں جو سمندر کے کنارے واقع تھا جا چھپے۔ وہاں مکّے سے کچھ اور بھی مسلمان آکر پناہ گزیں ہو گئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کی تعداد ستر تک پہنچ گئی اور معاش کے لئے انہوں نے قریش کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ قریش ان کی لوٹ مار اور غارت گری سے بہت پریشان ہوئے۔ اُنہوں نے آنحضرتؐ کو لکھا کہ آپؐ انہیں تحریر کر دیجئے کہ جو آپؐ کے پاس آجائے گا وہ مامون ہوگا۔ چنانچہ آپؐ نے لکھ دیا۔ اس پر یہ لوگ مدینہ منوّرہ آگئے اور اس طرح صلح نامہ کی شرطوں میں خود قریش ہی کی درخواست پر ترمیم ہوئی ۔

اسباق

صلح حُدیبیہ کے دوسرے مفید نتائج کے ساتھ ایک اہم نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ لڑائی بند ہونے سے لوگوں کو آنحضرتؐ اور مسلمانوں سے ملنے اور انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ لہٰذا سلیم الفطرت لوگوں کے قلوب اسلام کی طرف کھنچے اور جب ان کے سامنے اسلام کو پیش کیا گیا تو وہ مسلمان بن گئے۔ چنانچہ صلح کے بعد دو سال کے اندر لوگ اِس کثرت سے ایمان لائے کہ اس سے پہلے اتنے عرصے میں کبھی نہ لائے تھے ۔

دُوسرا اہم نتیجہ یہ برآمد ہُوا کہ قبائل کو آزادی مل گئی کہ وہ قریش یا مسلمانوں میں سے جس سے چاہیں معاہدہ کریں۔ اس سے مسلمانوں کے حلیف قبائل کی تعداد بڑھ گئی۔ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں دُور ہوئیں اور اسلام کے اثر و قوت میں اضافہ ہُوا ۔

دفاعی نقطہ نظر سے آنحضرتؐ نے ایسے اصول پر عمل کیا جسے انگریزی میں "اِن ڈائریکٹ اپروچ" (Indirect Approach) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُشمن کے خلاف ایسی دفاعی چال چلی جائے کہ بغیر لڑے اس کی ہمت اور حوصلہ ٹوٹ جائے۔ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے غزوۂ بنی لحیان پر پھر ایک دفعہ نظر ڈالئے۔ آنحضرتؐ اسے سزا دینے کے لئے تشریف لے گئے مگر جب اسے پہاڑوں میں رُوپوش دیکھا تو آپؐ غران سے عسفان پہنچے اور وہاں قیام فرماکر اپنے

دو شہسوار اس غرض سے مکّے کی طرف روانہ فرمائے کہ مکّے والے انہیں اچھی طرح دیکھ لیں۔ قریش آنحضرتؐ کی مہمات اور فوجی نقل و حرکت کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دن پہلے آپؐ کے غران سے عسفان آنے کی خبر سے اور بالخصوص مسلم شہسواروں کو مکّے کے اس قدر قریب دیکھ کر انہیں خطرہ پیدا ہو گیا کہ شاید مسلمان مکّے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی بنی لحیان کی مہم سے آنحضرتؐ نے بڑی عمدگی و کامیابی کے ساتھ دشمن کو فکر و پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اسے آنحضرتؐ کے ارادے کا کوئی علم نہیں تھا۔ گویا اس طرح آپؐ نے قریش کو نہ صرف اپنی دفاعی نقل و حرکت سے دھوکے میں رکھا بلکہ ایسی چال چلنے پر مجبور کیا جو بہ حیثیت حریف و مقابل ان کے لئے حربی اعتبار سے غلط تھی۔ نپولین نے "پُر اسرار نقل و حرکت اور دشمن کو گمراہ کرنے" کے الفاظ سے اپنے دفاعی اصول کی اہمیت کو بار بار واضح کیا ہے۔

بہرحال اب یہ دیکھنا چاہئے کہ آنحضرتؐ نے دشمن کو اس کشمکش میں ڈال کر کیا فائدہ حاصل کیا؟

آنحضرتؐ کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے داخلۂ مکّہ کی سخت مخالفت کریں گے حتّیٰ کہ جنگ سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ یعنی مسلمانوں کے قافلے کی مکّے کی طرف روانگی خواہ عمرہ ہی کے لئے کیوں نہ ہو جنگ کا باعث بن کر رہے گی۔ پھر بھی آنحضرتؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ میں عمرہ کے لئے جا رہا ہوں، میرا ارادہ جنگ کرنے کا نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان حالات میں یہ مناسب نہ تھا کہ آپؐ عمرہ کا ارادہ ترک کر کے روانگی سے قبل مکّے میں داخلے کے متعلق گفت و شنید سے شرائط طے فرما لیتے تاکہ کسی نزاع اور جنگ کا امکان ہی نہ رہتا؟

اس کا جواب بلا شبہ یہ ہے کہ مناسب نہ تھا اور اس لئے نہ تھا کہ اُس وقت دفاعی نقطۂ نظر سے مکّے کے جو حالات تھے ان کو سامنے رکھتے ہوئے قبل از روانگی شرائط کا طے کرنا دفاعی سیاست کے خلاف ہوتا اور وہ سبقت و تفوق جو آنحضرتؐ کو حاصل ہو چکا تھا ہاتھ سے جاتا رہتا۔ قریش نے بدر میں شکست کھائی، اُحد میں شکست کھانے کے بعد فتح کے قریب پہنچے مگر پھر ہار مان گئے، خندق کی لڑائی میں اُن کو دفاعی سیاست کے اعتبار سے شکست فاش ہو چکی تھی۔ اب صرف اس

شکست کا قبول کر لینا باقی رہ گیا تھا۔ آنحضرتؐ ان حالات کا اچھی طرح اندازہ کر چکے تھے۔ ایسی صورت میں مصالحت کی گفت و شنید کو لازمی طور سے دفاعی کمزوری پر محمول کیا جاتا اور اس کا اثر دوسرے قبائل پر بھی بُرا پڑتا۔ آنحضرتؐ کو ایک ایسا دفاعی منصوبہ تیار کرنا تھا جس سے جنگ بھی نہ ہو اور دشمن کی رہی سہی طاقت بھی سلب ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ نے ایسا منصوبہ بنایا اور غالباً یہ اپنی نوعیت کا پہلا منصوبہ ہے جو دُنیا کے سامنے آیا۔ مشہور امریکی جنرل شرمن (Sherman) اور نپولین نے جو تاریخِ مشرق کے بہت بڑے طالب علم تھے اسی قسم کے منصوبے بنا کر ان پر عمل کیا تھا+

قریش نے آنحضرتؐ کے اس راستے کا بہت غور سے مطالعہ کیا جو آپؐ نے بنی لحیان کے خلاف استعمال کیا تھا اور اس کے ساتھ لشکرِ اسلام کو روکنے کی تیاری بھی کی۔ مگر ان پر آنحضرتؐ کی دفاعی چال کا کچھ ایسا افسوں ہُوا کہ جو تدبیر کی وہ بیکار ثابت ہوئی۔ جب انہیں مدینے سے روانگی اور عسفان کا راستہ اختیار کرنے کی اطلاع ملی تو انہیں یقین ہو گیا کہ آپؐ پھر اُسی راستے سے تشریف لائیں گے جس پر چند ماہ پیشتر حرکت فرما چکے تھے چنانچہ اُنھوں نے اپنا لشکر اسی طرف روانہ کیا اور رسالے کو بطورِ ہراول کراع النعیم بھیجا تاکہ عسفان کی وادی سے آگے بڑھ کر مناسب موقعہ ملتے ہی مسلمانوں کو تباہ کر دے۔ اس کے ساتھ ہی پیدل فوج بھی رسالے کی مدد کے لئے برابر بڑھتی چلی گئی تاکہ اگر قافلۂ اسلام رسالے کو مغلوب کر لے تو پیدل فوج کمک کو پہنچ جائے۔ مگر آنحضرتؐ نے ذی الحلیفہ سے ایسا راستہ اختیار فرمایا جو قریش کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ قریش نے یہ سمجھ کر کہ یہ راستہ انتہائی دُشوار گذار ہے اس کی نگرانی کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ مکّی رسالے کو آنحضرتؐ کے قافلے کے آگے نکل جانے کی خبر اُس وقت ملی جب وہ مکّے سے چند میل کے فاصلے پر حدیبیہ کے قریب پہنچ چکا تھا اور راستہ روکنے والی قریشی فوج مکّے سے سینکڑوں میل دُور تھی۔ مکی رسالہ گھبراہٹ کے عالم میں مکّے کی طرف پلٹا مگر اس کی وجہ سے اپنی پیدل فوج سے دُور ہو گیا۔ گویا اس وقت مکّے کی دفاعی پوزیشن یہ تھی کہ قریش کی پیدل فوج کراع النعیم کے قریب تھی مگر اب واپس آ رہی تھی، رسالہ مکّے کی طرف تیز گامی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ قریش کے مددگار قبائل حدیبیہ کی کاریزوں کے پاس تھے اور ان ساری فوجوں، قبائلیوں

اور شہر مکّے کے درمیان آنحضرتؐ کا قافلہ یا لشکر قریش کی فوجوں کا راستہ روکے ہوئے تھا + فنِ حرب کے اعتبار سے قریش عملاً ہار چکے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ پھر آنحضرتؐ مکّے میں فاتحانہ طور پر داخل کیوں نہیں ہوئے؟

بلاشبہ اگر اس موقعہ پر آنحضرت صلعم کے علاوہ کوئی اور جرنیل ہوتا تو دُور اندیشی کو پسِ پشت ڈال کر ضرور شہر میں داخل ہو جاتا کیونکہ مکّہ شکار بن چُکا تھا۔ لیکن آنحضرتؐ جیسے کامل الفن اور یکتائے روزگار جرنیل سے اس غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں تھا۔ فوجی نقل وحرکت یا جہاد سے آپؐ کا مقصد یہ کبھی بھی نہیں تھا کہ محض فتوحات حاصل کی جائیں۔ آپؐ کا مقصد اور مشن امن و آشتی کا قیام اور فساد وطغیان کی بیخ کنی تھا۔ آپؐ کو جنگ کرنی پڑتی تو اسی مقصد کے حصول کے لئے نہ کہ فتح و نصرت سے لُطف اندوز ہونے کے لئے۔ آپؐ حتی الامکان خونریزی سے اجتناب فرماتے تھے۔ اس وقت مکّے کی فتح میں ذرا بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی لیکن زبردست خونریزی ہوتی اور اس کے ساتھ یہ بھی ممکن تھا کہ قریش کی فوج کا کچھ حصّہ یا ان کے حلیف قبائل انتقام میں مدینے پر حملہ کر دیتے۔ یہاں ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ جیسا ماہر جرنیل ان امکانات کے سدِّ باب کا بھی ضرور انتظام فرما لیتا اور فاتح بن جاتا مگر اس قسم کی لڑائی سے فتح صرف ایک قیمت پر حاصل کی جا سکتی تھی اور وہ یہ تھی کہ وسیع پیمانہ کی خونریزی مفتوح قبائل میں جذبۂ انتقام کی تخلیق و پرورش کرتی اور فتح ایک نئی جنگ کا پیش خیمہ بن کر مزید خونریزیوں کا سبب بن جاتی۔ مگر آنحضرتؐ نے تمام غزوات میں اس بات کو مدِنظر رکھا کہ مفتوح حقیقی و مُستقل امن سے قریب تر ہوں اور اسلام کے اعلےٰ اصولوں کو اختیار کر کے اپنے آپ کو مفتوح و مغلوب نہ سمجھیں بلکہ اسلامی مساوات کے رشتہ میں منسلک ہو کر کُلُّ مؤمنٍ اِخوۃٌ کا نمونہ بن جائیں اور دنیا کی معلمی و قیادت کے منصب جلیلہ پر فائز ہو کر دارین کی کامیابیاں حاصل کریں ایسی صورت میں حربی فتح سے اصل مقصد حاصل نہ ہوتا۔ پھر آپؐ کو اپنی فوقیت اور قریش کی کمزوری و بے بسی کا پورا علم و احساس تھا۔ آپؐ مطمئن تھے اسی لئے آپؐ نے نہ صرف کوئی ہجوم و اقدام کیا بلکہ پوری فیاضی اور وسعتِ قلبی کے ساتھ قریش کی تمام شرطوں کو من وعن منظور فرما لیا۔ اگر دشمن پر کاری ضرب نہ لگ چکی ہوتی اور آپؐ مطمئن نہ ہوتے

تومشہور روایت کے مطابق بدیل بن وقار الخزاعی سے یہ نہ فرماتے کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں، صرف عمرہ کرنے آئے ہیں۔ ہم نے لڑائی سے لڑنے سے پہلے ہی قریش کا کس بل نکال کر کمزور کر دیا ہے۔ گویا یہ واضح فرما دیا کہ باوجود تفوق و برتری ہم جنگ کی بجائے مصالحت چاہتے ہیں۔ بقول شخصے "عقلمنداں را اشارہ کافیست"۔ یہ ایسی زبردست دفاعی چال تھی کہ اس نے قریش اور دوسرے قبائل کو آپؐ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ نخوت و پندار کے نشے میں مست اہل مکہ پر نہایت کاری ضرب لگائی۔ بظاہر آنحضرتؐ نے قریش کی پیش کردہ شرطیں منظور فرمائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملاً مکے کو فتح کر لیا۔ صلح حدیبیہ آپؐ کی بہت بڑی کامیابی تھی اور واقعاتِ مابعد اس کامیابی کا روشن ثبوت ہیں +

تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ جب متحارب فریقین میں سے کسی نے حریف پر اس کے حسبِ توقع چال چلی یا ایسے مورچے پر حملہ کیا جہاں دشمن انتظار میں تھا تو ایسے حالات میں نتائج کبھی فیصلہ کن نہیں ہوئے۔ نپولین نے اسی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے' "اخلاقی طاقت جسمانی طاقت سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے" جب دو پہلوان لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو گرانے کے لئے ایسے داؤ پیچ کرتے ہیں کہ مخالف کا توازن بگڑ کر وہ خود بخود چاروں شانے چت گر جائے' کوئی پہلوان مقابل پہلوان کو اس وقت تک محض طاقت کے زور سے نہیں گرا سکتا جب تک کہ وہ اس سے بہت زیادہ طاقتور نہ ہو اور اس صورت میں بھی وہ اپنے آپ کو بیجا طریقے سے تھکا لیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی فوج کا سالار حریف کے خیال کے مطابق کارروائی کرتا ہے تو اس کی مثال اس پہلوان کی سی ہے جو محض طاقت کے بل پر مقابل کو گرانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ فیصلہ کن لڑائیاں ہمیشہ دشمن کی اخلاقی قوت کو شکست دے کر لڑی گئی ہیں۔ یعنی ان لڑائیوں میں اکھاڑے کے پہلوانوں کی طرح فریقین میں سے ایک نے دوسرے کو مناسب داؤ پیچ کام میں لاکر اپنی عقل سے شکست دی اور ضرب لگا کر اس کی طاقت کو زائل کر دیا +

دفاعی سیاست میں محض طاقت کے بل پر دشمن کے مغلوب کرنے کو پیریسلین (Periclean) پالیسی کہتے ہیں۔ اس پالیسی یا اصول کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی

طاقت سے دشمن کو اس درجہ کمزور کر دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دے اور شکست تسلیم کرلے۔ جب قابلیت کے ساتھ حربی سیاست اور داؤ پیچ سے اسے مجبورِ محض بنا کر کم سے کم طاقت کے استعمال سے زیر کیا جاتا ہے تو اسے Indirect Approach کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے اس موقعہ پر اس اصول کو نہایت قابلیت اور دانشمندی سے استعمال کیا اور قریش کی طاقت کو ختم کر کے ہمیشہ کے لئے تابع فرمان بنا لیا +

Indirect Approach کے سلسلے میں ہم جنرل شرمن کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس نے بھی امریکی سول وار (خانہ جنگی) میں ایٹلانٹا سے بحر اٹلانٹک (اوقیانوس) تک تیزی سے نقل و حرکت کر کے دشمن کی اخلاقی طاقت کے ساتھ اس کی فوجی قوت کو توڑ دیا تھا۔ اس نے اپنی پیادہ فوج کی اس طرح تربیت کی تھی اور اسے اس طرح تیار کیا تھا کہ اس کے بڑے بڑے دستے دشمن کے علاقے میں مشکل سے مشکل حالات کے ماتحت برق رفتاری سے گذر گئے اور دشمن کو مجبور و بدحواس کر کے مغلوب کر لیا۔ شرمن کی یہ لڑائی فنِ حرب میں ایک مثال کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بعد میں آنے والی نسلیں یہ سبق لیتی ہیں۔ کہ برق رفتار نقل و حرکت کس طرح کی جاتی ہے اور ایسے موقعہ پر غفلت یا مداہنت کے معنی کیا ہوتے ہیں +

صلحِ حدیبیہ کے کوچ کی مثال ہینی بال (Hanni Bal) کے کارناموں میں بھی ملتی ہے۔ ہینی بال بھی اسی قسم کی نقل و حرکت کا قائل تھا یعنی جس نقل و حرکت کو اس کا حریف ناممکن تصوّر کرتا تھا وہ اسی کو اختیار کرتا تھا اور ایسے راستوں سے جاتا تھا جو انتہائی دشوار اور ناقابلِ گذر سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح وہ دشمن کو کبھی اس کا موقعہ نہ دیتا تھا کہ وہ اپنے پسند کردہ مورچے یا میدان میں اس سے جنگ کرے +

صلح حدیبیہ کے واقعہ سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ جنگ کرتے وقت دُوراندیشی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اسی طرح یہ بات بھی لازمی ہے کہ فاتح بننے کی خواہش کا فتح کے نتائج و عواقب اور اثرات سے توازن کیا جائے۔ اگر فتح حاصل ہونے کے بعد بدامنی، خون ریزی اور تباہی ہو تو اس سے وہ امن بہتر ہے اور صلح جس سے اخلاقی طور پر دُشمن آگے چل کر شکست کھا جائے ہر اعتبار سے قابلِ ترجیح اور لائقِ تعریف ہے۔ لیکن ایسا طرزِ عمل اختیار کرتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھنا

ضروری ہے کہ جو قوم یا حکومت اخلاقی پستی کا شکار ہے وہ طاقت کے مظاہرے کو زیادہ مانتی ہے یعنی جس قوم یا حکومت پر یہ مثل صادق آتی ہو کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، تو ایسی صورت میں اپنے اصول کی خاطر اتنی طاقتور فوج کا رکھنا ضروری ہے جس کا جواب دشمن کے پاس نہ ہو۔ مثلاً غنڈوں اور شہدوں پر پند و نصائح اور معقولیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کے لئے پولیس کے ڈنڈے کی ضرورت ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آنحضرت نے اپنی دفاعی چال اور فوجی برتری کی بنا پر دشمنوں کو اپنی بات سُننے پر مجبور کیا اور اس طرح قریش تباہی سے بچے اگر انہیں آپ کی طاقت کا خوف نہ ہوتا تو وہ ہرگز نہ سُنتے اور ضرور خونریزی پر اُتر آتے +

تاریخ شاہد ہے کہ فتنہ پرور و پست اخلاق خواہ افراد ہوں یا اقوام دلائل و براہین سے کبھی راہِ راست پر نہیں آتے بلکہ اگر کہیں ان کے اطمینان و تشفی کی کوشش ہوئی تو کمزوری پر محمول کر کے اور دلیر ہو گئیں اور پہلے سے زیادہ جارحانہ طرزِ عمل اختیار کر لیا۔ لیکن ' کلوخ انداز را پاداش سنگ است ' پر عمل کیا گیا تو فتنہ انگیزی اور شرارت کا حوصلہ پست ہو گیا اور اوسان درست ہو گئے۔ یہ غنڈوں کی نفسیات ہے۔ لیکن اوسان درست ہو جانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سرشت بدل گئی اور وہ امن دوست بن گئے۔ یہ سمجھنا غلطی ہے۔ انہیں بتدریج بدلا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت مفسد و فتنہ پسند ہے تو اس سے عارضی صلح اکثر مفید نتائج مرتب کر سکتی ہے اور حسب ذیل متبادل صورتوں سے بہرحال بہتر و مناسب تر ہے:-

اوّل یہ کہ اُسے یا انہیں بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اس کے لئے خونریزی لازمی ہے اور ایسے لوگوں کو جب اپنے اس انجام کا علم ہوتا ہے تو وہ انتہائی بے باک اور خوفناک دشمن بن جاتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اب موت کے سوا کوئی چارہ نہیں لہٰذا اب کسی بات سے دریغ نہیں کرنا چاہئیے +

دوم یہ کہ اگر طرفین کی طاقت میں بہت زیادہ تفاوت نہیں ہے اور وہ حکومت جو اپنے آپ کو طاقتور سمجھتی ہے اور مقابل کو کمزور کرنا چاہتی ہے ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں ممکن ہے طاقتور فتحمند بن جائے مگر اس کے حصول میں مالی اعتبار سے وہ اتنی کمزور ہو جائے گا کہ فتح وبالِ جان بن جائے گی۔

پچھلی دو عالمگیر جنگوں کے فاتح اتحادیوں میں سے بہت سے اتحادی ملکوں کا یہی حشر ہوا ہے اور فتح ان کو بہت ہی مہنگی پڑی ہے۔ لیکن اگر صلح سے یہ خطرہ ہے کہ وقت ملنے سے مفسد و فتنہ پرداز کو قوت حاصل ہو گی تو صلح نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس کے معنی اپنی کمزوری دکھانا ہیں +

واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ آنحضرتؐ کی نظر کتنی صحیح و صائب تھی اور آپؐ نے جس حکمتِ عملی سے کام لیا وہ کس درجہ مفید و موثر تھی۔ صلحِ حدیبیہ دفاعی سیاست میں سنگِ میل کا حکم رکھتی ہے +

غزوۂ خیبر

صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرتؐ اُن قبائل کی طرف متوجہ ہوئے جو مدینے کے قرب و جوار میں فساد برپا کرنے میں مصروف تھے۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے بڑے فتنہ پرور خیبر کے یہودی تھے۔ مدینے سے خارج البلد ہونے کے بعد بنی نضیر خیبر میں آ گئے تھے اور یہاں کے یہودیوں نے انہیں پناہ دی تھی۔ قدرتی طور پر ان کی خواہش یہ تھی کہ بنو نضیر مدینے کے نخلستانوں پر دوبارہ قابض ہو جائیں۔ بنو غطفان خندق کی جنگ میں اور اس کے بعد بھی گوشمالی سے بچے رہے لہٰذا اُن کو یہ مغالطہ تھا۔ کہ آنحضرتؐ کو ان کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہیں ہے اس لئے وہ یہودیوں کے ورغلانے پر اور دلیر ہو گئے۔ چنانچہ جب آنحضرتؐ نے خیبر کے یہودیوں کی فتنہ پردازی کا خاتمہ کرنے کے لئے فوجی کارروائی شروع کی اور اس کی خبر مشہور ہوئی تو بنی غطفان ان کی مدد کو خیبر روانہ ہو گئے۔

آنحضرتؐ کی فوجی نقل و حرکت ہمیشہ پُراسرار ہوتی تھی۔ آپؐ نے خیبر کا رُخ کیا تو بجائے سیدھے تشریف لے جانے کے الرجیع کا راستہ اختیار فرمایا جو غطفان اور خیبر کے درمیان میں تھا اس لئے یہودیوں اور غطفانیوں میں سے کوئی بھی یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ حملہ کس پر ہونے والا ہے۔ چونکہ آنحضرتؐ اچانک حملہ کرتے تھے اور آپؐ کے دفاعی منصوبے کا کسی کو صحیح علم نہ ہوتا تھا اس لئے دونوں کو یہ خوف ہُوا کہ حملہ ہمارے اوپر ہونے والا ہے۔ لہٰذا غطفان کے قبیلے نے اپنے لشکر کو واپس بُلا لیا اور وہ یہودیوں کو چھوڑ کر اپنی حفاظت کی تدبیروں میں مصروف ہو گئے اور یہودی تنہا رہ گئے۔ آپؐ نے پہلے غطفان کے علاقے پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد بتدریج خیبر کی تسخیر شروع فرمائی۔

یہودیوں نے درۂ خیبر میں مختلف مقامات پر چھوٹے بڑے آطام اور قلعے بنا رکھے

تھے۔ یہ قلعے ایسے ہی تھے جیسے پشاور اور کوہاٹ کے درمیان یا پاکستان کے درۂ خیبر میں مختلف مقامات پر گڑھیوں، بُرجوں اور قلعوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہ ساری گڑھیاں اور قلعے وہاں کے رہنے والوں کی اور علاقے کے ایک خاص حصے کی حفاظت کرتے ہیں اور بیرونی حملہ آور کے مقابلے میں ایک زبردست سلسلہ وار حفاظتی مورچے کا حکم رکھتے ہیں۔ آجکل ان کے بُرجوں میں توپ اور بندوق وغیرہ چلانے کے سوراخ بنے ہُوئے ہیں۔ پہلے تیراندازی یا گوپیا اور ہاتھوں سے پتھر پھینکنے کا انتظام ہوتا تھا +

لشکرِ اسلام کے حملے کے بعد پہلے حصنِ ناعم نامی آطام فتح ہُوا۔ یہاں یہودیوں نے محمود بن مسلمہ پر چکی کا پاٹ پھینکا جس سے وہ شہید ہو گئے۔ حصنِ ناعم کے بعد قموص اور ابنِ ابی الحقیق کے آطام پر قبضہ ہُوا۔ پھر صعب بن معاذ کا قلعہ مسخر ہوا، جہاں سے اناج وغیرہ کے بڑے بڑے ذخیرے ہاتھ آئے۔ ان شکستوں کے بعد یہودی وطیح، سلالم اور خیبر میں جمع ہو گئے۔ شق، نطاۃ، اور کتیبۃ کے قلعے اور گڑھیاں بھی مسلمانوں کے قبضے میں آچکی تھیں +

آنحضرت صلعم نے ان قلعوں کو فتح کرنے کے لئے باری باری کئی سالار مقرر فرمائے اور مسلم فوج نے بارہ دن کے محاصرے کے دوران میں کئی مرتبہ انہیں فتح کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہُوئی۔ تیرھویں دن آنحضرتؐ خود میدانِ جنگ میں تشریف لے گئے اور سالاری کا علم حضرت علیؓ کے سپرد کر کے فتح کی دُعا فرمائی۔ حضرت علیؓ نے خیبر پر سخت حملہ کیا اور جنگ کے بعد قلعہ فتح ہو گیا اور قبیلے کا سردار کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق قید کر لیا گیا +

خیبر کی تسخیر کے بعد وطیح اور سُلالم کے محصورین نے جاں بخشی اور جلاوطنی کی شرط پر ہتھیار ڈال دیئے اور تمام جائداد چھوڑ کر نکل جانا منظور کر لیا۔ آنحضرتؐ نے ان کی پیشکش قبول کر لی اور جن یہودیوں نے بطور کاشتکار وہاں رہنے کی خواہش ظاہر کی انہیں اس کی اجازت دے دی +

بنی حارثہ کے محیصہ بن مسعود نے اپنی خدمات کے عوض یہودیوں سے کاشت کرانے کے لئے اس علاقے کو آنحضرتؐ سے اس وعدے پر لے لیا کہ کُل فصل کا نصف حصّہ

سالانہ مسلمانوں کو دیں گے۔ آنحضرتؐ نے بنو حارثہ کی اس درخواست کو اس شرط پر منظور فرمایا کہ جب تک ہمیں ضرورت نہ ہو تم بٹوارے پر کاشت کر سکتے ہو +

فدک کے قبائل نے نصف بٹوارے کی شرط پر بغیر جنگ کئے آنحضرتؐ سے صلح کر لی +

خیبر سے فارغ ہو کر آنحضرت صلعم جہاد کے لئے وادی القریٰ تشریف لے گئے مگر وہاں کے قبائل نے اطاعت قبول کر لی +

اس کے بعد آپؐ نے عمر بن الخطابؓ کو قبیلہ ہوازن کی تنبیہ کے لئے روانہ فرمایا۔ یہ مہم صرف تیس آدمیوں پر مشتمل تھی۔ یہ دستہ دن کو چھپا رہتا اور رات کو سفر کرتا مگر اس کے باوجود اہلِ قبیلہ کو مسلم دستے کی نقل و حرکت کا علم ہو گیا اور وہ ڈر کے مارے بھاگ کر پہاڑوں میں چھپ گئے +

ایک دوسرا دستہ آپؐ نے غالبؓ بن عبداللہ کی سرداری میں سبلغہ روانہ کیا۔ تاکہ مسلمانوں کے ایک حلیف کے قتل کی پاداشں میں بنی مرّہ کو سزا دے یہ دستہ تکمیلِ مہم کے بعد بہت سا مالِ غنیمت لے کر مدینے واپس آیا +

غالبؓ بن عبداللہ کے ماتحت ایک اور مہم بنی عبد بن ثعلبہ کو سزا دینے کے لئے بھیجی گئی +

عُمرہ اور حج۔

پچھلے سال ذی قعدہ میں آپؐ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تھے لیکن قریش نے آمادۂ جنگ ہو کر مکّے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہر چند کہ آپؐ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تیار نہ ہوئے البتہ انہوں نے صلح کر کے یہ منظور کر لیا تھا کہ آپؐ اگلے سال تشریف لائیں ہم تین دن کے لئے مکّہ خالی کر دیں گے +

اس شرط کے مطابق آپؐ اگلے سال اسی مہینے میں ان تمام صحابہؓ کو لے کر جو پچھلے سال آپؐ کے ہمراہ تھے مکّے روانہ ہوئے۔ اہلِ مکّہ کو آپؐ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو حسبِ قرارداد مکّے سے باہر چلے گئے مگر کچھ لوگوں کو شہر کے اندر چھوڑ گئے تاکہ وہ آنحضرتؐ اور مسلمانوں کی مالی پریشانیوں کا اندازہ لگائیں۔ معاندین نے یہ مشہور

کر دیا تھا کہ مسلمانوں پر افلاس طاری ہے اور فقر و فاقہ کشی نے انہیں بالکل نحیف و نزار کر دیا ہے۔ آنحضرتؐ کے فرمان کے مطابق تمام صحابہؓ نے تین دفعہ نہایت تیز رفتاری سے طواف کیا۔ اس کو دیکھ کر کفار کو بڑی حیرت ہوئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی مالی اور جسمانی حالت بہت اچھی ہے۔ حج سے فارغ ہو کر آپ مدینے تشریف لے آئے +

۸ھ

۸ھ کے ماہِ صفر میں آنحضرتؐ نے بنی ملوح کی گوشمالی کے لئے جاں بازوں کا ایک دستہ غالبؓ بن عبداللہ کی سرداری میں روانہ کیا۔ اس میں کل چودہ نفر شامل تھے۔ یہ مہم پوری طرح کامیاب رہی۔ دستہ کے ارکان کی جاں بازی اور بہادری کی مثال یہ ہے کہ غالبؓ بن عبداللہ نے جبل کدید کے نشیب میں دشمن کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے جندبؓ بن مکیثؓ الجہنی کو متعین کیا۔ دشمن نے انہیں دیکھ لیا مگر دور ہونے کی وجہ سے وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ کوئی انسان ہے یا پتھر۔ لہٰذا ایک تیر انداز نے تیر چلایا، اس کے بعد دو تیر اور چلائے گئے اور یہ تینوں جندبؓ کے جسم میں پیوست ہو گئے مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے، کہ دشمن کو خبر نہ ہو جائے۔ دشمن کو اطمینان ہو گیا کہ یہ پتھر ہے لہٰذا رات کو بے خبر سو گئے۔ مسلمانوں نے ان پر شبخون مارا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اور تمام مالِ غنیمت لے کر مدینے واپس چلے گئے +

جزیہ۔

اسی سال آنحضرتؐ نے علاؓ بن الحضرمی کو منذر بن ساویٰ العبدی کے پاس اپنا ایک مکتوب دے کر روانہ کیا جس میں لکھا تھا کہ جو شخص مسلمانوں کی طرح نماز پڑھے اور ان کا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے۔ اس کے وہی حقوق اور وہی ذمہ داریاں ہیں جو دوسرے مسلمانوں کی ہیں مگر جو اس سے انکار کرے اس سے جزیہ لیا جائے۔ مسلمان نہ ان کی عورتوں سے نکاح کریں گے اور نہ ان کا ذبیحہ کھائیں گے۔ مجوسیوں نے آنحضرتؐ کی یہ شرط منظور کر کے آپؐ سے صلح کر لی +

اسی طرح اس سال عمروؓ بن العاص کو عمّان بھیجا۔ وہاں کچھ لوگ مسلمان ہو گئے مگر جو ایمان نہ لائے انہوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا +

اسی سال کے ماہِ ربیع الاوّل میں شجاعؓ بن الیوب کو ایک دستہ دے کر بنی عامر

کی سرکوبی کے لئے روانہ فرمایا۔ یہ مہم بھی کامیاب رہی اور شجاع بہت سے اونٹ اور دوسرے مویشی بطور مالِ غنیمت لے کر واپس آئے۔

عمروؓ بن العاص اور خالدؓ بن ولید کا ایمان لانا

اس سال اوائل صفر میں عمروؓ بن العاص، عثمانؓ بن طلحہ البلاری اور خالدؓ بن ولید بن المغیرہ ایمان لائے۔ عمروؓ بن العاص کی عُمان کی مہم پر روانگی کا واقعہ اس کے بعد ہی کا ہے۔ تاریخ طبری میں عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ جنگِ خندق کے بعد مجھے خیال پیدا ہوا کہ اسلام دینِ برحق ہے۔ جب میں نے اس کا اظہار اپنے ساتھیوں سے کیا تو انہیں بھی اپنا ہم خیال پایا۔ لیکن ابھی ہمارے دل میں یہ وسوسہ ہی تھا کہ اگر قریش محمدؐ پر فتح یاب ہو گئے تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ ترکِ وطن کر کے نجاشی کے مُلک میں چلے جائیں اور وہاں رہ کر واقعات کا سکون و اطمینان سے مطالعہ کریں۔ جب ہم نجاشی کے دربار میں پہنچے تو ہم نے جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کو نجاشی سے مُلاقات کر کے واپس آتے دیکھا۔ جب ہم نجاشی کے سامنے گئے اور اس کو تحفے پیش کئے تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہم نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر عرض کیا کہ عمروؓ بن امیۃ الضمری جو جعفرؓ بن ابی طالب کے ہمراہ آئے تھے آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیجئے تاکہ انہیں قتل کر کے اپنے ان شرفاء کے قتل کا بدلہ لیں جو ان کے آقا محمدؐ کی لڑائیوں میں مارے گئے ہیں۔ اس بات کو سُنتے ہی نجاشی سخت برہم ہوا۔ مَیں نے فوراً معذرت کی اور ادب سے عرض کیا کہ اگر مجھے ذرا بھی گمان ہوتا کہ میرے سوال سے آپ کو رنج ہوگا تو مَیں ہرگز ایسی حرکت نہ کرتا۔

اِس پر نجاشی نے کہا کہ محمدؐ حضرت موسیٰؑ کی طرح پیغمبر ہیں اور ان کے پاس خدا کی طرف سے جبریلؑ احکام لے کر آتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جس طرح موسیٰؑ نے فرعون کے عصا کر پر فتح حاصل کی تھی، اسی طرح محمدؐ بھی اپنے دشمنوں پر فتح یاب ہوں گے۔ نجاشی کی زبان سے یہ سُن کر مجھے یقین ہو گیا کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔ لہٰذا مَیں نے نجاشی سے درخواست کی کہ آپ آنحضرتؐ کی طرف سے

مجھ سے بیعت لے لیں۔ مسلمان ہو کر میں مکّے کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں خالدؓ بن ولید اور عثمانؓ بن ابی طلحہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے سفر کا مقصد دریافت کیا تو اُنہوں نے کہا کہ ہم آنحضرتؐ کی خدمت میں مسلمان ہونے جا رہے ہیں۔ وہاں سے ہم تینوں خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر بیعت کے شرف سے مشرف ہوئے۔

عمروؓ بن العاص کی دُوسری مہم۔

جمادی الآخرہ میں آنحضرتؐ نے عمروؓ بن العاص کو تین سو صحابہؓ کے ساتھ بنی قضاعہ کی تالیفِ قلوب کے لئے بھیجا۔ ان کی تالیفِ قلوب کے علاوہ اس مہم کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان عربوں کو شام پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔ عمروؓ کی والدہ اسی قبیلے کے علاقہ بلّی کی رہنے والی تھیں اور بنی قضاعہ بلّی اور عذرہ کے علاقے میں مقیم تھے۔ جب عمروؓ چشمۂ سلاسل کے قریب پہنچے تو ان کو اندیشہ ہُوا کہ کہیں ان کی جماعت جو تین سو صحابہؓ پر مشتمل ہے اس کام کے لئے ناکافی نہ ہو لہٰذا انہوں نے آنحضرتؐ کے پاس پیغام بھیج کر مزید کمک کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے ابو عبیدہؓ بن الجراح کے ماتحت دو سو مہاجرین عمروؓ کی کمک کے لئے روانہ فرمائے۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔ اور روانگی کے وقت ابو عبیدہؓ سے فرمایا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے خلاف نہ ہونا۔ جب ابو عبیدہؓ سلاسل پہنچے تو عمروؓ نے ابو عبیدہؓ سے کہا کہ تم میری مدد کے لئے آئے ہو۔ ابو عبیدہؓ نے جواب دیا ' آنحضرتؐ نے مجھے ہدایت کی ہے کہ تم میں اور مجھ میں اختلاف نہ ہو لہٰذا میں تمہاری ہر حال میں اطاعت کرونگا۔ عمروؓ نے کہا میں تمہارا امیر ہوں۔ ابو عبیدہؓ نے کہا، بے شک آپ امیر ہیں۔ یہ مہم وہاں کے قبائل سے گفت و شنید کر کے واپس آ گئی مگر کوئی اطمینان بخش نتیجہ نہ نکلا +

یہ مہم اس اعتبار سے بہت اہمیّت رکھتی ہے کہ اس سے آنحضرتؐ کے ارشاد کی قدر و منزلت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ آنحضرتؐ جس صحابی کے سپرد جو کام کرتے وہ اسے پوری جاں نثاری کے ساتھ تکمیل کو پہنچاتا کسی قیمت پر کوئی ادنیٰ کوتاہی نہ ہونے دیتا۔ پھر جسے جس کام کے قابل سمجھتے اور جس مہم کا امیر بناتے

ادنیٰ و اعلیٰ سب اس کی فرمانبرداری کرتے۔ یہ عسکری نظم کا بہترین نمونہ ہے +

غزوہ الحبنط۔

آنحضرت صلعم نے ایک اور مہم ابو عبیدہؓ بن الجراح کی سیادت میں ساحلِ سمندر کی طرف روانہ فرمائی۔ اس میں تین سو انصار و مہاجرین شامل تھے۔ خوراک کی کمی کی وجہ سے ان لوگوں کو بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی اور کئی ہفتے جنگلی درختوں کے خشک پتے کھا کر بسر کئے۔ ایک جگہ اتفاق سے ایک سمندری جانور عنبیر کنارے پر آ گیا' اس کا شکار کر کے اس کے گوشت اور چربی پر کئی دن گذارے۔ کئی مہینوں کے بعد یہ دستہ واپس آیا تو آنحضرتؐ نے اس کی بہت تعریف کی۔ اس مہم کا نام غزوۃ الحبنط ہے +

شعبان میں آپؐ نے ابو قتادہؓ کو دو صحابہؓ کے ساتھ رفاعہ بن قیس کی شرارت کا خاتمہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ رفاعہ بنی جشم کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ غار کے علاقے میں اپنے لوگوں اور بنی قیس کو آنحضرتؐ کے خلاف اُبھارتا تھا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ رفاعہ کو پکڑ کر لاؤ یا اس کی اطلاع لے کر آؤ۔ یہ تینوں پیدل سفر کر کے غروب آفتاب کے وقت دشمن کی قیام گاہ کے قریب گھات میں بیٹھ گئے۔ رفاعہ کا ایک چرواہا غروبِ آفتاب کے بعد بھی واپس نہیں آیا تھا اس لئے وہ اکیلا اس کی تلاش میں نکلا۔ جوں ہی وہ ان جاں بازوں کے پاس سے گذرا اُنہوں نے اسے قتل کر دیا۔ پھر جب تاریکی بڑھ گئی تو اس کے ساتھیوں پر اچانک ٹوٹ پڑے۔ اس ناگہانی حملے سے وہ ڈر کر بھاگ گئے اور یہ بہت سا مالِ غنیمت لے کر واپس آئے +

غزوۂ موتہ۔

جمادی الاول کے مہینے میں ایک مہم شام روانہ کی گئی۔ اس کے امیر زیدؓ بن حارثہ بنائے گئے۔ یہ بہت بڑی مہم تھی جس میں تین ہزار مجاہدین شامل تھے اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اتنے بڑے لشکر کی سپہ سالاری آپؐ نے کسی صحابی کے سپرد فرمائی +

مہم کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا' اگر زید میدانِ جنگ میں شہید ہو جائیں تو ان کی جگہ جعفرؓ بن ابی طالب امیر ہوں اور اگر وہ بھی کام

آجائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ سردار ہوں۔ پھر جب لشکر روانہ ہوا تو آپؐ نے کچھ دُور تک خود اس کی مشایعت کی اور دُعا فرما کر مدینے تشریف لائے +

جب یہ لشکر شام کے مقام معان پر پہنچا تو خبر ملی کہ شاہِ روم ہرقل ایک لاکھ رومیوں کے لشکر کے ساتھ بلقا کے شہر مآب میں ٹھہرا ہوا ہے۔ پہلے یہ علاقہ رومیوں کے قبضے میں تھا مگر بعد کو بغاوت ہو گئی تھی جس پر انہوں نے اب پھر قابو پالیا تھا۔ اس رومی لشکر کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ آدمی دوسرے قبائل کے بھی جمع تھے، بنو لخم، بنو جذام، بنو بلقین، بنو بہرا اور بلی عرب کے بنو مستعربہ کے قبائل بھی تھے جن کا سردار مالک بن رافلہ تھا جو بلی کے قبیلے اراشتہ کا امیر تھا +

اس اجتماع کی خبر سُن کر لشکرِ اسلام نے دو دن تک معان میں قیام کیا تاکہ حالات کا صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکے۔ غور و بحث کے بعد طے ہوا کہ اگرچہ دشمن کی طاقت بہت زیادہ ہے مگر خوف زدہ ہو کر واپس جانا بزدلی ہے۔ لہٰذا اس کا مقابلہ کرنا چاہئے اور آگے بڑھنا چاہیئے +

یہاں سے پیشقدمی کر کے جب فوج تخوم پہنچی تو رومیوں اور قبائلیوں کے لشکر بھی آگے بڑھ کر بلقا کے قصبہ مشارف میں پہنچ گئے مسلم فوج نے موتہ پہنچ کر مورچہ بندی کی۔ میمنہ کے سالار قطبہؓ بن قتادہ مقرر ہوئے اور میسرہ کے عبایہؓ بن مالک انصاری +

یہ جنگ انتہائی خوفناک تھی۔ جب زیدؓ بن حارثہ شہید ہو گئے تو جعفرؓ بن ابی طالب سپہ سالار بنے۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے تو عبداللہؓ بن رواحہ نے ان کی جگہ لی۔ اور جب وہ بھی شہید ہو گئے تو اتفاق رائے سے خالدؓ بن ولید نے کمان ہاتھ میں لی۔ خالدؓ نے دشمن پر دفعتاً جوابی حملہ کیا اور تابِ مقاومت نہ لا سکا۔ رومی لشکر کے سپہ سالار نے اپنی فوج کو پیچھے ہٹ کر مورچہ بند ہونے کا حکم دیا۔ اس کے پیچھے ہٹنے سے خالدؓ کو اپنی فوج کو ترتیب دینے کا موقعہ مل گیا۔ آنحضرتؐ کو واقعاتِ جنگ کی تمام اطلاعات پہنچ رہی تھیں۔ جانی نقصانات کا حال معلوم کر کے آپؐ نے جہاد کا اعلان کیا، سپہ سالاروں کی شجاعت کی تعریف کی اور ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ خالدؓ کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں۔ اُسی دن سے خالدؓ بن ولید "سیف اللہ" کے لقب سے مشہور ہوئے +

آنحضرتؐ کے اعلانِ جہاد کی خبر رومیوں کے اتحادی لشکر میں پہنچی تو اس کا پہلا اثر بنو جدس کی شاخ بنو غنم پر ہُوا اور وہ جنگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کی علیحدگی سے دوسرے قبائل بھی متاثر ہُوئے اور وہ بھی اپنے اپنے علاقوں کو چلے گئے۔ فوج کی اس کمی کی وجہ سے رومی جو پہلے ہی پیچھے ہٹ چکے تھے اپنے مورچوں میں خاموش ہو گئے۔ اور اس کے بعد میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ خالدؓ بھی میدان خالی دیکھ کر اپنے لشکر کو لے کر مدینے واپس چلے آئے۔ جب یہ لشکر مدینے کے قریب پہنچا، تو آنحضرتؐ بہ نفسِ نفیس اس کے استقبال کے لئے تشریف لے گئے۔ آپؐ نے جعفرؓ بن ابی طالب کے نوعمر صاحبزادے عبداللہ کو اپنے گھوڑے پر اپنے سامنے بٹھایا اور دوسرے شہیدوں کے بچوں کو بھی گھوڑوں پر سوار کرایا۔ اہلِ لشکر سے مل کر آپؐ نے ان کی شجاعت و مردانگی کو سراہا، زخمیوں کی ہمت افزائی کی اور کل فوج کے حوصلے کو بڑھایا۔ یہ حوصلہ افزائی آپؐ نے ایسے موقعہ پر فرمائی جبکہ اہلِ مدینہ لشکرِ اسلام کے جانی نقصانات کی وجہ سے بڑی ندامت و شرمساری محسوس کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے اس طرح ان کے حوصلے بڑھا کر نہ صرف مجاہدین کے دلوں سے کوتاہیٔ فرض کے اندیشے اور شبہات دُور فرمائے بلکہ سارے مسلمانوں میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور منافقین کا منہ بھی بند کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ صحیح حالات کا اندازہ کرنا صرف آنحضرتؐ جیسے قابل اور دُور اندیش سالار کا کام تھا۔ چنانچہ تبوک کے غزوہ سے جو غزوۂ موتہ کے بعد ہُوا یہ ثابت ہو گیا کہ وہاں کے لوگ مجاہدینِ اسلام کی بہادری کا لوہا مان چکے تھے، اُن کی شکست اُس پکے ہُوئے پھل کی مانند تھی جو مجاہدین کی گود میں گرنے والا تھا۔ چنانچہ وہ قبائل بغیر کسی مقابلہ و مجادلہ غزوۂ تبوک کے بعد باجگذار بن گئے۔

دعوتِ اسلام۔

آنحضرتؐ اللہ کے رسول تھے آپ کا اوّلین و آخرین مقصد دنیا میں اسلام کی تبلیغ اور امن و آشتی کا قیام تھا۔ آپؐ نے کفار و مشرکین سے لڑائیاں لڑیں، لیکن صرف اسی لئے کہ اعلائے کلمۃ الحق کے راستے سے رکاوٹیں دُور جائیں اور گمراہ

انسانیت کو ضلالت و تباہی کے راستوں سے ہٹا کر اسلام کے صراطِ مستقیم پر لایا جائے۔ چنانچہ غزوات سے پہلے اور ان کے بعد جب بھی وقت ملا آپ نے لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچایا۔ چنانچہ مختلف اوقات میں آپؐ نے اپنے صحابہؓ کو تبلیغ کے لئے مختلف مقامات پر روانہ فرمایا۔ ابنِ اسحٰق نے طبری کے حوالے سے حسب ذیل صحابہؓ کی روانگی کا حال لکھا ہے:-

۱۔ بنی عامر بن لوی کے سلیطؓ بن عمرو عبد شمس بن عبد ود کو یمامہ کے رئیس ہوزہ بن علی کے پاس روانہ فرمایا+

۲۔ بحرین کے رئیس منذر بن ساوی کے پاس علاءؓ بن الحضرمی کو بھیجا+

۳۔ عمروؓ بن العاص کو عمان کے رؤساء بنی ازد کے حیفعہ بن حلبد اور عباد بن حلبد کے پاس روانہ کیا+

۴۔ حاطبؓ بن ابی بلتعہ کو اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس کے پاس اپنا گرامی نامہ دے کر روانہ فرمایا۔ مقوقس نے آپؐ کے پاس چار باندیاں بطورِ نذر روانہ کیں+

۵۔ دحیہؓ بن خلیفۃ الکلبی الخزرجی کو ایک خط دے کر ہرقل قیصرِ روم کے پاس روانہ کیا۔ اس زمانے میں ابوسفیان بھی ہرقل سے ملنے گیا تھا۔ ہرقل نے ابوسفیان سے آنحضرتؐ کے حسب و نسب اور عادات و خصائل کے متعلق سوالات کئے۔ ابوسفیان نے ان کے صحیح صحیح جوابات دئے اور آپؐ کی تعریف کی۔ اس پر ہرقل نے ابوسفیان کو ہدایت کی کہ وہ آنحضرتؐ کے دعویٰ نبوّت کو نہ جھٹلائے۔ اس نے کہا کہ اگر میرے حالات مجھے اجازت دیتے تو میں اُن کی خدمت کرتا، مگر مجھے خوف ہے کہ وہ میری سلطنت پر غالب آجائیں گے۔ آنحضرتؐ کے خط کا مضمون یہ تھا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط محمدؐ رسول اللہ کی طرف سے ہرقل قیصرِ روم کے نام بھیجا جاتا ہے۔ جس نے راہِ راست اختیار کی وہ سلامت رہا۔ اما بعد، اسلام لاؤ، سلامت رہو گے، ایمان لے آؤ، اللہ تم کو اس کا دوہرا اجر دے گا، اگر میری اس دعوت سے اعراض کرو گے تو تمہاری ناواقف رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تم پر ہوگا۔"

روایت ہے کہ آنحضرتؐ کا مکتوب موصول ہونے کے بعد ہرقل نے دحیہؓ سے یہ بھی کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے صاحب نبیؐ برحق ہیں، یہی وہ نبی ہیں جن کے ہم منتظر تھے۔ اور جن کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے مگر مجھے رومیوں سے اپنی جان کا خوف ہے۔ اگر جان کا خوف نہ ہوتا تو مَیں ضرور ان کا اتباع کرتا۔ اب مناسب یہ ہے کہ تم ضغاطر اسقف کے پاس جاؤ اور اس سے اپنے صاحب کا حال بیان کرو۔ دحیہؓ ضغاطر کے پاس گئے اور سب حال بیان کیا۔ ضغاطر نے ان رومیوں سے جو گرجا میں جمع تھے آنحضرتؐ کے مکتوب کا ذکر کیا اور جیسے ہی اس نے آپؐ کے رسول ہونے کا اظہار کیا انہوں نے حملہ کر کے اسے وہیں ختم کر دیا +

اس واقعہ کے بعد دحیہؓ ہرقل کے پاس واپس آئے تو اُس نے کہا، مجھے جس بات کا خطرہ تھا وہی پیش آئی۔ رومیوں کے دل میں ضغاطر کی قدر و منزلت بہت زیادہ تھی۔ جب انہوں نے اسے رسولؐ کی تعریف سنتے ہی قتل کر دیا تو میرا بھی یہی حشر ہوگا، لہٰذا مَیں مجبور ہوں۔ دحیہؓ روم سے واپس آ گئے +

۶۔ بنی اسد بن حزیمہ کے شجاعؓ بن وہب کو منذر بن الحارث بن ابی شمر الغسانی والئ دمشق کے پاس اپنا مکتوب دے کر بھیجا مگر منذر اس خط کو پڑھ کر برانگیختہ ہو گیا، اور اس نے دعوتِ اسلام کو ٹھکرا دیا +

۷۔ جعفرؓ بن ابی طالب کی سیادت میں عمروؓ بن امیۃ الضمری کو دوسرے صحابہؓ کے ساتھ اپنا مکتوب دے کر حبشہ کے بادشاہ نجاشی الاصحم کے پاس بھیجا۔ مکتوبِ گرامی کا مضمون یہ تھا:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - یہ خط محمدؐ رسول اللہ کی جانب سے حبشہ کے بادشاہ نجاشی الاصحم کے نام روانہ کیا جاتا ہے۔ محفوظ رہو۔ مَیں تمہارے سامنے اللہ کی جو تمام کائنات کا حاکم ہے، پاک ہے، امان ہے اور امان دینے والا صاحبِ قدرت ہے۔ تعریف کرتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ عیسیٰؑ ابن مریم اللہ کی رُوح اور اس کا کلمہ تھے جس نے اسے نیک پاک اور عفیفہ مریمؑ کے بطن میں ڈالا اور عیسیٰ بطنِ مریم میں بشکلِ حمل جلوہ افروز ہُوئے۔ اللہ نے ان کو اپنی روح اور دم سے اسی طرح پیدا کیا جس طرح

اس نے آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور پھر اس میں جان پھونکی۔ مَیں تم کو اس اللہ کی طرف جو ایک ہے، کوئی اُس کا شریک نہیں، دعوت دیتا ہوں کہ اس پر ایمان لاؤ۔ اس کی فرمانبرداری میں میرا ساتھ دو، میری پیروی کرو اور میری رسالت کو مانو کیونکہ مَیں اللہ کا رسُول ہوں۔ میں نے اپنے چچا زاد بھائی جعفرؓ کو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ آپؐ کے پاس بھیجا ہے۔ جب یہ تمہارے پاس پہنچیں تو تم ان کی تواضع کرنا اور حکومت کے غرور کو ترک کر دینا۔ میں تم کو اور تمہاری رعایا کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ مَیں نے اللہ کا پیغام تم کو خلوص کے ساتھ پہنچا دیا۔ تم میری اس نصیحت کو قبوُل کرو۔ اس پر سلامتی ہو جس نے راہِ راست کا اتباع کیا"۔

نجاشی نے مکتوبِ گرامی کے جواب میں آنحضرت صلعم کو لکھا:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ عریضہ نجاشی الاصحم کی جانب سے محمدؐ رسول اللہ کے نام ارسال ہے۔ اے اللہ کے نبیؐ آپ پر سلامتی ہو۔ اور اس اللہ کی جو بلا شرکت ایک ہے اور جس نے مجھے اسلام کی ہدایت کی ہے رحمت و برکات آپؐ پر نازل ہوں۔ اے اللہ کے رسول مجھے جناب کا خط موصُول ہوا جس میں آپؐ نے عیسٰیؑ کا ذکر کیا ہے۔ خود انہوں نے بھی اس پر ایک شمّہ زائد نہیں کیا اور نہ کہا۔ مَیں آپؐ کی رسالت کا معترف ہوں۔ مَیں نے آپؐ کے چچا زاد بھائیؓ اور ان کے ساتھیوں کو اپنا مہمان بنا لیا ہے اور شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول اور دوسرے انبیاء کے مصدّق ہیں۔ مَیں نے آپؐ کے لئے آپ کے چچا زاد بھائی کی بیعت کر لی ہے اور ان کے ہاتھ پر رب العالمین کے لئے اسلام لے آیا ہوں۔ میں اپنے بیٹے ارحا ابن الاصحم بن الجبر کو آپؐ کی خدمت میں بھیجتا ہوں کیونکہ مَیں صرف اپنے نفس کا مالک ہوں۔ اور اگر آپؐ کی یہی خواہش ہو کہ مَیں خود حاضر ہوں تو مَیں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ آپؐ کا ارشاد برحق ہے۔

والسلام علیک یا رسول اللہ!"

۸۔ آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن حذافہ السہمی کے ہاتھ کسریٰ کو یہ مکتوب بھیجا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - یہ خط محمدؐ رسول اللہ کی جانب سے فارس کے بادشاہ کسریٰ کے نام بھیجا جاتا ہے - سلامتی ہو اس پر جس نے راہِ راست کا اتباع کیا، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا اور اس بات کی شہادت دی کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسولؐ ہیں جو تمام اہلِ عالم کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں تاکہ وہ جو زندہ ہیں ان کو آخرت سے ڈرائیں - اسلام لاؤ محفوظ رہو گے اور اگر اس سے انکار کرو گے تو تمام مجوسیوں کا وبال تم پر ہو گا"+

کسریٰ نے آنحضرتؐ کا خط دیکھ کر پارہ پارہ کر دیا اور مسلمان نہ ہوا بلکہ حکم دیا کہ آنحضرتؐ کو اس کے سامنے حاضر کیا جائے - اس حکم کے بعد وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہا بلکہ قتل ہو گیا +

اسباق -

صلحِ حدیبیہ کے بعد آنحضرتؐ نے قریش کو نہتا کر دیا تھا لہٰذا اب ضرورت یہ تھی کہ دفاعی سیاست کے مطابق ان باتوں پر غور کیا جاتا جن سے مدینے میں مستقل امن قائم ہوتا - لہٰذا آنحضرتؐ نے ان یہودیوں کو مدینے کے قرب و جوار سے نکالنا ضروری سمجھا جو قطعی طور پر ناقابلِ اعتبار ثابت ہو چکے تھے - مگر آپؐ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ غطفان یہودیوں کی امداد کو ضرور آئیں گے اس لئے آپؐ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا کیا - اس کے بعد باری باری دونوں کو مغلوب کیا - اس طرح آپؐ کی فوج کثیر جانی نقصان سے بھی بچ گئی اور مہم بھی تھوڑے عرصے میں ختم ہو گئی - گویا آپؐ نے دونوں اتحادیوں کو اس طرح علیحدہ کیا جس طرح دروازے کو چوکھٹ پر کھولا جائے اور قلابے کو توڑ کر دروازے کو نکال کر پھینک دیا جائے - اس کارروائی کے لئے آپؐ نے فوجی نقل و حرکت کو اس طرح پوشیدہ رکھا کہ دونوں اپنی جگہ یہ سمجھتے رہے کہ مسلم فوج کا رُخ اس کی طرف ہے - ناگہانی حملے کی یہ بہترین مثال ہے - پھر آپؐ نے دشمن پر اس سمت سے حملہ کیا جس سے اسے حملہ ہونے کی مطلق توقع نہ تھی - اسی وجہ سے یہودیوں کی عرصے کی جنگی تیاریاں محض ایک چال سے مات ہو گئیں +

اس قسم کے حملے کی مثال ہمیں دوسری جنگِ عظیم میں ملتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جرمن فوج نے مارشل راڈسٹیڈ کے ماتحت میجنولائن کے میسرہ پر حملہ کیا۔ اتحادی فوج اس خیال میں تھی کہ جرمن ۱۹۱۴ء کے حملے کا اعادہ کر رہے ہیں اس لئے انہوں نے کمک کے لئے ایک بڑی فوج بلجیم بھیجی۔ مگر جرمنوں کی ٹینک فوج نے اتحادی فوجوں کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا کہ دونوں معطل ہو کر رہ گئے۔ اس طرح تقسیم کرنے کے بعد جرمنوں نے پہلے ایک حصّے کو ڈنکرک کے راستے مار بھگایا اور دوسرے حصّے کو میجنولائن کے عقب سے حملہ کر کے مغلوب کر لیا۔ میجنولائن سامنے سے حملہ کرنے والے کے لئے نہایت مضبوط اور خطرناک روک تھی، اس کے استحکام میں کوئی شُبہ نہیں تھا مگر عقبی حصّے پر دفاع کا کوئی موثر انتظام نہ تھا۔ یہ حملہ بھی ایسا ہی تھا کہ پہلے اس نے دروازے کو کھولا۔ پھر قلابے پر سے اُکھاڑ کر پھینک دیا ؛

یہاں یہ بات بھی مدِّ نظر رکھنے کے قابل ہے کہ آپؐ نے خیبر کے باغی یہودیوں کو بنی حارثہ کے یہودیوں کی مدد سے نکالا اور اس امداد کے صلے میں بنی حارثہ کو خیبر کے باغات اور زرعی اراضی کاشت کے لئے ان شرائط پر دی کہ جب مسلمانوں کو باغات و اراضی کی ضرورت ہوگی ان سے واپس لے لی جائے گی ؛

بہرحال یہود کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے آپؐ نے انہیں بہت کمزور کر دیا ؛

اب اس بیان کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ آنحضرتؐ نے اپنے دفاعی منصوبے کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس میں مدینے کو مرکز اور مکّے کو دائرے کا نصف قطر بنا کر اس کے اندر کے تمام مخالفین کو یکے بعد دیگرے مغلوب کر لیا۔ اگر تلوار ایک طرف رہی تو ڈھال دوسری طرف، ہجرت کے دوسرے سال سے برابر اس منصوبے پر عمل ہوتا رہا۔ غزوۂ خیبر میں آپؐ کی تلوار غطفان اور خیبر کے یہودی قبائل کی طرف تھی اور ڈھال دوسری سمت میں۔ اس کی تفصیل آئندہ کسی باب میں پیش کی جائے گی ؛

فتحِ مکّہ

عرب کے دو قبائل بنو بکر اور بنی خزاعہ میں زمانۂ قدیم سے عداوت چلی آرہی تھی - ان میں سے جب بھی کسی ایک کو دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا موقعہ ملتا تو وہ قتل و غارت گری سے باز نہ رہتا - جس وقت اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اس وقت تقریباً سارے قبائل ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے لیکن اسلام کی عداوت نے ان میں عارضی طور پر اتحاد پیدا کر دیا اور ان سب نے مل کر متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی - مگر یہ کوشش زیادہ عرصے تک کامیاب نہ رہی - صلحِ حدیبیہ کے وقت بنو بکر نے قریش کے ساتھ دوستی کا عہد کیا تو ان کے حریف بنو خزاعہ نے مسلمانوں سے پیمانِ وفا باندھا اور اس طرح حریف قبائل حریف جماعتوں کے حلیف بن گئے - اس عہد و پیمان کی وجہ سے عداوت کے پرانے جذبات پھر تازہ ہو گئے اور بنو بکر نے اپنے ہم قوم اسود بن رزن کے بیٹوں کے قتل کا انتقام لینے کے لئے جو بنو خزاعہ کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے یہ بہترین موقعہ سمجھا - اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے دوست قبیلہ بنی الدیل سے ساز باز کی ۔

بنی الدیل کے رئیس نوفل بن معاویۃ الدیلی نے بنی خزاعہ پر ایسے وقت شبخون مارا جبکہ وہ اپنے ایک وتیر پر مقیم تھے - بنی خزاعہ یہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ گئے تو وہاں بنو بکر نے کھلّم کھلّا بنی الدیل کی مدد کر کے پھر جنگ جاری کر دی - جب جنگ نے زیادہ بڑھی تو قریش بھی خفیہ طور پر بنی الدیل اور بنی بکر کی مدد کو پہنچ گئے اور ہتھیاروں اور سپاہیوں سے مدد کرنے لگے - بنی خزاعہ چونکہ مکّے کے قریب ہی تھے لہٰذا انہوں نے بھاگ کر حرم میں پناہ لی اور بنی کعب سے مدد کی درخواست کی - بنی کعب کے عمرو بن سالم الخزاعی فریاد لے کر آنحضرتؐ کے دربار میں مدینے آئے اور بنو بکر قریش کی عہد شکنی کی شکایت کی - آنحضرتؐ نے عمرو بن سالم سے مدد دینے کا

وعدہ کیا۔ اس کے بعد بدیل بن ورقا اور خزاعہ کے چند نمایندے بھی حاضر خدمت ہوئے۔ اور حملے اور شبخون کے تمام واقعات سُنائے۔ آنحضرتؐ نے ان کو تشفی دی اور صحابہؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے اور صلح کی توثیق کے لئے آنے والا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ابوسفیان اس غرض سے مکّے سے روانہ ہو چکا تھا :

چنانچہ جب بُدیل بن ورقا اور اس کے ساتھی مدینے سے واپسی میں عسفان پہنچے تو وہاں ان کی ابوسفیان سے ملاقات ہوئی۔ وہ قریش کی طرف سے معاہدۂ صلح کی توثیق اور اضافۂ مدت کے سلسلے میں آنحضرت صلعم سے گفت وشنید کرنے کے لئے مدینے جا رہا تھا۔ گو ابوسفیان کو اس کا یقین تھا کہ یہ لوگ آنحضرتؐ سے مل کر آرہے ہیں پھر بھی اس نے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو اور کہاں کا قصد ہے۔ بدیل نے جواب دیا کہ اپنے کچھ ہم قوموں سے ملنے گیا تھا جو ساحل پر وادی میں مقیم ہیں۔ اس پر اس نے کہا کہ محمدؐ سے ملنے تو نہیں گئے تھے۔ بدیل نے جواب دیا، نہیں :

چونکہ ابوسفیان کے دل میں چور تھا لہٰذا وہ ناقہ پر سوار ہو کر اس جگہ گیا جہاں بدیل نے رات کو قیام کیا تھا۔ وہاں اُس نے اس کے اونٹ کو مینگنی کو توڑ کر دیکھا تو اس میں سے کھجور کی گٹھلی نکلی جس سے اس کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ وہ مدینے گیا تھا اور آنحضرتؐ کو تمام حالات کی اطلاع دے کر آیا ہے :

جب ابوسفیان مدینے پہنچا تو اپنی بیٹی اُمِ حبیبہ کے مکان پر جو آنحضرتؐ کی زوجہ تھیں گیا۔ مگر جب بیٹی نے مُشرک باپ کی طرف توجہ نہ کی تو وہ اُٹھ کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے آنے کی غرض بیان کی۔ جب آنحضرتؐ نے بھی اس کو کوئی جواب نہ دیا تو وہ اُٹھ کر پہلے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے پاس آیا اور ان سے مدد کی درخواست کی۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کے پاس پہنچا۔ لیکن ان دونوں نے مجبوری ظاہر کی۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ حضرت علیؓ کے پاس گیا اور اپنی قرابت اور پچھلے تعلقات کا واسطہ دے کر مدد مانگی مگر حضرت علیؓ نے بھی اظہارِ معذوری کیا۔ مجبور ہو کر ابوسفیان حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے پاس گیا اور ان کے بیٹے کا واسطہ دے کر اپنے لئے امان طلب کی۔ جب یہاں سے بھی انکار ہُوا تو وہ بہت گھبرایا اور حضرت علیؓ سے دوبارہ

امان کا طالب ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم بنی کنانہ کے رئیس ہو' تمہارے لئے مناسب یہ ہے کہ مسجد میں برسرِعام اہلِ مدینہ سے امان مانگو اور فوراً اپنے وطن کو واپس چلے جاؤ۔ ابو سفیان نے ایسا ہی کیا اور اونٹ پر سوار ہو کر فوراً مکّے کو چلا گیا ؛

جب وہ قریش کے پاس پہنچا اور سفارت کے حالات بیان کئے تو سب نے کہا کہ علیؓ نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہے اور تمہاری درخواست کو سب نے ٹھکرا دیا ہے ؛

ابوسفیان کی واپسی کے بعد آنحضرتؐ نے سفر کی تیاری کا حکم دیا اور مسلمانوں سے کہا کہ ہم مکّے جا رہے ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی تاکید فرمائی کہ اسلامی لشکر کی نقل و حرکت کی دشمن کو خبر نہ ہونے پائے اور جاسوسوں کا پورا خیال رکھا جائے۔

حاطب بن ابی بلتعہ کے قرابت والے مکّے میں تھے' انہوں نے ان کی عافیت کے خیال سے قریش کو خفیہ طور پر آنحضرتؐ کے ارادے کی اطلاع دینے کے لئے خط لکھا اور قبیلۂ مزینہ کی ایک عورت کے ہاتھ روانہ کیا۔ اس عورت نے خط کو سر پر رکھ کر اوپر سے بال گوندھ لئے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے ؛

آنحضرتؐ کو اس کی خبر ہو گئی۔ آپؐ نے حضرت علیؓ اور زبیر بن العوام کو بُلا کر ان سے فرمایا کہ حاطب نے اہلِ مکّہ کو ہماری تیاریوں کی اطلاع دینے کے لئے ایک خط لکھ کر ایک عورت کے ذریعے بھیجا ہے تم اس کو پکڑ کر وہ خط اس سے لے آؤ۔ ان دونوں نے اسے حلیفۂ ابنِ ابی احمد میں جا پکڑا اور تلاشی لی مگر خط نہ نکلا۔ حضرت علیؓ نے اس کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی دھمکی دی تو اس نے فوراً وہ خط سر میں سے نکال کر دے دیا۔ اس طرح اسلامی لشکر کی نقل و حرکت کی خبر مکّے نہ پہنچ سکی ؛

مدینے سے روانہ ہو کر آنحضرتؐ نے کُدید میں قیام کیا۔ کدید عسفان اور امج کے درمیان ہے۔ یہاں سے بڑھ کر مرالظہران پہنچے۔ آپؐ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا۔ مرالظہران میں بنی سلیم اور بنی مزینہ (جس میں مسلمانوں کی تعداد کافی تھی) کا لشکر بھی آنحضرتؐ کے ساتھ ہو گیا ؛

اگرچہ آپؐ مرالظہران میں مع اپنے لشکر کے مقیم تھے مگر قریشِ مکّہ اور دیگر قبائل

کو اس کا علم نہ ہو سکا کہ آنحضرتؐ کا قصد کس طرف کا ہے۔ کسی نے افواہ اڑائی کہ ہوازن جا رہے ہیں، کسی نے کہا بنی ثقیف کی تادیب کے لئے جا رہے ہیں۔ عباس بن عبد المطلب کو آنحضرتؐ کے مدینے سے روانہ ہونے کی خبر ہوئی تو وہ اس ارادے سے مکّے سے نکلے کہ آپؐ کی نقل و حرکت کا پتہ چلائیں اور حتی الامکان قریش پر حملہ کرنے سے روکنے کی کوشش کریں تاکہ وہ تباہ و برباد نہ ہوں۔ وہ مکّے سے اراک پہنچے اور رات کے وقت آنحضرتؐ کی نقل و حرکت کی جستجو میں مصروف تھے کہ ان کے کان میں ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقا کی آوازیں آئیں۔ وہ بھی آنحضرتؐ کی نقل و حرکت کا حال معلوم کرنے کے لئے مکّے سے نکلے تھے۔ جب یہ سب مل کر آگے بڑھے تو انہوں نے بہت دُور کچھ چولھے جلتے ہوئے دیکھے۔ انہیں دیکھ کر بدیل نے ابوسفیان سے کہا کہ یہ چولھے بنی خزاعہ کے ہیں۔ مگر ابوسفیان نے کہا نہیں، یہ غلط ہے۔ عباس نے کہا، میرے خیال میں محمدؐ کے لشکر والوں کے ہیں۔ ابوسفیان اتنے بڑے لشکر کا اندازہ کر کے گھبرایا اور اس نے عباس سے مدد طلب کی۔ عباس نے اسے اپنے خچر پر بٹھایا اور آنحضرتؐ کے کیمپ میں لے گئے تاکہ ابوسفیان کو امان دلا دیں۔ رات کا وقت تھا مگر مجاہدین نے آنحضرتؐ کے چچا عباس کے سفید خچر کو دیکھ کر پہچان لیا اور اُن کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچ کر عباسؓ نے ابوسفیان کیلئے امان چاہی۔ آپؐ نے امان دینا منظور کر لیا اور دوسرے دن پھر ابوسفیان کو اپنے ساتھ لانے کے لئے ارشاد فرمایا۔ دوسرے دن عباسؓ ابوسفیان کو لے کر پھر آپؐ کی خدمت میں آئے۔ ابوسفیان نے آپؐ کے سامنے آ کر کلمہ شہادت پڑھا۔ اور مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے عباس سے فرمایا کہ ابوسفیان کو اس وادی کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دیجئے تاکہ وہ اسلامی لشکر کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ لشکرِ اسلام نے مارچ شروع کیا۔ جیسے جیسے مختلف قبائل کے لشکر گذرتے ابوسفیان عباسؓ سے پوچھتا، یہ کون ہیں۔ عباسؓ بتاتے یہ فلاں ہیں اور یہ فلاں۔ پہلے بنی سلیم کا لشکر تھا۔ اس کے بعد بنو اسلم کا۔ اس کے بعد جہینہ کا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کے مجاہدین (مہاجرین و انصار)

کا - اس عظیم الشان فوج کو دیکھ کر ابو سفیان آنحضرت کی اجازت سے دوڑتا ہُوا مکے گیا اور اپنے لوگوں سے پکار پکار کر کہا کہ محمدؐ بہت بڑا لشکر لے کر آرہے ہیں، جو لوگ مسجد میں، میرے مکان میں یا اپنے گھروں میں دروازے بند کر کے بیٹھے رہیں گے اور جنگ نہ کریں گے وہ مامون رہیں گے۔ چنانچہ اہلِ مکّہ نے ایسا ہی کیا؛

آنحضرت صلعم نے مکّے میں داخلے کے لئے فوج کو مختلف سالاروں کے ماتحت تقسیم کر کے ہر ایک کو معیّنہ سمت سے داخل ہونے کی ہدایت فرمائی۔ زبیرؓ کو مہاجرین و انصار کے رسالے کے دستے کا سالار بنا کر علمِ نبوی عطا فرمایا اور حکم دیا کہ وہ اسے مکّے کے بالائی حصّہ حجون میں نصب کریں اور تا حکمِ ثانی اپنی جگہ پر قائم رہیں؛

خالدؓ کو قضاعہ اور بنی سلیم کے علاوہ دوسرے مسلم قبائل مثلاً اسلم، غفار، مرینہ اور جہینہ وغیرہ کا سالار مقرر فرمایا اور مکّے کے زیریں حصّے کے مقام لیط سے داخل ہونے کا حکم دیا۔ اس طرف قریش نے بنو بکر کو اپنے مددگار کے طور پر تعینات کیا تھا اور بنی بکر کی مدد کے لئے بنی حارث بن عبد منات کو اپنے اور حبشی لشکر کے ساتھ مقرر کیا تھا؛

ایک مضبوط دستہ جس میں مہاجرین و انصار شامل تھے حضرت علیؓ کے ماتحت تھا۔ دوسرا دستہ کُدا کی سمت سے داخل ہونے کے لئے مقرر کیا گیا۔ خود رسولِ اکرمؐ اذافر سے داخل ہُوئے؛

داخلے سے قبل آپؐ نے تمام سالاروں کو ہدایت فرمائی کہ سوائے اس شخص کے جو خود تمہارے مقابلے پہ آئے کسی سے نہ لڑنا۔ اس کے ساتھ آپؐ نے چند لوگوں کے نام بتا کر ارشاد فرمایا کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے اور اگر مزاحمت و مقاومت کریں تو قتل کر دیا جائے؛

بنی بکر اور حبشیوں نے خالدؓ کے داخلے کے وقت مزاحمت کی جس کی وجہ سے کچھ خونریزی ہُوئی، مگر انہیں سخت شکست ہوئی۔ اس کے علاوہ کسی جگہ لڑائی نہیں ہوئی اور لشکرِ اسلام بغیر کسی مزاحمت کے مقررہ سمتوں سے داخل ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے مکّے میں تشریف لا کر اعلان فرمایا کہ اہلِ مکّہ آزاد ہیں، قریش کے کچھ لوگ جن میں عکرمہ بن ابی جہل بھی شامل تھا مکّے سے بھاگ گئے تھے مگر فتحِ مکّہ کے بعد امان حاصل

کر کے پھر واپس آ گئے ؛

اسباق

فتحِ مکّہ کے سلسلے میں آپؐ نے جو اصول اختیار کئے وہ وہی ہیں جو آجکل اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر نے (Indirect Approach) کے ذہنی اصولوں کو بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ پہلے وہ پراپیگنڈا کر کے دشمن کے مُلک میں جذباتِ مخالفت کو ختم کرتا تھا اور اس طرح اپنے حملے کی کامیابی کو یقینی بنا لیتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی دشمن کے طاقتور معاونوں کو اس سے جُدا کر دیتا تھا تاکہ اگر وہ اُن سے خود کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے تو دشمن کی طاقت ٹوٹ جائے۔ پھر اس کے مُلک میں بے چینی پیدا کی جاتی تھی جس سے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی پست ہو جاتا تھا۔ اس نے ۱۹۳۸ء میں انہی اصولوں پر عمل کر کے جرمنی کو عظیم تر جرمنی بنایا تھا ؛

آنحضرت صلعم نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے اس دفاعی سیاست پر اس طرح عمل فرمایا کہ عقل حیران ہے۔ آپؐ نے پہلے قریش کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ پھر قریش کے معاونین کو ان سے الگ کیا۔ صلح حدیبیہ کے ذریعے ان کا رہا سہا وقار ختم کر دیا' اس کے بعد مکّے کی فتح پکے ہوئے پھل کی مانند ہو گئی جو ذرا سی جنبش سے گود میں آ گرا۔ مگر اس کے باوجود آپؐ نے قریش کو تباہ نہیں کیا۔ آپؐ نے انہیں ذلیل و خوار نہیں کیا بلکہ باستثنائے چند افراد سب کو فوراً آزاد کر دیا' نہ کسی کی جان اور آبرو سے تعارض کیا نہ مال سے' اور یہ اس لئے کہ آپ کا مقصد اصلاح و تعمیر تھا نہ کہ تخریب و انتقام۔ آپؐ ان کو محافظِ مکّہ رکھنا چاہتے تھے اور اُن سے دوسرے کام لینے والے تھے۔ اگر انہیں اس درجہ گرایا جاتا کہ اسلامی معاشرہ پر بوجھ بن جاتے تو فتح بجائے رحمت کے مصیبت بن جاتی۔ مگر آپؐ نے اس طرح کام کیا کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی ؛

دُشمن کو کمزور کرنے کے تین طریقے ہیں :-

۱ - مادی نقصان پہنچا کر اس کی ہمت کو پست کرنا ؛

۲ - اخلاقی طور پر شکست دینا ؛

۳ - ذہنی شکست دینا -

ان تینوں میں سب سے کم اہمیت کی چیز مادی نقصان ہے - اس کمزوری کو یا تو دشمن خود موقعہ پاکر پورا کرلیتا ہے یا اس کے اتحادی اپنے مفاد کو مدِنظر رکھ کر اسے تباہ ہونے سے بچا لیتے ہیں - مثلاً دوسری عالمگیر جنگ میں فرانس کی شکست سے اتحادیوں کو سامانِ حرب وضرب کا زبردست نقصان پہنچا، مگر اسے کچھ تو خود برطانیہ نے پورا کر لیا، کچھ امریکہ کی مدد سے پورا ہوگیا - مگر حکومتِ فرانس کے باقیماندہ نمایندوں کو سارے اتحادیوں نے مل کر کھڑا کیا - اسی طرح جرمنی کے حملوں سے روس تہ و بالا ہوگیا، لیکن ۱۹۴۱ء میں برطانیہ و امریکہ کی مدد سے اس نقصان کی بڑی حد تک تلافی ہوگئی اور وہ جرمنوں کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا ؞

مگر مالی شکست کے مقابلے میں اخلاقی شکست کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے - نپولین نے اسے ایک اور تین کی نسبت سے تعبیر کیا ہے - مالی اور مادی نقصان کی جلد یا بدیر تلافی ہوسکتی ہے مگر اخلاقی شکست کی تلافی ناممکن ہے - مثال کے طور پر ۱۹۴۰ء میں فرانس کی شکست کو لیجئے - اخلاقی پستی کی وجہ سے وہ ۱۹۴۰ء میں ہتھیار ڈال چکا تھا لیکن کچھ لوگوں نے جن میں اتحادی ملکوں کے ذرائع کاربرآری مثلاً ملکی مزاحمت پسندوں کی تنظیم (Resistence movement) اور جانباز فوج نے کارہائے نمایاں انجام دے کر فرانس میں جان ڈال دی اور وہ صفحۂ ہستی سے مٹنے سے بچ گیا، یعنی فرانسیسیوں میں اخلاقی شکست کے آثار پوری طرح پیدا نہیں ہوئے تھے لہٰذا وہ پھر کسی نہ کسی طرح جی اٹھا - مگر ذہنی شکست سب سے زیادہ مہلک ہے - جب ذہنی شکست طاری ہوجاتی ہے تو پھر زندگی نہیں رہی ؞

آنحضرت صلعم نے دشمن کو پہلے بدر میں مالی شکست دی - پھر جنگِ خندق میں اخلاقی شکست دی اور صلحِ حدیبیہ میں ذہنی شکست دے کر بالکل مجبور و بے بس بنا دیا - صلحِ حدیبیہ نے کفار کو مسلمانوں کے ساتھ ملنے جلنے، اسلام، بانیٔ اسلام اور مسلمانوں کے سمجھنے، ان کے اخلاق و کردار کو جاننے اور خوب و زشت میں امتیاز کرنے کا موقعہ دیا اور اس سے مکّے کی فتح آسان ہوگئی ؞

اس زمانے میں روس ذہنی شکست کے دفاعی اصول کو نہایت مؤثر طور پر استعمال

کر رہا ہے ؛

ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب آنحضرتؐ کو مکّے کی فتح کا یقین تھا تو آپؐ نے اتنے زبردست پیمانے پر جنگی تیاری کیوں کی اور اِتنا بڑا لشکر لے کر کیوں گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرتؐ اہلِ مکہ کو کم سے کم نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اگر وہ کمتر تیاری اور کمتر تعدادِ فوج کے ساتھ جاتے تو قریش جنگ کئے بغیر نہ رہتے اور اس جنگ میں جانی و مالی دونوں قسم کے نقصان ہوتے اور اس کے بعد ان کی مزاحمت ختم ہوتی لیکن عظیم الشان لشکر کو دیکھ کر قریش اور ان کے حلیفوں کے اوسان جاتے رہے اور ذہنی شکست ایسی طاری ہوئی کہ مقابلے کی ہمّت نہ رہی۔ گویا فتحِ مکّہ کے وقت آنحضرتؐ کی حیثیت اس جرّاح کی سی تھی جو آپریشن سے پہلے یہ یقین کر لیتا ہے کہ اوزار درست ہیں، آپریشن کا موقعہ ٹھیک ہے اور مریض آپریشن کے لئے تیار ہے، ایسے موقعہ پر عموماً بے ہوشی کی دوا سُنگھا دی جاتی ہے، فتحِ مکّہ میں آنحضرتؐ جرّاح یا سرجن تھے، اہلِ مکّہ مریض اور اسلامی لشکر کے دستے جنہیں مختلف سمتوں سے شہر میں داخل ہونے کے لئے روانہ کیا گیا بیہوش کرنے والی دوا تھے جنہوں نے مریض یعنی مکّے والوں کو بے حس و حرکت بنا دیا ؛

قابل جرنیل وہ ہے جو اپنی فوج کا کم سے کم نقصان کر کے دشمن پر زیادہ سے زیادہ گہرا اثر قائم کرے۔ فتحِ مکّہ تاریخِ عالم میں اس عسکری قابلیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اور آنحضرت صلعم دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ قابل جرنیل ؛

فتحِ مکّہ کے بعد!

فتحِ مکّہ کے بعد بھی حسبِ سابق آپؐ نے مختلف مقامات کو مختلف مہمیں روانہ کیں۔ لیکن ان میں سے کچھ مہمیں سابقہ مہموں سے مختلف تھیں۔ ان میں آپؐ کے حکم سے بعض قبائلی علاقوں کو بُتوں اور بُت خانوں کی نجاست سے پاک کیا گیا ؛

چنانچہ آپؐ نے خالدؓ بن ولیدؓ کو نخلہ روانہ فرمایا۔ وہاں بنی سلیم کی ایک شاخ بنی شیبان رہتی تھی۔ ان لوگوں کا دیوتا عُزّٰی تھا۔ خالدؓ نے بُت کو توڑ دیا اور بُت خانے کو منہدم کر دیا ؛

عمروؓ بن العاص رباط روانہ کئے گئے۔ وہاں کے بُت خانے میں ہدیل کا بُت تھا۔ انہوں نے آنحضرتؐ کے حکم سے اسے توڑ کر ختم کیا۔ اسی طرح اوس اور خزرج کے بُتوں کو سعدؓ بن زید الاشہلی نے پاش پاش کیا ؛

غزوۂ ہوازن۔

فتحِ مکّہ کے بعد آپؐ کو مکّے میں قیام فرما ہوئے صرف نصف مہینہ ہوا تھا کہ بنی ہوازن اور ثقیف کی جنگی تیاریوں کی خبر ملی۔ یہ قبائل ذی المجاز کی وادی میں مقیم تھے۔ گو ہوازن کے کچھ قبیلے مسلمانوں سے لڑنے کو آمادہ نہ ہوئے پھر بھی کافی بڑا لشکر حُنین کے مقام تک بڑھ آیا جو اپنے ساتھ عورتوں، بچوں اور بھیڑ بکریوں کو بھی لے آیا تھا۔ جب یہ اوطاس پہنچا تو دوسرے قبیلے جو ابھی تک ہوازن کے لشکر میں شامل نہ ہوئے تھے اس کے پاس آ گئے۔ قبیلے کا مشہور ماہرِ فنِ حرب دُرید بھی اس کے ساتھ تھا اور ضعیفی کی وجہ سے کجاوے میں بیٹھ کر آیا تھا۔ اس نے اوطاس کے میدان کو بہت پسند کیا کیونکہ وہاں رسالوں کی نقل و حرکت کے لئے کافی جگہ تھی۔

اور زمین بھی نہ زیادہ نرم تھی نہ سخت اور پتھریلی۔ جب اس نے ہوازن کے سرداروں کے نام دریافت کئے تو وہ انہیں سُن کر خوش نہ ہوا اور کہنے لگا کہ یہ لوگ تجربہ کار نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ اس نے مالک بن عوف النصری کو جو ان کا سالار تھا مشورہ دیا کہ وہ عورتوں اور بچّوں کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دے۔ مگر مالک نے اس کے مشورے پر عمل نہ کیا اور جنگ کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

آنحضرت صلعم کے ساتھ تقریباً بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ تاریخ طبری میں جابرؓ سے مروی ہے کہ جب ہم وادیٔ حنین کے سامنے آئے تو تہامہ کی وادیوں میں سے ایک نہایت گہری وادی میں اُترے۔ اُتار اسقدر سیدھا تھا کہ بے اختیار خود بخود آہستہ اُترتے چلے گئے۔ صبح کا وقت تھا اور دشمن ہم سے پہلے پہنچ کر وادی کے پیچ دار نشیبوں اور موڑوں میں ہماری تاک میں بیٹھا تھا۔ ہم بے خبری میں اُترتے چلے جارہے تھے کہ دشمن نے کمیں گاہوں سے نکل کر ناگہانی حملہ کیا۔ ہم مقابلہ نہ کر سکے اور بھاگنے لگے۔ کوئی کسی کی طرف مُڑ کر نہ دیکھتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ وادی کے داہنی جانب ایک طرف کو ہٹ کر ٹھہرے اور سب کو للکارا کہ کہاں جارہے ہو؟ میرے پاس آؤ۔"

جب سرکش اہلِ مکّہ نے جو آنحضرتؐ کے ساتھ تھے مسلمانوں کو اس طرح بھاگتے دیکھا تو وہ اپنی خباثت ظاہر کئے بغیر نہ رہے۔ ابوسفیان بن حرب کہنے لگے کہ اب یہ سمندر سے اِدھر نہ رکیں گے۔

آنحضرتؐ نے ذاتی بہادری سے موقعہ پر قابو پایا۔ ان کے شانہ بشانہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہؓ نہایت دلیری سے دست بدست لڑنے لگے۔ انہیں لڑتے دیکھ کر دوسرے مسلمان بھی رفتہ رفتہ اپنے سالاروں کے گرد جمع ہو گئے۔ چند مسلمان عورتیں جو لشکر کے ساتھ تھیں انہوں نے بھی اس موقعہ پر بڑی بہادری دکھائی اور مردوں کے دوش بدوش دشمنوں کے ساتھ بڑی بے جگری سے لڑیں۔

جب کافی جمعیت ہو گئی تو مسلمانوں نے جوابی حملے شروع کئے۔ ان میں دشمن کے تمام نامور سردار مارے گئے۔ بنو ثقیف کے کئی علمبردار یکے بعد دیگرے قتل ہوئے جن میں ایک عثمان بن عبداللہ بھی تھا۔ ہوازن کا مشترکہ اتحادی عَلمِ جنگ

قارب بن الاسود بن مسعود کے ہاتھ میں تھا وہ اسے ایک جھاڑی میں پھینک کر اپنے ساتھیوں سمیت بھاگ گیا ؛

پانسہ پلٹا ہوا دیکھ کر باقی بنو ہوازن بھی بھاگنے لگے ۔ ان میں سے ایک جماعت نے طائف کا رُخ کیا ' دوسری نے اوطاس کا ۔ آنحضرتؐ نے طائف کی سمت جانے والے دشمنوں کے تعاقب کے لئے اپنا رسالہ روانہ کیا ۔ ان کے ساتھ مالک بن عوف بھی تھا ۔ ان میں سے کچھ لوگ نخلہ کی طرف چلے گئے ۔ مالک کے رسالے نے اپنی بھاگتی ہوئی فوج کا دفاع اس طرح کیا کہ وہ ایک گھاٹی پر مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے ۔ جس سے وہ مسلم فوج کے ہاتھ نہ آسکی ؛

آنحضرتؐ حنین سے خود طائف تشریف لے گئے ۔ پہلے آپ نحلیۃ الیمانہ گئے اور وہاں سے قرن و ملیح ہوتے ہوئے لیۃ کے بحرۃ الرغا آئے ۔ جہاں آپ نے مسجد تعمیر کرائی اور مالک بن عوف کے محل کو گروا دیا ۔ اس کے بعد صنیقہ کے راستے سے نجب اور نجب سے طائف وارد ہوئے ؛

طائف پہنچ کر آپؐ نے بنی ثقیف کا محاصرہ کیا جو پندرہ روز تک جاری رہا ۔ اس کے بعد وحنا کے راستے سے مع لشکر جعرانہ تشریف لے گئے ۔ یہاں ہوازن کے قیدی رکھے گئے تھے ۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے ہوازن کی درخواست پر چند آدمیوں کے علاوہ باقی سب کو آزاد کر دیا ؛

مالک بھاگ کر طائف میں چھپ گیا تھا ۔ جب آپؐ مدینے واپس تشریف لائے تو موقعہ پا کر وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام لے آیا ۔ اس کے بعد گرد و نواح کے دوسرے قبائل نے بھی رفتہ رفتہ اسلام قبول کیا ۔ جن میں بنو ثمالہ فہم و رسلمہ کے قبیلے بھی تھے ۔ آنحضرت صلعم نے مالک کو اپنے قبیلے کے علاوہ باقی ان تمام قبیلوں کا عامل (گورنر) مقرر کیا ۔ بنو ثقیف ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے ۔ وہ بہت گھبرائے ۔ پھر جب بنی اسد بھی مسلمان ہو گئے تو اُنہوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک وفد بھیج کر امان چاہی ۔ مگر یہ درخواست کی کہ ہمارے بُت لات کو تین سال تک نہ توڑا جائے ۔ آنحضرت صلعم نے یہ درخواست نامنظور کر دی ۔ وہ اس پر بھی

رضامند ہو گئے اور بالآخر اسلام لے آئے۔ مغیرہؓ بن شعبہ نے اپنے ہاتھ سے ان کے بُت لات کو توڑ کر ختم کیا ۔

ان مہمات کا مقصد دشمن پر آخری اور کاری ضرب لگانا تھا۔ آنحضرتؐ کو اس میں پوری کامیابی ہوئی اور آپؐ نے مخالفین پر اخلاقی و ذہنی دونوں طرح سے فتح پائی ۔

غزوۂ تبوک

غزوۂ حنین سے فراغت پاکر آنحضرت صلعم ذی الحجہ سے رجب تک مدینے میں تشریف فرما رہے۔ قحط سالی کا زمانہ تھا، گرمی شدت کی پڑ رہی تھی، لوگ نخلستانوں میں دن گذار رہے تھے، اہلِ مدینہ اپنی فصلوں پر بہت زیادہ متوجہ تھے، مسلمانوں کی مالی حالت سقیم تھی، غرض اطمینان وسکون کی کوئی صورت نہ تھی کہ آنحضرت صلعم نے جہاد کی تیاری کا حکم دیا۔

آپؐ کا دستور یہ تھا کہ جہاں جہاد کے لئے تشریف لے جاتے اس مقام کا نام ظاہر نہ فرماتے تھے۔ مگر اس مرتبہ آپؐ نے تبوک جانے کا اعلان کر دیا۔ مورخین نے اس تبدیلی کے اسباب یہ بتائے ہیں:

۱۔ حریف کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس کو بہت طاقتور قرار دیا جاتا تھا۔

۲۔ سفر طویل اور منزلیں دشوار تھیں لہٰذا کافی انتظام کی ضرورت تھی۔ نام کا اعلان کرنے سے حسب ضرورت سب کو مناسب انتظام کرنے کا موقع مل گیا۔

۳۔ ملک میں قحط تھا اس لئے دوسرے مقامات پر سامانِ رسد کے حصول کی توقع بہت کم تھی اس لئے ضروری تھا کہ جملہ ضروری سامان حتی الامکان مدینے ہی سے فراہم کیا جائے۔

۴۔ سلطنتِ روم کے سطوت و جبروت کا سکہ ابھی تک عوام کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے مجاہدین کو یہ بتانا ضروری تھا کہ انہیں کس حکومت اور کونسی فوج سے لڑنا ہے تاکہ کمزور دل لوگ ساتھ جاکر لشکر پر بار نہ بنیں۔

آنحضرتؐ کے اس اصول پر ہٹلر نے دوسری جنگِ عظیم میں کئی مرتبہ عمل کیا۔ ہٹلر تاریخ اور دفاعی سیاست کا بہترین مبصر تھا۔ اس نے اس پر اس لئے عمل نہیں کیا کہ چونکہ فوجی

نقل وحرکت کی منزل کو ہر سالار سربستہ راز رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور حریف مقابل جاسوسی وخفیہ نگاری وغیرہ سے بڑی حد تک اس کا پتہ چلا لیتے ہیں لہٰذا اس کے برعکس عمل کی ضرورت تھی بلکہ وہ آنحضرتؐ کی دفاعی سیاست کے خوان کا ایک ادنیٰ ریزہ چین تھا۔ اور اس سے اس نے بہت فائدہ اُٹھایا۔ چنانچہ جب اس نے شروع میں حملہ کی جگہ کا اعلان کیا تو اس کے دشمنوں کو یقین نہ آیا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ اس مقام کے علاوہ وہ کسی دوسرے مقام پر حملہ کرے گا اور اس طرح وہ انہیں مغالطہ دینے میں کامیاب رہا۔ غزوۂ تبوک کے واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرتؐ کے اعلان کا بھی مخالفین کو یقین نہ آیا اور انہوں نے مقابلے کی کوئی تیاری نہ کی، یہاں تک کہ ایک قبیلے کا رئیس شکار کھیلتا ہوا گرفتار ہوا ؏

مورخین کے بیان کردہ وجوہ کے علاوہ ہمارے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مدینے میں منافقوں کی تعداد کافی تھی آپؐ ان کی شرانگیزی وفتنہ پردازی سے واقف ہونا چاہتے ہوں۔ مثال کے طور پر جب آپؐ نے جہاد کی تیاری کا حکم دیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اس گرمی میں اور اتنا طویل سفر بھلا موت کے منہ میں جانا نہیں تو اور کیا ہے۔ جب تم چلے جاؤ گے تو فصل کون کاٹے گا، اس قحط سالی میں فصلوں کو چھوڑ کر جانے سے سراسر نقصان ہوگا۔ چنانچہ چند افراد ان کی باتوں میں آگئے اور انہوں نے بہانے کرنے شروع کر دیئے ؏

مگر ساری مشکلات کے باوجود آنحضرتؐ نے سفرِ جہاد کی تیاری بہت تیزی سے کی اور آسودہ حال لوگوں کو فی سبیل اللہ غریب مسلمانوں کو سواری اور زادِ راہ مہیا کرکے اجر وثواب کا مستحق بننے کی ترغیب دی ؏

اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو مدینے میں اپنا نائب مقرر کیا۔ تاکہ آپؐ کی غیر حاضری میں جملہ امور کا انتظام کریں۔ اور لشکر لے کر روانہ ہوگئے۔ مدینے سے چل کر آپؐ نے ثنیۃ الوداع میں قیام فرمایا۔ عبداللہ بن ابی سلول نے جس کے ماتحت بہت بڑا دستہ تھا آپؐ سے علیحدہ جبانہ میں جبلِ دباب کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اسکے ساتھ بنی خزرج اور بنی قینقاع کے چند سردار بھی تھے۔ ان سب نے وہاں پہنچ کر جہاد میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کرکے آنحضرتؐ سے عُذر خواہی کی۔ آپؐ نے

ان کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ لیکن اس کے برعکس وہ لوگ جو مدینے ہی سے لشکر کے ساتھ نہ ہوئے تھے تیز رفتاری سے منزلیں طے کرتے ہوئے آپؐ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

ثنیۃ الوداع سے آنحضرتؐ کا لشکر جُنبش میں آیا ، اس کے بعد حجر میں مقیم ہُوا۔ مجاہدین میں سے اگر کوئی پیچھے رہ جاتا اور آپؐ کو اس کا علم ہوتا تو فرماتے اسے جانے دو۔ اگر ان لوگوں کی شرکت ہمارے لئے سُود مند ہے تو اللہ انہیں بہت جلد ہم سے ملا دے گا اور اگر اس کے خلاف ہے تو اللہ نے ہمیں ان کی طرف سے مطمئن کر دیا ہے تقریباً یہی الفاظ آپؐ نے عبداللہ بن ابی سلول اور اس کے ساتھیوں کی علیحدگی کے وقت بھی فرمائے تھے۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہُوا کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے وہ پھر آپؐ کے ساتھ مل گئے۔ مثلاً ابوذر غفاریؓ کا اونٹ سفر کی تکان کی وجہ سے ہٹ کرنے لگا۔ جب وہ کسی طرح نہ چلا تو ابوذرؓ غفاری نے تمام سامان اس پر سے اُتار کر اپنی پیٹھ پر لادا اور منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہُوئے رات کے وقت آنحضرتؐ کے پاس پڑاؤ پر پہنچ گئے۔

اس سلسلے میں مصنف اپنا ذاتی تجربہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہے ۱۹۴۰ء میں جب ہم ڈنکرک کے واقعہ کے بعد انگلستان پہنچے تو ۱۹۴۱ء میں اتحادی فوج نے فرانس پر دوبارہ حملے کی تیاریاں شروع کیں۔ فرانس میں جرمنوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے جہاں اور اسباب تھے وہاں ایک سبب یہ بھی قرار دیا گیا کہ اکثر فوجیوں نے مشینی جنگ کو غلط سمجھا اور وہ اتنے آرام طلب ہو گئے تھے کہ مختصر فاصلہ بھی موٹر گاڑی ہی میں طے کرتے تھے اور اس کی وجہ سے جنگ میں بڑی دُشواریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں ویلز (Wales) اور اس کے بعد اسکاٹ لینڈ (Scotland) کے برفانی پہاڑوں میں فوجیوں کو بھیجا جاتا رہا، مثلاً ایک بریگیڈ کو مصنوعی جنگ کے لئے بھیجا گیا تو تمام پیدل فوج (پلٹن والوں) کو تقریباً ایک سو میل کا فاصلہ پیدل چل کر چار یا اس سے کم دن میں طے کرنا پڑتا۔ اس سفر میں جو لوگ پیچھے رہ جاتے انہیں لاریوں وغیرہ میں سوار کر کے جمع نہ کیا جاتا بلکہ ان کیلئے حکم تھا کہ وہ خود چل کر دوسرے پڑاؤ پر یا اس سے اگلے پڑاؤ پر فوج کے ساتھ مل جائیں۔ ابتدائی سفروں میں بہت سے سپاہی تھک کر پیچھے رہ رہ گئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ بجائے اظہارِ ہمدردی کے ان کے ساتھی ان پر طعنہ زن ہیں تو پھر سب

میں چستی اور مستعدی آگئی اور شاذ ہی کوئی سپاہی کم ہمتی کی وجہ سے پیچھے رہتا۔ اس طرح ان کو عزم و حوصلہ سے کام لینے کا سبق دیا گیا ؛

آنحضرتؐ بھی ایسی ہی دشوار منزلیں طے فرما رہے تھے۔ اس سفر میں کمزور دل، کمزور جسم کے لوگوں کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ مگر اس طریقے سے مجاہدین میں عزم و حوصلہ کی طاقت بڑھ گئی ؛

جب آنحضرتؐ تبوک پہنچے تو بنو ایلیہ کے رئیس یُحنّہ بن رو بہ نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر جزیہ ادا کر کے صلح کر لی۔ اس کے بعد اہلِ جربا اور اذرج نے بھی صلح کر لی اور باقاعدہ تحریر لکھ کر جزیہ دینا منظور کر لیا ؛

آنحضرت صلعم نے خالد بن ولید کو بنو کندہ کے سردار اکیدر بن عبد الملک کے مقابلے پر روانہ کیا اور فرمایا کہ جب تم پہنچو گے تو اکیدر اپنے قلعہ دومہ کے باہر نیل گائے کا شکار کرتا ہوا ملے گا ؛

اکیدر نصرانی تھا اور چاندنی رات میں قلعہ کی فصیل پر اپنی بیوی کے ساتھ ٹہل رہا تھا کہ یکایک بیوی نے کہا کہ ایک نیل گائے قلعہ کے پھاٹک پر اپنے سینگوں سے ٹکریں مار رہی ہے اور اپنی موت کو بلا رہی ہے، جاؤ اس کا شکار کرو۔ اکیدر اپنے کچھ سپاہیوں کو لے کر نیل گائے کے پیچھے روانہ ہو گیا ؛

آنحضرت صلعم کو ہر ضروری بات وحی کے ذریعے معلوم ہو جاتی تھی۔ پچھلے غزوات میں بھی اس کا ذکر آ چکا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کے خفیہ نگار ہر بات کی اطلاع وقت پر دیتے تھے اور اس علم و اطلاع کی بنا پر آپؐ سب باتوں سے پوری طرح باخبر اور واقف رہتے تھے ؛

جس وقت اکیدر نیل گائے کے پیچھے قلعہ سے نکل کر جا رہا تھا خالدؓ اپنے دستے کے ساتھ قلعہ کی طرف آ رہے تھے۔ دونوں میں مقابلہ ہوا اور خالدؓ نے اکیدر کو گرفتار کر لیا ؛

آنحضرت صلعم کی خدمت میں پیش ہونے کے بعد اکیدر نے جزیہ کی شرط پر صلح کر لی اور آنحضرتؐ نے اسے اپنے قلعہ کو واپس جانے کی اجازت دے دی ؛

تبوک میں بارہ تیرہ روز قیام فرما کر آپؐ نے مدینے کو مراجعت فرمائی۔ وہ منافق جو

راستہ سے واپس آ گئے تھے یا بلا وجہ ساتھ نہیں گئے تھے ان سے آپؐ نے قطع تعلق کر لیا۔ مسلمانوں نے سلام و کلام ترک کر دیا۔ جس سے وہ بہت نادم ہوئے اور معافی کی درخواست کی جس پر آنحضرتؐ نے ان کو معاف کر دیا۔

غزوۂ تبوک کے بعد حسبِ ذیل امراء و رؤسا نے آنحضرتؐ کی خدمت میں خطوط روانہ کر کے اسلام لانے کا اظہار کیا :-

۱۔ حمیر بن حارث بن کلال نعیم بن کلال اور ذی رعین، جو ہمدان کے فرمانروا تھے۔

۲۔ معافر کے رئیس نعمان۔

۳۔ بنی بکا کے وفد نے مدینے آ کر اسلام قبول کیا۔

۴۔ بنی حارہ نے دس آدمیوں کا وفد بھیج کر اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا۔

۵۔ ثعلبہ بن منقذ اور سعد بن ہذیم حاضرِ خدمت ہو کر ایمان لائے اس کے بعد اپنے قبیلے کو مسلمان کیا۔

آپؐ نے خالدؓ بن ولید کو چار سو سوار دے کر بنی حارث بن کعب کے مقابلے پر روانہ فرمایا اور یہ ہدایت کی کہ اگر یہ لوگ تین دن کے اندر اسلام قبول کر لیں تو ان سے جنگ نہ کرنا۔ انہوں نے تین دن کے اندر اسلام قبول کر لیا اس لئے یہ مہم بغیر لڑے کامیابی کے ساتھ واپس آ گئی۔

شوال میں بنو سلامان کا اور رمضان میں غسان کا وفد آیا اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ اسی طرح بنی ازد کا وفد بھی مدینے آ کر اسلام لایا۔

اسی رمضان میں آنحضرتؐ نے علیؓ بن ابی طالب کی امارت میں خالدؓ بن ولید کو یمن بھیجا۔ وہاں سب لوگوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ خبر سن کر آنحضرتؐ نے اہلِ ہمدان کی سلامتی کی دعا فرمائی۔

اسی سال بنی زبید کا وفد عمرو بن معدی کی امارت میں حاضرِ خدمت ہو کر اسلام لایا اور انہی ایام میں بنی حنیفہ کے وفد نے بھی مدینے آ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔

پھر محارب، دیبن، بجران اور سعید کے وفود آئے اور آنحضرتؐ سے صلح کی درخواست کی۔

بنی عبس، حلاف، خولان، بنی زید کے قبائل بھی اسلام لائے۔ بنی طے نے اپنے سردار زید الخیل کو امیرِ وفد بنا کر آپؐ کی خدمت میں بھیجا اور ایمان لانے کا اعلان کیا۔

چونکہ اسلام حدودِ عرب میں دُور دُور تک پھیل گیا تھا اس لئے آنحضرتؐ نے تمام علاقوں میں عمالِ صدقات مقرر فرمائے۔

اسباق۔

غزوۂ تبوک سے آنحضرتؐ کی نقل و حرکت اور اسلام کی وسعت کا دائرہ اِس علاقے کو محیط کئے ہُوئے تھا جس کا نصف قطر مدینے سے مکّے تک تھا۔ اب آپؐ نے اس کو بڑھایا اور بڑھا کر ایک طرف ایران اور دُوسری طرف مصر تک کر دیا۔

تبوک کے گرد و نواح کے قبائل نے ابھی تک اسلام کی دعوت کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے لئے آنحضرتؐ بہ نفسِ نفیس تشریف لے گئے اور خلافِ معمول منزل کا اظہار و اعلان کر کے اس طرح تشریف لے گئے کہ کفار کو یقین نہ آیا اور انہوں نے مزاحمت و مقاومت کی کوئی تیاری نہ کی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ تبوک میں غیر متوقع ورود ہُوا اور دشمن کو جزیہ کی شرط تسلیم کر کے آپؐ سے صلح کرنی پڑی۔ باقی قبائل نے اسلام قبول کر لیا اور اس طرح اسلام دُور دُور تک پھیل گیا۔

تبوک کی مہم میں کوئی مقابلہ نہیں ہوا، کسی متنفس کی جان نہیں گئی۔ مگر نتیجہ فتح و کامیابی کی صورت میں برآمد ہُوا۔ اس کا راز یہ ہے کہ آپؐ نے دشمن کے خلاف وہ چال چلی جس کی وجہ سے وہ آپؐ کی نقل و حرکت سے بالکل غافل رہے، حتیٰ کہ منافقینِ مدینہ کو بھی اس کا یقین نہ آیا اور اس طرح جب آپؐ ان کے سر پہ پہنچے تو وہ بالکل مجبور و بے بس ہو کر رہ گئے۔

خُلاصہ

پچھلے ابواب میں آنحضرت صلعم کی زندگی کے اس پہلو کو روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں آپؐ دفاعی سیاست کے سب سے بڑے ماہر، دنیا کے کامیاب ترین سپہ سالار، اولوالعزم فاتح اور بہترین مدبر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں؛

ہجرت کے بعد آپؐ نے ستائیس۲۷ غزوات کئے اور جہاد کے لئے مختلف اوقات میں ۳۵ مہمات مختلف مقامات کو روانہ فرمائیں اور یہ سب دس سال کی قلیل مدت میں ہوا اور ان نتائج کے ساتھ کہ مخالفتوں اور عداوتوں کے زہرہ گداز طوفان ختم ہو گئے، سرکش و گردن فراز بندگانِ بے دام بن گئے، خون کے پیاسے اور جان کے دشمن جاں نثار و فداکار ہو گئے، جہاں کفر و شرک کا دور دورہ تھا وہاں اسلام کا طوطی بولنے لگا، وحشت و بربریت کی جگہ انسانی مجد و شرف نے لے لی، تہذیب و شائستگی مایۂ خمیر ہو گئی، جہاں تشتت و افتراق اور بدنظمی تھی وہاں نظم و اتحاد قائم ہو گیا، زندگی سرتاسر رحمت بن گئی اور اہلِ عرب دُنیا کے ہادی و مُعلّم ہو گئے؛

پھر آپؐ کو معلوم ہے کہ اس فقید المثال کامیابی کی رفتار کیا تھی، تدریج و تواتر کے ساتھ وُسعت کا عالم کیا تھا، فتوحات کا دائرہ کس تیزی سے بڑھا اور سارے غزوات و مہمات میں نقصانِ جان کا اوسط کیا رہا۔ ۲۷۴ مربع میل یومیہ کی رفتار سے دس سال تک مسلسل توسیع۔ مسلمانوں کا نقصانِ جان ایک نفر ماہانہ اور دشمن کا بمشکل ۱۵۰۔ اور جب دس سال پورے ہو گئے اور آنحضرتؐ کا مشن تکمیل کو پہنچ گیا تو دس لاکھ مُربع میل سے زیادہ علاقہ زیرِ نگیں تھا اور لاکھوں انسان صمیم قلب سے فرمانبردار۔ اِتنی بڑی فتح، اتنا شاندار کارنامہ، اتنی وسیع مملکت کی تسخیر اور خونِ اِنسانی کا اتنا کم زیاں۔ کسی معرکہ میں شکست نہیں، کہیں پسپائی نہیں، کہیں کوتاہی

نہیں، ہر جگہ پیش قدمی، ہر جگہ کامیابی، مزید برآں دشمن کے مقابلے میں جمعیت ہمیشہ کمترین اور وسائل و اسباب ہمیشہ قلیل ترین - پھر فتحمندیوں کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا، حیاتِ مبارک ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ آگے بڑھتا ہے اور آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی جاری رہتا ہے - آپؐ کے جاں نثار، آپؐ کے تربیت یافتہ اور آپؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ان میں برابر اضافہ کرتے رہے حتیٰ کہ اسلامی اقتدار ایشیا، یورپ اور افریقہ کے کتنے ہی ملکوں میں پھیل جاتا ہے ؛

کیا دنیا میں اور بھی کوئی انسان گذرا ہے جس نے اتنی تھوڑی مدت میں ابد الآباد تک زندہ و پایندہ رہنے والا کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہو - کوئی سپہ سالار، کوئی فاتح، کوئی سیاست دان، کوئی مدبر، کوئی مصلح مدت العمر کی سعی و کاوش کا کوئی نتیجہ اس کے عشرِ عشیر بھی پیش کر سکتا ہے ؟

فاتح بننے، جنگیں لڑانے تدبیر و سیاست سے کام لینے اور "شاندار" کامیابیاں حاصل کر کے شہرت و ناموری کے آسمان پر چمکنے کی یقیناً بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں - تاریخ ان کے ناموں اور کارناموں کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے، قومیں انہیں پوج رہی ہیں، انہیں عظیم و اعظم کہہ کر پکار رہی ہیں - لیکن کیا ان کے کارناموں کو آنحضرت صلعم کے کارناموں سے کوئی نسبت دی جا سکتی ہے - کیا دنیا کے کسی نامور سے نامور اور مشہور سے مشہور جرنیل، فاتح اور مدبر کی زندگی میں اس قدر کامیابی کی کوئی مثال ملتی ہے، جو آنحضرتؐ نے حاصل کی - تاریخ کا سرمایہ کیا ہے، آسمانِ شہرت کے آفتاب و مہتاب کون کون سی ہستیاں ہیں، لوگوں کی گردنیں کن کے احترام میں جھک رہی ہیں، کن کی شخصیتوں کا تصور انہیں غرقِ حیرت کر رہا ہے، سورمائی و دانائی کا معیار کیا ہے، عظمت و جلالت کا پیمانہ کونسا ہے ؟ آپ کسے بڑا کہتے اور سمجھتے ہیں، کس کی تقلید کی کوشش کی جاتی ہے، کس کو نمونۂ عمل بنایا جاتا ہے، کن کے تذکروں سے عزم و حوصلہ کو مہمیز دی جاتی ہے، اعلیٰ و ارفع سے متوسط و ادنیٰ تک اور با اختیار سے مجبور و بے اختیار تک کس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے ہیں، کس کی راہ پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، کس سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں ؟ انتخاب میں فرق ہو سکتا ہے مگر معیار میں نہیں ہو سکتا۔

بطورِ مثال چند شخصیتیں یہ ہیں۔ سکندرِ اعظم، نپولین اور ہٹلر وغیرہ۔ اگر آپ چاہیں تو تعداد میں اضافہ کر لیجئے، حسبِ پسند درخشاں سے درخشاں اور تابناک سے تابناک مثال لے لیجئے، مگر شہرت، عظمت اور کامیابی و فتح مندی کی چمک دمک کے نیچے کیا ہے، واقعات کیا کہتے ہیں، تاریخ کی شہادت کیا ہے، کن کو مشعلِ راہ سمجھا جا رہا ہے۔ اقوام و افراد کن کے پیچھے چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، وقت، محنت اور سرمایہ کن کی تقلید پر صرف کیا جا رہا ہے؟ اُن کی جو ناکام و نامراد رہے، جو اپنے محدود دائرہ میں بھی کوئی زندہ و پائندہ کارنامہ انجام نہ دے سکے، جو ملکوں اور قوموں کی بربادی کا باعث بنے اور انجام کار خود بھی تباہ و برباد ہو گئے۔ فکر و نظر کا یہ راستہ بظاہر نیا اور نامانوس نظر آتا ہے۔ لیکن اگر تفکر و تامّل سے کام لیا جائے تو اس میں نہ کوئی نیا پن ہے نہ اجنبیّت، نہ اس سے تعنّت و عیب چینی مقصود ہے نہ تحقیر و تنقیص ؛

اگر کوئی بڑی جنگ لڑ لینا اور کوئی بڑی فتح حاصل کر لینا عظمت کی دلیل ہو سکتی ہے، جبر و تعدّی کے وسائل اختیار کر کے قوموں کو مغلوب کر لینا بڑائی کی وجہ بن سکتی ہے اور اقتدار و فرمانروائی کے بل بوتے پر کسی گروہ انسانی سے حسبِ منشا کام لینے کو کارنامۂ کامیابی قرار دیا جا سکتا ہے تو اس میں ان چند ہی افراد کی کیا تخصیص ہے، انہی کے سر پر جلالت کا تاج کیوں رکھا جائے، انہی کو عظمت کا مدار کیوں کہا جائے اور بھی سینکڑوں ہزاروں ہمسری کے دعویدار ہیں، سکندر وغیرہ کی عظمت میں ایک قزاق کو کیوں نہ شریک کیا جائے، فرق صرف کمیّت ہی کا ہے۔ کیفیت میں تو دونوں برابر ہیں ؛

لیکن اگر عظمت و جلالت انسانی سُود و بہبود اور فلاح و نجاح کے پیمانے سے ناپی جاتی ہے، فتح و کامیابی نتائج کے معیار پر پرکھی جاتی ہے، امورِ مہمات کی حیثیت ان کے مؤثرات سے متعیّن ہوتی ہے، ذاتی اعتلا و استکبار کی بجائے منفعت عام کو صلاح و صواب سمجھا جاتا ہے، اعمال کی وقعت نیّت و مقصد سے وابستہ کی جاتی ہے اور قلّتِ وسائل کے باوجود ارادہ کا خلوص، مقصد کی لگن، طریقۂ کار کی افضلیت اور شخصی اوصاف کا علوّ کوئی معنی رکھتا ہے تو علم و بصیرت اور اذعان و یقین کی پوری قوّت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے علاوہ دُنیا میں کوئی بڑا، کوئی کامیاب، کوئی قابلِ ستائش اور کوئی لائقِ تقلید نہیں ہُوا ہے ؛

بلاشبہ محدود دائرے میں شخصی کردار کی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور یہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمیشہ اخلاق و اعمال کے امتیازی اوصاف قرار پاتی چلی آئی ہیں اور انہی میں متذکرۃ الصدر شخصیتوں کے قابلِ وقعت اور نمایاں پہلوؤں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ عظمتِ مطلق کے سزاوار بن گئے۔ اور ذرّے آفتاب کے برابر ہو گئے۔ ایسا سمجھنا نہ صرف عقل کی توہین اور نفس کو دھوکہ دینا ہے بلکہ حقیقتوں سے رُوگردانی کر کے گمراہی مول لینا ہے ؎

بہرحال رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے ابتدائی زمانے کی مشکلات کو دیکھئے، مخالفتوں، عداوتوں، گمراہیوں، کج فہمیوں، غلط نمائیوں کو سامنے رکھئے انفرادی و اجتماعی زندگی کی بد اطواریوں، بدعہدیوں اور بدکیشیوں کو خاطر میں لائیے، پھر مادّی اسباب و وسائل سے تہی دامنی و بے مائیگی کا تصوّر کیجئے۔ ایک طرف ظلم و عدوان ہے، بے مہری ہے، ضد و تعصب ہے، جہالت و بے بصری ہے، دوسری طرف تنہائی و بے سروسامانی کے باوجود عزم و استقلال، ضبط و خود اعتمادی اور صبر و استقامت۔ مقابلہ چند افراد سے نہیں پوری قوم سے ہے، صرف بیگانوں سے نہیں اپنوں سے بھی ہے اور یہ سب کس لئے صدیوں کے عقائد، صدیوں کے تصوّرات، صدیوں کے عادات و اطوار، صدیوں کے رسوم و رواج غرض صدیوں کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی زندگی کے پورے استحالہ کے لئے جو ظاہری بھی ہو باطنی بھی، صُوری بھی ہو معنوی بھی اور عزم و یقین کی پوری قوت کے ساتھ۔ اس میں کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی، کوئی رعایت نہیں کی جا سکتی، کوئی لالچ درمیان میں نہیں آسکتا، کوئی صعوبت حائل نہیں ہو سکتی ؎

پھر جب صبر و برداشت کی حد ہو جاتی ہے تو آپؐ طریقۂ کار بدلتے ہیں، دفاعی منصوبہ تیار فرماتے ہیں اور اسے روبہ عمل لانے کے لئے مکّے سے ہجرت فرما کر مدینے تشریف لے جاتے ہیں۔ گویا جس مقصد کے لئے مکّے میں زہرہ گداز مظالم سہے تھے اب اسی کے لئے دفاعی سیاست اور حربی تدبیروں کو اختیار فرماتے ہیں اور ایسے عالم میں فرماتے ہیں جب نہ زر و مال ہے، نہ لاؤ لشکر، نہ اقتدارِ حکومت ہے نہ مادّی وسائل کی کوئی صورت۔ مکّے سے خالی ہاتھ ایک رفیق و جاں نثار کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں، دشمن تعاقب میں ہیں، جان لینے کی ترکیبیں کی جا رہی ہیں لیکن آپؐ کے ذہن

میں دفاعی منصوبہ ہے۔ نہ ہراس ہے، نہ تذبذب، پریشانی ہے نہ مایوسی۔ عرفِ عام میں اسے ہجرت یا انتقالِ وطن کہتے ہیں جس سے مجبوری و بے چارگی کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جسے مخالفین نے فرار (Flight) کا نام دیا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ محض مستقرِ اور لائحہ عمل کی تبدیلی ہے اور اس کی یہی وہ اہمیت و معنویت ہے جس کی بنا پر ہمارے اسلاف نے اس سے اسلامی سنہ کا آغاز کیا ورنہ مسلمان جیسی اولوالعزم و شعور مند ملّت تو کجا دُنیا کی کسی پست سے پست حوصلہ قوم نے بھی کبھی ہزیمت و فرار کے کسی واقعہ کو یادگار نہیں بنایا۔ انسانی نفسیات میں سرے سے اس کے تصور کی گنجائش ہی نہیں ؛

اب ان لوگوں کو دیکھئے جن کے فرقدان پر بڑائی کا تاج رکھا گیا اور ناکام و نامراد رہنے کے باوجود عظمت مآب سمجھے جاتے ہیں۔ سکندر کو لیجئے۔ اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مقدونیہ سے اُٹھ کر ہندوستان تک بیسیوں مُلکوں کو تہ و بالا کر کے فتح کیا۔ اور اپنی عسکری طاقت کا سکّہ بٹھا کر قوموں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک محکوم بناتا چلا گیا۔ لیکن یاد رکھئے وہ اپنے باپ شاہ فیلقوس کا بیٹا اور اپنے ملک کا بادشاہ تھا، حکومت کا، مُلک کے خزانوں کا، سامانِ حرب و ضرب کا اور فوجوں کا مالک تھا۔ وہ لشکر لے کر روانہ ہُوا اور عزم و حوصلہ کی فائق تر قوت کی بنا پر مُلکوں کو زیر و زبر کرتا چلا گیا مگر حقیقی عظمت و ہوش مندی اور مآل اندیشی کا عالم کیا تھا، یہ کہ پنجاب پہنچ کر فوج نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو واپسی کے بغیر چارہ نہ رہا اور جب موت کا پیغام پہنچا، تو سلطنت و اقتدار کا شیرازہ بکھر گیا۔ نہ وہ وسعت رہی نہ طاقت، ساری فتوحات نقش بر آب بن کر رہ گئیں ؛

نپولین عسکری قابلیت اور فتوحات کی وسعت کے اعتبار سے منفرد سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سپہ سالار کی حیثیت سے کسی زمانے میں وہ قابل ترین جرنیل تھا، واقعات و حالات پر صحیح نظر رکھتا تھا، عملی ذہانت اور اعلیٰ درجے کی قوتِ فکر کا مالک تھا، انتہائی چُستی و مستعد اور موقعہ شناس تھا، جرأت و تہوّر کی صفات سے متصف تھا اور انہی سب چیزوں نے مل کر اسے بڑا جرنیل، اولوالعزم فاتح اور دفاعی ماہر بنا دیا تھا مگر یہ صرف اس کے ذاتی اعتماد اور اس کے عظیم الشان سپہ سالار بننے میں معین ہوئیں پھر جُوں جُوں کامیابیوں سے ہم کنار ہوتا گیا غرور

و پندار کا شکار ہوتا چلا گیا، اس کی قوت متخیلہ فریبِ نفس کا ذریعہ بن گئی، فرعونیت، سوجھ بوجھ اور مآل اندیشی اس پر غالب آ گئی، وہ کسی چیز کو اپنی دسترس سے باہر نہ سمجھتا، واقعات کو حسبِ منشاء دیکھنا چاہتا اور اگر حسبِ منشا نہ ہو سکتے تو ان کے وجود سے انکار کر دیتا، وہ اپنے زمانے کے ماحول کی پیداوار تھا۔ جس وقت وہ پیدا ہوا اس وقت اس کا پیدا ہونا لازمی تھا، فرانس کی تاریخ اس کی شاہد ہے، لیکن جب وہ نپولین بن چکا تو جابر و مستبد اور مغرور و زود اشتعال شہنشاہ بن گیا، جبر و استبداد اور انا و استکبار اس کی شخصیت کی توام خصوصیتیں ہو گئیں اور جب زوال ہوا تو اس کے ساتھ اسکی سلطنت اور فرانس بھی زوال میں آ گیا۔ اس کی کامیابیاں، اس کی فتوحات اور اس کی عسکری مہارت صرف شخصی ترقی اور ذاتی شہرت کا سبب بنیں اور وہ بھی ایک حد اور ایک مدت تک۔ اس کے بعد زوال، ناکامی، شکست، قید و بند اور یاس و حسرت کی موت ——————!

اب ہٹلر کو دیکھئے۔ وہ بھی اپنے ماحول کی پیداوار تھا۔ جرمن فوج اور جرمن عوام پہلی جنگِ عظیم کی شکست اور اتحادیوں کی سختیوں سے جلے بھنے بیٹھے تھے، عوام فرانسیسیوں کے جبر و جور کا مزہ چکھ چکے تھے، فوج جو میدانِ جنگ میں شہرت حاصل کر چکی تھی ۱۹۱۸ء کے صلح نامہ کے وقت سے جب فرانس کے تقریباً ایک تہائی حصے پر قابض تھی انتقام انتقام پکار رہی تھی۔ جرمن جرنیل ۱۹۱۸ء ہی سے خفیہ جنگی تیاریوں میں معروف تھے گویا ہٹلر کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے مواد کافی تیار تھا۔ ملک میں آزمودہ کار سپاہی، تجربہ کار سالار، حرب و ضرب کے سامان غرض جنگ کی مکمل و مرتب مشین موجود تھی۔ اور نہ صرف یہ مشین موجود تھی بلکہ قوم کی مالی۔ تجارتی و صنعتی حالت بہت اچھی تھی اور جملہ وسائل پوری افراط سے موجود تھے۔ مشین کو صرف حرکت میں لانا باقی تھا اور یہ کام بلاشبہ ہٹلر نے اپنے ذمے لیا۔ اس نے اپنا منصوبہ بنایا اور سارے وسائل سے کام لے کر اس پر عمل کیا مگر انجام کی خوبی سے یکسر محروم رہا اور ناکامی اور ناامیدی کے عالم میں خودکشی کر کے دنیا سے رخصت ہوا۔

اس صراحت کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ سکندر، نپولین اور ہٹلر کے ساتھ ان کے ملک تھے۔ ان کے شخصی عروج میں ان کے اہلِ ملک کا ملک کے

اسباب و وسائل کا اور حکومتوں کی طاقت کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اہلِ مقدونیہ فاتحِ عالم بننا چاہتے تھے لہٰذا وہ سکندر کی اولوالعزمانہ قیادت میں اُٹھ کھڑے ہوئے، اہلِ فرانس نام آوری و فتحمندی کے خواہش مند تھے اور ان قوموں سے انتقام لینا چاہتے تھے جنہوں نے انہیں معاشی و معاشرتی پستی میں دھکیل دیا تھا۔ لہٰذا جب نپولین نے عسکری قائد کی حیثیت سے انہیں عظمت و اقتدار کا یقین دلایا تو وہ اس کے پیچھے ہو گئے۔ اسی طرح ہٹلر کی پُشت پر اس کی پوری قوم اور قوم کے تمام وسائل تھے۔ مگر آنحضرت صلعم کے ساتھ کون تھا، آپؐ کے وسائل اور اختیار و اقتدار کا کیا عالم تھا، یہ کہ جب ہمہ جہتی انقلاب کی مہم کا آغاز فرمایا اور تبلیغ و تلقین کے مقابلے میں کفار اور مشرکین کے ظلم و عُدوان سے مجبور ہو کر دفاعی منصوبہ تیار کیا تو کفار کا بچہ بچہ مخالف، ہر کہ ومہ دشمن، نہ کوئی وسیلہ نہ سہارا، بالکل تہی مایہ و بے اثاثہ، فاقوں پہ نوبت اور بے سروسامانی کی کُلفت مگر فکر و نظر اور ہمت و حوصلہ بلند۔ اہلِ مکّہ عرصۂ حیات تنگ کرتے ہیں، عافیت کے درپے ہیں، صعوبتوں پر صعوبتیں دے رہے ہیں، جان لینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ مجبوراً آپؐ مکّے کو چھوڑ کر یثرب یا مدینے کو مُستقر بناتے ہیں تاکہ جو کام مکّے میں رہ کر نہیں ہو سکتا اس کو وہاں سے پورا کیا جائے اور نہ صرف پُورا کیا جائے بلکہ اہلِ مکّہ کو مفتوح اور مکّے کو شرک و بُت پرستی کی نجاستوں سے پاک کر کے اسلام کا ارضی مرکز بنایا جائے +

اب منصوبۂ دفاع کے ابتدا سے انتہا تک ہر ہر جزو اور ہر ہر پہلو پر غور کیجئے۔ پہلے یثرب کے انتخاب پر نظر کیجئے۔ یثرب حجاز کا مرکزی مقام ہے، آب و ہوا اور پیداوار بہترین ہے۔ پانی افراط سے ہے، پہاڑوں سے گھرا ہُوا اور محفوظ ہے۔ اس کی دفاعی اہمیت کو خاطر میں لانے کے لئے یہاں سے مکّے تک نصف قطر کا دائرہ کھینچئے اور دیکھئے کہ اس کے اندر دفاعی کارروائی کی اہمیت کیا قرار پاتی ہے۔ کوئی لائق و فائق سپہ سالار اسے دفاعی مرکز بنا کر اعلیٰ درجہ کے منصوبے کو جامۂ عمل پہناتا ہے تو وہ کتنا کامیاب ہو سکتا ہے اور اپنے مخالفین کی متحدہ قوت کے مقابلے میں اس کی پوزیشن کتنی بہتر و برتر رہتی ہے۔ دفاعی سیاست میں یہ ایک اہم ترین چال ہے جسے نپولین کے الفاظ میں اندرونی مورچہ یا (Interior Lines)

کہتے ہیں ۔

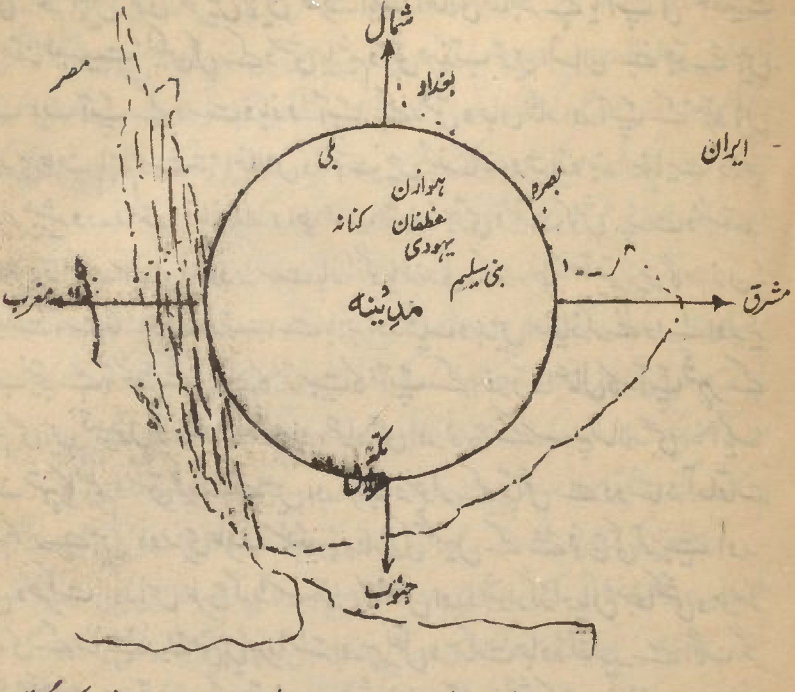

اس دائرہ کے اندر اور اس کے اردگرد مختلف عرب قبائل ہیں جو اپنی روش کے مختار ہیں ۔ جب آپؐ مدینے تشریف لاتے ہیں تو مدینہ بجائے شہر کے مجموعۂ دیہات اور متخاصم متصادم قبائل کا مسکن ہے ۔ نظم و اتحاد عنقا ہے ۔ ان میں خاندانی اختلافات بھی ہیں اور معاشرتی بھی، مذہبی بھی ہیں اور نظریاتی بھی، معیشتی بھی ہیں اور اقتصادی بھی ۔ آپؐ تشریف لاتے ہی سارے جھگڑے طے کراتے ہیں ۔ عناد و عداوت کی جگہ رفق و خلوص، افتراق کی جگہ اتحاد قائم کرتے ہیں اور فتنہ و فساد کی آماجگاہ یثرب مدینۃ النبیؐ بن جاتا ہے، اس کے حدود حرم قرار پاتے ہیں، اہل شہر کے حقوق و فرائض متعین ہوتے ہیں، پوری شہری زندگی ایک باوقار سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور یہ مختصر سی شہری ریاست اسلام اور مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ بن جاتی ہے جس کے بعد آنحضرتؐ اسے دفاعی منصوبے کی تکمیل کا مرکز بناتے ہیں ۔ رضاکاروں کی فوج تیار ہوتی ہے، ایسے رضاکاروں کی جنہیں نہ تنخواہ ملتی ہے، نہ راشن اور کپڑے، نہ ہتھیار اور سواری ملتی ہے، نہ کوئی

ذریعۂ بار برداری - مگر نظم و ضبط، فرمانبرداری و فداکاری میں بے مثل - کوئی جبر نہیں - کوئی تحکم نہیں، کوئی تحریص نہیں، صرف ایک اخلاقی ضابطہ ہے یا آپؐ کی شخصیت کی مقناطیسیت، لیکن کل کے وحشی یا نیم وحشی مہذب ترین انسان بنے ہوئے ہیں۔ ایک طرف آپؐ کے دست و بازو، آپؐ کے رفیق و جاں نثار اور آپؐ کے معتمد ہیں، دوسری طرف باہم رشتۂ اخلاص و اخوت میں منسلک و شیرازہ بند، نہایت درجہ ایثار پیشہ و دردمند، فرمانبردار و اطاعت شعار، جری و سخت کوش، چست و مستعد، صابر و قانع اور ایمان دار و راست باز، گویا زندگی کے صراطِ مستقیم پر گام زن؛ حقیقت آشنا، خوب و زشت سے باخبر اور نیک و بد میں امتیاز کرنے والے اور یہ سب نتیجہ ہے آنحضرتؐ کی تعلیم کا، تربیت کا، آپؐ کے اخلاق و اعمال کا۔ آپؐ شہر کے حاکم بھی ہیں، قبیلوں کا رشتۂ انضمام و اتحاد بھی اور فوج کے سپہ سالار بھی - ایک طرف شہر کا نظم و نسق فرما رہے ہیں اور قرب و جوار کے قبائل سے دوستانہ تعلقات قائم کر رہے ہیں، دوسری طرف منصوبۂ دفاع کی تکمیل کے لئے فوج کی تربیت اور نقل و حرکت، اور اس طرح کہ راستوں کا فصل اور دشوار گذاریاں، جفاکشی و حوصلہ مندی کے سامنے بے معنی ہیں؛ ہر راستہ اور ہر نقل و حرکت جادۂ تقلید سے الگ مگر منزلِ مقصود سے قریب بلکہ اقرب اور پیش بینی و مآل اندیشی کی معجز نمائی سے واضح گویا ؎

از آں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتست

جہاں دوسروں کے وہم و گمان کا گذر بھی مشکل ہے وہاں لشکرِ اسلام برق رفتاری سے فاصلے طے کرتا ہے - دشمن سراسیمہ ہوتے ہیں، نہ آنحضرتؐ سے پروانۂ راہ داری لینے کی عار گوارا ہے، نہ تجارتی قافلوں کا نقصان؛ لہٰذا وہ راستہ بدلتے ہیں، مگر آنحضرتؐ اور آپؐ کے جاں نثاروں کا خوف پھر بھی دامنگیر رہتا ہے بالخصوص اس وجہ سے کہ آنحضرتؐ کی فرستادہ مہم مکے کے بالکل قریب ان کے تجارتی قافلے سے تعرض کر چکی ہے - آنحضرتؐ مختلف مقامات کو مختلف اصحاب پر مشتمل خفیہ مہمیں روانہ فرماتے ہیں، اور یہ سب نتائج کی کامیابی کا مژدہ لے کر آتی

ہیں۔ علاقوں کے طبعی و مقامی حالات ان کے مشن میں بالکل حارج نہیں ہوتے، فاصلوں کی طوالت یا بے سروسامانی ادنیٰ درجے میں بھی سدِ راہ نہیں ہوتی۔ دشمن کے کسی جاسوس اور مخبر کو ٹھکانے لگانا ہو یا اس کے کسی تجارتی قافلے سے تعرض کرنا، چند افراد راتوں کی تاریکی میں سینکڑوں میل کا سفر کر کے جائیں گے اور فرمانِ نبویؐ کے ایک ایک لفظ پر پوری طرح عمل کر کے واپس آئیں گے۔

دو سال پہلے کے مقابلے میں اب حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ کفار و مشرکین سخت پریشان ہیں۔ کہاں نخوت و غرور اور ظلم آفرینیاں، طاقت کے مظاہرے، اور نشۂ دولت کی سرمستیاں، کہاں تجارت کو بچانے کی فکر، سلسلۂ معاش کے ختم ہو جانے کا دغدغہ اور آنحضرتؐ سے مات کھا جانے کا اندیشہ۔ لہٰذا وہ جنگ کا منصوبہ بناتے ہیں اور مدینے پر حملہ کر کے داعیٔ اسلام اور پیروانِ اسلام کو ختم کرنے کی تیاری کرتے ہیں۔

قریش کی تیاریوں کا مدار و محور زر و مال کی بہتات، افرادِ انسانی کی کثرت، ظلم و طغیان اور غلط نمائی کے حربے ہیں اور ادھر صرف دفاعی تربیت جس میں سادگی، محنت، نیتوں کا خلوص، للّٰہیت، فداکاری اور حُسنِ انجام کی آرزو، محرکِ اساسی آنحضرتؐ کی ہدایت ہے کہ جنگ میں پیش قدمی نہ کرو، کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، لہٰذا وہ فاقے کرتے ہیں، پیاسے رہتے ہیں، صعوبتیں اُٹھاتے ہیں مگر کسی پر زیادتی نہیں کرتے، دست درازی نہیں کرتے، کسی کا مال نہیں چھینتے۔

بَدر۔

قریش کی ناکہ بندی، مکّے کے نواح میں مکّی قافلے کے لُٹ جانے اور سردارِ قافلہ کے ہلاک ہو جانے سے مسلمانوں کا خوف اتنا طاری ہو جاتا ہے کہ مکّے کے تمام کفار قریش کے ساتھ مل کر حربی منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جب شام سے اس تجارتی قافلے کی واپسی کا وقت آتا ہے جس کا سردار ابوسفیان ہے تو ان کی پریشانی دوچند ہو جاتی ہے۔ ابوسفیان قافلے کی حفاظت کے لئے قریش سے مدد طلب کرتا ہے جس پر سردارانِ مکّہ ابوجہل کی سالاری میں ایک ہزار سے زیادہ فوج اور کچھ قبائل بطورِ کمک لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے خفیہ نگار اور جاسوس دشمن کی تمام تیاریوں اور سارے منصوبوں سے باخبر رکھتے ہیں۔ آپ ابوسفیان

کے تجارتی قافلے کے گذرنے سے پہلے مع فوج روانہ ہوتے ہیں لیکن منزلِ مقصود ظاہر نہیں فرماتے، نقل و حرکت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ سفر رات کو فرماتے ہیں اور ایسا راستہ اختیار کرتے ہیں جس کے اختیار کئے جانے کا کسی کو تصور بھی نہیں ہوسکتا، انتہائی دشوار گذار اور پیچیدہ، اونٹوں کے گلوں کی گھنٹیاں اتروادی جاتی ہیں۔ جس سے لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ شاید ابوسفیان کے قافلے سے تعارض ہوگا، لیکن میدانِ بدر میں پہنچ جانے کے باوجود آپؐ نے اس سے تعارض نہیں کیا، قریشِ مکہ کی مدد پہنچنے سے پہلے ہی وہ راستہ بدل کر نکل جاتا ہے اور جب خطرے کی حد سے باہر ہوجاتا ہے تو قریش کے پاس پیغام بھیجتا ہے کہ اب فوجی امداد کی ضرورت نہیں، قافلہ خطرے کی زد سے آگے نکل آیا ہے اور مکے کیطرف بڑھ رہا ہے۔ اس اثناء میں قریش کا لشکر بدر کے قریب پہنچتا ہے۔ آنحضرتؐ کو اس کی تعداد کا، اس کے سازوسامان کا اور اس کے موقعِ قیام کا صحیح صحیح علم ہوجاتا ہے پھر یہ بھی علم ہوجاتا ہے کہ کچھ قبائل جو تجارتی قافلے کی حفاظت کے خیال سے قریش کی مدد کے لئے آئے تھے قافلے کی بعافیت واپسی کے بعد اپنے علاقوں کو روانہ ہوگئے ہیں۔ دشمن کے لئے رسد و خوراک اور پانی کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے، ابوجہل جو لڑائی پر تلا ہوا تھا اب یہ طے کرتا ہے کہ بدر کے میلے کا لطف اٹھایا جائے اور کچھ دن قیام کرنے کے بعد واپسی کا قصد کیا جائے۔ اسے آنحضرتؐ کی دفاعی سیاست اور حربی چال کا کوئی علم نہیں، وہ آنحضرتؐ کے دفاعی جال میں پھنس جاتا ہے۔ اور جب ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں خشک دلدل ہے اور گرمی کی شدت کی وجہ سے ہر جاندار کا برا حال ہے۔ آنحضرتؐ سلسلۂ آب بند کر دیتے ہیں۔ اس طرح لشکرِ قریش کو آنحضرتؐ کے انتخاب کئے ہوئے میدان میں آپؐ کے سوچے سمجھے نقشۂ جنگ کے مطابق جنگ کرنی پڑتی ہے اور اس طرح تین سو تیرہ نفوس کے مقابلے میں ایک ہزار کا لشکر شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔ قریش کے سرداروں نے سمجھ لیا تھا کہ میدانِ بدر میں تین طرف ریتلی دلدل ہے اس لئے وہاں سے حملہ نہیں ہوسکتا، رسالہ بالکل بے کار ہے۔ اس کے برعکس آنحضرتؐ نے جس جگہ مورچہ بندی کی اس کی پشت پر پہاڑ ہے مگر انہیں اپنی پیادہ فوج پر ناز تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا خاتمہ کرنا معمولی بات ہے،

فتح قطعی طور پر یقینی ہے، اس لئے اگر میدانِ جنگ کے مقامی حالات ناموافق ہیں، پانی بند ہے اور آنحضرتؐ کا مورچہ عمدہ جگہ پر ہے تو کوئی حرج نہیں مسلمانوں کے ختم ہوتے ہی سارے حالات ہمارے موافق ہوجائیں گے۔ مگر یہ توقعات بالکل غلط ثابت ہوتی ہیں۔ کئی سوار پانی کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو مسلم تیراندازوں کے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں، واپس جاتے ہیں، مبارزت طلبی ہوتی ہے، دست بدست انفرادی مقابلے کی نوبت آتی ہے جب اس میں بھی شکست ہوتی ہے اور حضرت علیؓ و حضرت حمزہؓ کئی نامورانِ قریش کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں تو وہ ایک دم ہلہ بول دیتے ہیں اور حرب و ضرب کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر خود اپنی تباہی مول لیتے ہیں۔ کیونکہ آنحضرتؐ ایسے مورچے پر ہیں جس کے سامنے ریتلی دلدل ہے، گرمی اور تشنگی کی وجہ سے قریش کے آگے بڑھنے کی رفتار سست ہے۔ پہلے وہ مسلم تیراندازوں کا نشانہ بنتے ہیں، اس کے بعد جب تکان و تشنگی سے بیدم ہوجاتے ہیں تو تازہ دم مسلم فوج سے مقابلہ ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ پیروانِ اسلام ہی سے نہیں ہے عناصرِ قدرت بھی مقابلے پر صف آرا ہیں۔ آنحضرتؐ مٹھی بھر خاک اُڑا کر طوفان کے آنے کا اندازہ فرما لیتے ہیں اور جب یہ طوفان آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اپنے نامور بہادروں کے دستے کو حملے کا حکم دے دیتے ہیں، دشمن پہلے ہی بدحواس ہے، اس کے حوصلے پست ہو رہے ہیں۔ اب وہ بالکل ہمّت ہار دیتا ہے اور اپنے کُشتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

میدان آنحضرتؐ کے ہاتھ رہتا ہے۔ مسلمان مالِ غنیمت لے کر مدینے واپس آتے ہیں۔ مگر یہ فتح قطعی و آخری نہیں ہے۔ سکون و تعطّل فقدانِ زندگی کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا فوجی تربیت اور نقل و حرکت کا سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے۔ جس طرح چھوٹی بڑی مہمات پہلے روانہ فرمائی جاتی تھیں اب بھی فرمائی جا رہی ہیں اور کبھی کبھی آنحضرت صلعم بہ نفسِ نفیس ان کی سربراہی کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔

اُحد۔

غزوۂ بدر نے قریش کے غرور پر سخت ضرب لگائی ہے، بڑے بڑے سردار کام آ چکے ہیں۔ اسیرانِ بدر کو چھڑانے کے لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک بڑی رقم پیش

کرنی پڑی، وہ اپنے زخموں کو زخمی بھیڑیے کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ شکست کی ذلت کا احساس اس درجہ ہے کہ مقتولینِ جنگ کا سوگ منانے کی بھی ممانعت ہے۔ مگر دولت و طاقت کا نشہ ابھی اُترا نہیں، جذبۂ انتقام کی شدّت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ جنگ کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ مذہب و تہذیب کو بچانے اور معیشت و معاشرت کو محفوظ رکھنے کے نام پر قبائلِ عرب کو بھڑکایا جا رہا ہے، روپیہ، پیسہ ہتھیار اور فوج جمع ہو رہی ہے، مکّے کے باہر کیمپ کھُل گیا ہے، بڑے بڑے نامور اور آزمُودہ کار سُورما متحدہ لشکر میں شامل ہونے کے لئے آ رہے ہیں۔ نواحِ مدینہ کے یہُودی اس موقعے سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ آنحضرتؐ کے اثر و رسُوخ کے مخالف ہیں۔ مگر انہیں یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں تجارتی رقیب قریش محمدؐ کی مخالفت میں اتنے طاقتور نہ بن جائیں کہ ہمیں ہضم کر لیں لہٰذا وہ ان سے مِل تو جاتے ہیں اور مالی امداد سے بھی دریغ نہیں کرتے مگر اپنی طاقت کو بدستور قائم رکھتے ہیں تاکہ قریش اور بنو خزرج و بنو اوس وغیرہ (آنحضرتؐ کے معاونین) جب جنگ میں کٹ مریں تو ان پر اقتدار قائم کر کے کاروبارِ تجارت اور مدینے کے نخلستانوں پر قبضہ کر لیں اور شام کی بجائے حجاز کو مامن و مسکن بنا کر اطمینان سے زندگی بسر کریں۔

قریش کے پاس خالد جیسا لائق سالارِ رسالہ ہے۔ انہیں اس پر ناز ہے اور وہ جانتے ہیں کہ بدر میں آنحضرتؐ کے پاس صرف دو گھوڑے تھے، بدر کے بعد مالِ غنیمت کے گھوڑوں کو شامل کر کے یہ تعداد ۳۵ تک پہنچی تھی۔ اس لئے قریش نے دُوسری جنگ کے منصوبے میں رسالے کے استعمال کا خاص خیال رکھا تاکہ شہسواروں کے حملے سے مسلمانوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندا جائے۔ اس لئے طے کیا کہ اِس مرتبہ لڑائی مدینے کے شمالی میدان میں لڑی جائے۔

یہود کو قریش کی تیاریوں کا علم ہُوا تو انہوں نے سامانِ رسد مہیّا کرنے کا بھی وعدہ کیا اور اپنے دیار میں قیام کرنے کی دعوت دی۔ سال بھر کی تیاری کے بعد قریش کا لشکرِ عظیم مکّے سے روانہ ہو کر مدینے کے قریب دیارِ یہُود میں ٹھہرا اور رسد وغیرہ کا بندوبست کرنے کے بعد مدینے کی طرف کوچ کیا۔ مدینہ تین طرف سے مکانوں، آطاموں اور نخلستانوں سے گھرا ہُوا تھا، لہٰذا ان اطراف سے رسالے کی جنگ کا کوئی

موقعہ نہ تھا۔ البتہ شمال میں کئی میل طویل و عریض میدان تھا جہاں کی زمین نہ ریتلی تھی نہ پتھریلی البتہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ یہ میدان رسالے کی لڑائی کے لئے بہترین تھا۔

قریش کا خیال تھا کہ مدینے پر حملے کی وجہ سے آنحضرتؐ باہر نکل کر لڑیں گے اور بدر کی کامیابی کی وجہ سے اہلِ مدینہ پر اپنی طاقت کا اثر قائم کرنے کی کوشش کریں گے اور جب ایسا کریں گے تو ہمارے رسالے کا شکار بنیں گے۔ اگر آطاموں میں قلعہ بند ہوئے تو ہماری تین ہزار فوج کثرتِ تعداد کی بنا پر چند ہی روز میں ان کا خاتمہ کر دے گی۔ ان کے منصوبۂ جنگ میں اور کسی متبادل صورت کے تدارک کا تصوّر نہیں تھا۔ مگر آنحضرتؐ کو آپؐ کے خفیہ نگاروں نے دشمن کے ارادے اور نقل و حرکت سے پُوری طرح آگاہ کر دیا تھا لہٰذا آپؐ نے اس مرتبہ بھی دشمن کو تذبذب میں مُبتلا کر کے ایسی چال چلی کہ قریش کا منصُوبہ بے کار ہو گیا اور رات کی تاریکی میں دشوار گذار راستہ طے کر کے عینین کے مورچے پر قابض ہو گئے اور اس کارروائی میں ایسی رازداری اور چابکدستی سے کام لیا کہ منافقین کو بھی آپؐ کے مقاصد کا علم نہ ہو سکا۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی سلول منافق مایوس ہو کر لشکرِ اسلام سے اس وقت الگ ہُوا جب اس کی علیحدگی سے مسلمانوں کو نہ کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا اور نہ قریش کو کوئی فائدہ، کیونکہ وہ قریش کے پاس جا کر آنحضرتؐ کے منصوبے کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتا تھا اور جو خبریں اس نے انہیں پہنچائی تھیں وہ غلط تھیں۔

آنحضرتؐ کا منصُوبہ نہایت سادہ مگر کارگر تھا۔ آپؐ نے اپنے چند سواروں کو نہایت عمدگی سے استعمال کیا۔ مگر عین اس وقت جبکہ فتح آپؐ کے قدموں میں تھی مُسلم تیر اندازوں کی بے صبری اور خالد کی موقع شناسی نے لشکرِ اسلام کو مشکلات میں مبتلا کر دیا تاہم آنحضرتؐ نے ان پر قابو پایا اور پوری طرح پایا۔ جنگ کے اندر ایسے لمحات ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیتے ہیں اور ایسے ہی وقت سپہ سالار کی قابلیت کا امتحان ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اندازہ فرمایا کہ اس وقت صحیح طریق کار یہ ہے کہ لشکرِ اسلام کے مُنتشر شدہ آدمیوں کو ایسی جگہ مجتمع کیا جائے جہاں وہ دُشمن کے رسالے کے حملے سے قبل محفوظ ہو جائیں کہ دشمن کی پیادہ فوج جوابی حملہ کرے۔ چنانچہ آپؐ نے جبلِ اُحد

کی بلندی کی طرف صعود فرمایا اور وہاں مورچہ قائم کر کے انہیں خالد کے رسالے سے محفوظ کر لیا۔ اس نازک وقت میں آپؐ کے جان نثار صحابہؓ نے جان پہ کھیل کر دشمن کی مدافعت کی اور کئی جلیل القدر صحابہؓ جن میں حضرت حمزہؓ کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے دشمن پر جوابی حملوں میں شہید ہوئے۔ حضرت علیؓ نے درہ اُحد کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس دوران میں لشکرِ اسلام کے منتشر آدمی جمع ہونے شروع ہو گئے، پھر دشمن نے جو جوابی حملہ کیا ناکام رہا۔ اِدھر وہ جذبہ جاں نثاری تھا اور اُدھر آنحضرتؐ نے ذاتی تہوّر و شجاعت سے ثابت قدمی کا ایسا سبق دیا کہ دشمن کے قدم کہیں نہ رُک سکے، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر ناقابلِ تسخیر آہنی دیوار کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دشمن کے سالار ابوسفیان کو آنحضرتؐ کی دفاعی مہارت کا لوہا ماننا اور میدان چھوڑ کر مکّے کو بھاگنا پڑا۔ بدر کی جنگ میں اگر قریش کو آپؐ کی دفاعی فضیلت کے تسلیم کرنے میں کچھ شبہ تھا تو اب بالکل جاتا رہا۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو جنگی فتح ہی حاصل نہیں ہوئی بلکہ وہ اخلاقی فتح سے ہمکنار ہوئے اور یہ مسلّمہ اصول ہے کہ جس فریق کو دشمن پر اخلاقی فتح حاصل ہوتی ہے وہ ہزیمت خوردہ فوج میں احساسِ عجز و کمتری پیدا کر دیتا ہے اور اسے پھر تنہا مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں ہوتی بلکہ اُسے دوسروں کے سہارے اور مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لئے اخلاقی فتح کو مستقل و پائیدار فتح کہا جاتا ہے۔

چنانچہ اُحد کے بعد قریش نے استمداد کے لئے دریوزہ گری کی۔ انہوں نے دوسرے قبائل کے علاوہ یہود سے بھی مدد کی درخواست کی اور یہ بات تسلیم کر لی کہ وہ تنہا آنحضرتؐ کے مقابلے پر نہیں آ سکتے۔ حالانکہ وہ پہلے دو غزوات میں بھی تنہا نہیں تھے لیکن اب بزورِ طاقت کی بجائے اعترافِ عجز کیا جانے لگا اور کھلم کھلا یہ کہا جانے لگا کہ ہم تو دو دفعہ مُنہ کی کھا چکے اگر اب دوسرے قبائل اور یہود مدد کو نہ آئے تو وہ بھی کہیں کے نہ رہیں گے۔ اسلام کی وسعت اور آنحضرتؐ کی طاقت قابو سے باہر ہو چکی ہے۔

یہود بہ حیثیت مجموعی قریش کی پشت پر تھے مگر امداد کے سلسلے میں ان کا نظریہ دوسرا تھا، اگرچہ انہیں اسلام کی طاقت کا خوف تھا اور وہ مسلمانوں اور مشرکوں کی جنگ سے فائدہ اُٹھانے کے خواب دیکھ رہے تھے مگر ان میں بھی دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک گروہ تھا، جس کا آنحضرتؐ سے واسطہ اور تعلق تھا وہ آپؐ کے انصاف، عالی حوصلگی،

فراخدلی، قابلیت، اصابت رائے اور نیک نیتی سے متاثر تھا اور عقائد کو دیکھ کر یہ کہتا تھا کہ بہت ممکن ہے کہ محمدؐ خدا کے فرستادہ نبی ہوں دیکھتے دیکھتے مدینے کے حالات میں انقلاب، دشمن قبائل کی باہمی رفاقت و اتحاد، ضبط و نظم، امن و آشتی ایسی چیزیں نہ تھیں جو اثر کئے بغیر رہتیں۔ لہٰذا ان کی قدرتی خواہش یہ تھی کہ وحشی اوباش اور ناقابلِ اعتبار قبائل کے مقابلے میں جو مشرک اور بت پرست بھی ہیں آنحضرتؐ ہی سے تعلقات قائم رکھے جائیں۔ لیکن دوسرا گروہ کہتا تھا کہ ابھی اسلامی معاشرہ منظم و مستحکم نہیں ہے اس لئے اس کی بیخ کنی کی جاسکتی ہے۔ وہ یہود کی جفاکاریوں اور بدعہدیوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے قصوروں کا الزام بھی آنحضرتؐ ہی کو دیتے تھے۔ پھر انہیں خوف تھا کہ اگر محمدؐ نبیٔ برحق ہیں تو توراۃ کے مطابق وہ ان پر بھی غالب آئیں گے اور یہ بات ان کے نسلی و مذہبی تفوّق کے پندار کے خلاف تھی۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ ان سب باتوں کی وجہ سے مخالفین و معاندین کے ہاتھ مضبوط کر کے ابھی سے اپنا تحفّظ کرلیں۔

اس کے علاوہ ان کے سامنے معاشی و اقتصادی برتری کا بھی سوال تھا۔ یہودیوں نے بہترین زرعی اراضی اور اچھے اچھے نخلستان مخالف قبائل کو ایک دوسرے سے لڑا کر حاصل کئے تھے یا سُودی کاروبار سے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر محمدؐ جیسا لائق و فائق انسان ان کا مسلّمہ قائد بن گیا اور اس کی طاقت بڑھ گئی تو وہ ہمارے قبضے میں نہ رہ سکیں گے اور اگر اسے ابھی سے الگ کر دیا گیا تو قریش اور دوسرے قبائل کی موجودہ رفاقت کو جو پائیدار ہے آسانی سے ختم کر کے اپنی حیثیت برقرار رکھ سکیں گے۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ قریش کی مدد کی جائے اور جتنے قبائل کو محمدؐ کے خلاف ورغلایا جاسکتا ہے ورغلایا جائے۔ پھر اس فیصلے کو جامۂ عمل پہنانے کے دو طریقے اختیار کئے ایک ظاہری مخالفت کا دوسرا باطنی مخالفت کا۔ کچھ قبائل کو اس پر مامور کیا گیا کہ وہ اعلانیہ قریش اور ان کے حلیفوں کی مدد کریں اور کچھ کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ محمدؐ کی جماعت سے مل جائیں اور ان کے منصوبوں اور دفاعی چالوں سے ان کے مخالفوں کو باخبر رکھیں۔ ایسی صورت میں اگر محمدؐ ہی کامیاب رہے تو کم از کم ہماری سفارش کے لئے ایک جماعت تو ہوگی جو ان سے مراعات دلاسکے گی۔

گویا قریش کے ہمدرد قبائل مدینے کے قرب و جوار میں بھی موجود ہیں اور مذکورہ بالا خطوط پر دوہرا کھیل کھیل کر اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال اس طرح تائید و حمایت کے لمبے چوڑے جال بچھا کر قریش تیسری جنگ کی تیاری کرتے ہیں اور اس کو بہر طور فیصلہ کن بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کو خفیہ نگاروں کے ذریعے دشمن کی ساری کارروائیوں کا علم ہوتا رہتا ہے۔ آپؐ بھی دفاع کا بندوبست فرماتے ہیں۔ مگر دشمن کو اپنے دفاعی منصوبے سے بے خبر رکھتے ہیں۔ بدر اور اُحد میں آپؐ نے قریش کو اپنے منتخب کئے ہوئے میدان میں اپنے نقشۂ جنگ کے مطابق لڑنے پر مجبور کیا تھا اور اس سے ایسی چالیں چلوائی تھیں جن کا لازمی نتیجہ شکست و تباہی تھا۔ بدر میں وہ اپنا رسالہ استعمال نہ کر سکا اور جب اُحد میں کیا تو نہایت غلط طریقے پر لڑایا۔ اس نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنے میمنہ و میسرہ کو محفوظ تو کر لیا لیکن جب آنحضرتؐ کی فوج پر حملہ کا حکم دیا گیا تو یہ دستے آپس میں کوئی ربط قائم نہ رکھ سکے بلکہ جب ایک دستے کو مسلم رسالے نے آدبایا تو دوسرا تماشا دیکھتا رہا۔ نہ عکرمہ نے خالد کے دستے کی مدد کی اور نہ خالد نے عکرمہ کے دستے کی۔ یہی حال پیدل فوج کے دستوں کا رہا۔ اس صورت حال کی وجہ عکرمہ اور خالد کی رقابت سہی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ قریش کے حق میں نہایت مضر برآمد ہوا اور اس لئے برآمد ہوا کہ آنحضرتؐ نے قریش کے منصوبوں کو اُلٹ کر اپنی دفاعی سیاست کا معمول بنا لیا تھا؛

اس طرح دو دفعہ شکست کھانے کے بعد انہوں نے جب تیسری دفعہ حملے کی تیاری کی تو اس میں بھی عددی تفوّق اور مادی وسائل کی کثرت ہی کو فیصلہ کُن عنصر قرار دیا اور بہ خیالِ خویش اتنا بڑا لشکر جمع کر لیا کہ مسلمان مقابلے کی تاب نہ لا سکیں اور مدینے سے باہر نکل کر نہ لڑ سکیں بلکہ محصور ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ قلیل التعداد مسلمان کثیر التعداد لشکر کے نرغے میں پھنس کر ضرور ہتھیار ڈال دیں گے۔ اس کارروائی کی تکمیل کے لئے اُنہوں نے نہ صرف یہودیوں کو اپنا ہمدرد بنا لیا تھا بلکہ جو قبیلے آنحضرتؐ سے دوستی کا معاہدہ کر چکے تھے انہیں بھی اس کے فسخ و انقطاع پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ بنی قریظہ ان کے طرف دار بن گئے اور مسلمانوں سے دغا کر کے دشمن کے کیمپ میں چلے گئے

دوسرے لفظوں میں قریش نے مسلمانوں کو دفاعی منصوبے کے مطابق نقل و حرکت سے معذور کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ اسے آجکل انگریزی میں (Deny Him Elbow Room for Manoeuvre) کہتے ہیں ؛

مگر آنحضرتؐ اس مرتبہ بھی دشمن کو مغالطہ دینے اور گمراہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ آپؐ چند صحابہؓ کو ہمراہ لے کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر مدینے کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ سلمان فارسیؓ خندق کھود کر مورچہ بند ہونے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ آپؐ اسے پسند کرتے ہیں اور طبعی و مقامی حالات سے فائدہ اُٹھا کر وادیوں یا برساتی نالوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ وادیاں صرف کہیں کہیں قابلِ گذر ہوتی ہیں ورنہ عموماً ان کے کنارے بہت خطرناک ہوتے ہیں اور نہ نہایت گہری۔ اگر انہیں کھود کر اور چوڑا اور گہرا کر دیا جائے تو کوئی شخص ایک طرف سے دوسری طرف نہیں جا سکتا۔

آپؐ نے خندق کی داغ بیل ڈالی اور اس کا آغاز انہی وادیوں سے کیا جس سے مدینہ جنوب و مغرب کی طرف سے بہ آسانی محفوظ ہو گیا۔ شمال کی سمت میں کوئی بڑی وادی نہ تھی اس لئے آپؐ نے خندق کھودنے کا حکم دیا اور خود بھی اس میں حصہ لیا۔ یہ کام بھی جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ مدینے کے منافق اور پست ہمت لوگ اپنی بد باطنی کا ثبوت دیتے ہیں اور آپؐ کی دفاعی کارروائیوں کا مضحکہ اُڑانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں ہراس پیدا ہو۔ مگر آنحضرتؐ (Fighting on interior lines) کے اصول پر عمل پیرا ہیں اور اس کی عملی شکل یہ ہے :-

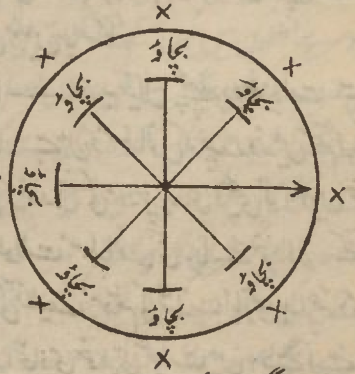

یعنی جب دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو تو اس کے خلاف اس طرح کارروائی

کی جائے کہ پہلے اس کے ایک حصے پر حملہ ہو اور ایسا ناگہانی و برق رفتار سے کہ اس کے دوسرے رفیقوں کو اس کا علم نہ ہو سکے تاکہ جب تک وہ اس کی مدد کو آئیں اس کو تباہ کر دیا جائے۔ اسی طرح پھر دوسروں پر حملہ کر کے انہیں ختم کیا جائے۔ گویا ایسی حالت میں بچاؤ کرنے والا اپنی تلوار سے باری باری سب کو ختم بھی کرتا جاتا ہے اور ڈھال سے باقی حملہ آوروں کو روکتا بھی جاتا ہے؛

غزوۂ خندق کا دفاعی دائرہ اگرچہ حدودِ شہر سے چھوٹا ہے تاہم دشمن آپؐ کے دفاعی منصوبے اور حربی چالوں سے بے خبر ہے۔ ایک طرف لشکرِ اسلام کی نقل و حرکت کیلئے کافی گنجائش ہے دوسری طرف دشمن کی فوج کے لئے پھیلاؤ بہت بڑا ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی تلوار ایک جگہ دشمن کو زخمی کر رہی ہو تو اس نقل و حرکت اور ڈھال کی مدد سے وہ خود دشمن کی ضرب سے محفوظ رہیں۔

چنانچہ غزوۂ خندق کے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک طرف ایک ہی وقت میں آنحضرتؐ کے رسالے کے سالار زبیرؓ دشمن کے کاروانِ رسد پر حملہ کر کے سے لوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف پیادہ فوج مختلف مقامات پر دشمن کے ان دستوں سے لڑ رہی ہے جو خندق کو پار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ آپؐ نے اپنی فوج چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر کے اسے کمزور نہیں کیا بلکہ اس کی بڑی تعداد کو ماتحت سالاروں کی کمان میں اس طرح متعین فرمایا کہ جس طرف بھی دشمن کا خطرہ ہو وہاں چند لمحات میں ایک مضبوط دستہ جوابی حملے کے لئے پہنچ جائے۔ چنانچہ جب ایک دفعہ دشمن کے جانباز شہسوار خندق کو پار کر کے اندر آ گئے تو ان میں سے ایک متنفس بھی واپس نہیں جا سکا؛

قریش کا خیال تھا —— اور یہ خیال پچھلے دو غزوات سے پہلے بھی تھا —— کہ ہم اتنا بڑا لشکر لے کر جا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو چند روز میں ختم کر کے واپس آجائیں گے لیکن مدینے کے قریب پہنچ کر خندق کی مورچہ بندی دیکھی تو انہیں سخت حیرت ہوئی۔ محاصرہ اتنا طویل ہوا کہ اس کی طوالت مسلمانوں کی بجائے خود ان کے لئے مصیبت بن گئی۔ خوراک، چارہ اور پانی کی تکلیف، موسم کی شدّت، باہمی بداعتمادی و افتراق، نتیجہ یہ کہ مصنوعی اتحاد کا شیرازہ بکھر گیا اور اتحادی خود ہی عجلت میں اپنے اپنے علاقوں کو بھاگ گئے۔

غزوۂ بدر نے جہاں کفار و مشرکین کے دلوں میں اپنے سپہ سالار کی نااہلیت کی وجہ سے بد اعتمادی پیدا کر دی تھی اور آنحضرتؐ کی جنگی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا اور اُحد نے میدانِ جنگ کی شکست کے علاوہ سارے قریش کو اخلاقی شکست دی تھی وہاں غزوۂ خندق نے قریش کے علاوہ ان کے تمام حلیفوں، ہمدردوں اور معاونوں کی کمزوریاں فاش کر دیں۔ اس کے بعد سارے قبائل خوف زدہ ہو کر بیٹھ گئے اور کئی قبیلوں نے مدینے آکر صلح کی درخواست کی اور امان پائی۔

دفاعی دائرہ۔

غزوۂ خندق کے بعد آپؐ نے مدینے کے باہر وسیع تر دائرہ کی طرف توجہ فرمائی اور انٹیریئر لائنز کے دفاعی اصول سے کام لے کر پہلے قریب ترین دشمن عناصر سے تحفظ فرمایا۔ اور بنی قریظہ کو ان کی دغابازی و غداری کی سزا دی۔ اس کے بعد اس دائرے کے اندر چاروں طرف مختلف مہمات روانہ فرمائیں۔ اگرچہ ان کے محرکات و مقاصد مختلف تھے لیکن ان میں سے ہر ایک اصل دفاعی منصوبہ یعنی منصوبۂ ہجرت کے ماتحت تھا۔ بعض مہمات جانباز دستوں کی تھیں، بعض جانباز دستوں کی۔ کہیں خفیہ نگار کام کر رہے تھے کہیں مخبر و جاسوس۔

صلح حدیبیہ۔

غزوۂ خندق کفر و اسلام یا قریش و آنحضرتؐ کے مابین فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس میں آپؐ کو قریش اور ان کے حوالی و موالی سب پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ صرف قریش، صرف اہلِ مکّہ اور صرف اتحادی قبائل ہی نہیں ہر غیر مسلم قبیلے کے پیروں تلے سے زمین کھسک چکی تھی، دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ کھیتی تیار ہو چکی تھی صرف کٹائی کی دیر تھی، اور کٹائی کی ضرورت ایسی جگہ سے تھی جہاں فصل زیادہ پک چکی تھی اور غفلت سے نقصان کا اندیشہ تھا۔ کشتِ حجاز کا یہ کنارہ جہاں سے کٹائی کی ضرورت تھی قریش تھے۔ لہٰذا آپؐ نے مکّے کا رُخ کیا اور امن و صلح کے پیغام کے ذریعے انہیں راہِ راست پر لانے کا قصد فرمایا مگر طریق کار نیا تھا۔ عمرہ کے لئے روانہ ہوئے اور اس کی تیاری وسیع پیمانے پر کی۔ ہمراہیوں کی تعداد کثیر، انتخاب میں احتیاط، قربانی کے اونٹوں کی فراہمی، مگر روانگی بصیغۂ راز اور راستہ حسبِ دستور نامانوس و دشوار گذار۔

قریش کو خبر ہوتی ہے تو اسے مکے پر قبضہ کرنے کا بہانہ سمجھتے ہیں، مدد کے لئے اِدھر اُدھر آدمی دوڑاتے ہیں مگر آس پاس کے چند قبائل کے علاوہ کوئی مدد کو نہیں آتا، وہ اپنے اپنے اندیشوں میں مُبتلا ہیں، اپنی عافیت کی خیر منا رہے ہیں، آنحضرتؐ کی دفاعی کارروائیاں لگامی نایند لگامی زنند کے مصداق ہوتی ہیں، کیا عجب ہے کہ نشانہ ہم ہی بننے والے ہوں، لہٰذا وہ جمع نہیں ہوتے، پھر قریش وہ ہیں جو بڑے دعوے کرتے تھے، بڑی تیاریاں کر کے جاتے تھے مگر ہمیشہ شکست کی ذلت اُٹھا کر آئے، ان پر کیسے بھروسہ کیا جائے جو غزوۂ خندق میں سب کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ مجبُور ہو کر قریش جو کچھ جمعیت فراہم ہو سکتی ہے کرتے ہیں اور قبائل کہتے ہیں تم آگے بڑھو اور مسلمانوں کو روکو۔

اب انہیں یہ فکر ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ کو کہاں روکا جائے۔ کس راستے آئیں گے کچھ سردارانِ قریش کہتے ہیں کہ بدر و اُحد کی طرح غسفان کے راستے سے آئیں گے کیونکہ محمدؐ کا اصول یہ ہے کہ جہاں حملہ کرتے ہیں وہاں کے حالات کا خود بھی اچھی طرح مشاہدہ کر لیتے ہیں اور اپنے سالاروں کو بھی کرا دیتے ہیں۔ بنی لحیان کے غزوہ کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے خلاف تعزیری کارروائی تو محض بہانہ تھا کیونکہ اگر تعزیر ہی مقصد ہوتا تو جب وہ لوگ مقابلے کی تاب نہ لا کر پہاڑوں میں چھپ گئے تھے تو وہ لوٹ مار یا تعاقب کرنے کی بجائے غران سے غسفان آئے اور کئی سواروں کو مکّے کے قریب تک بھیجا۔ یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ فوج لے کر پہلے ذی طویٰ میں قیام کرتے ہیں اور خالد بن ولید کو رسالہ دے کر کراع الغمیم روانہ کرتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ غسفان کے درّوں پر مورچہ بند ہو کر مسلمانوں کو اس وقت تک روکے رکھو جب تک پیدل فوج کمک کے لئے نہ پہنچ جائے۔ کعب بن لوی اور ان کے اتحادی قبائل حدیبیہ کے ذخائرِ آب پر خیمہ زن ہو گئے۔ گویا انہوں نے مکّے کے قریب ہی رہنا پسند کیا اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو انہیں قریش کی طاقت پر بھروسہ تھا نہ ان کی کامیابی کی امید تھی اور نہ وہ رضامندی کے ساتھ مقابلے کی نیت سے آئے تھے۔

قریش کی ان سرگرمیوں کا حال سُن کر آنحضرتؐ اپنے صحابہؓ سے فرماتے ہیں کہ قریش کو

کیا ہو گیا ہے، ان کے سر پر جنگ کا بھوت سوار ہے وہ بے سمجھ ہو گئے ہیں، اگر وہ میرے اور دوسرے عربوں کے درمیان سے ہٹ جائیں تو ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔ اگر دوسرے عربوں نے مجھے قتل کر دیا تو قریش کی آرزو پوری ہو جائے گی اور اگر اللہ نے مجھے غلبہ دیا تو وہ اسلام میں داخل ہو جائیں تاکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو اور اگر وہ یہ بھی منظور نہ کریں تو ان کو اختیار ہے ہم سے لڑنے کی طاقت اس وقت بھی ان میں ہو گی۔ آخر وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ بخدا میں اپنے دین کے لئے جس پر اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے ان سے لڑوں گا۔ پھر چاہے اللہ مجھے ان پر غلبہ دے یا میری جان جاتی رہے"۔

اس کے بعد آپؐ نے ایسی چال چلی جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ آپؐ نے کوچ کا رُخ بدل دیا اور عام راستہ کو چھوڑ کر نہایت دشوار گذار پہاڑی راستہ اختیار فرمایا اور قریش کی توقع کے بالکل خلاف مکے کے زیریں علاقے میں حدیبیہ کے اُتار پر ثنیتہ المرار پہنچ گئے۔ قریش کے رسالے نے دُور سے آپؐ کے فوجی قافلے کے غبار کو دیکھا تو فوراً اپنے لشکر کے پاس واپس گیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس وقت آنحضرتؐ اس پوزیشن میں تھے کہ بغیر کسی سخت مزاحمت کے مکے میں داخل ہو سکتے تھے کیونکہ قریش کا لشکر آپؐ سے کئی میل آگے تھا۔ مقابلے کا امکان تھا تو کعب بن لوی اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے تھا مگر وہ بھی دفاعی اصول سے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے البتہ داخلے کے بعد یہ اور دوسرے قریش ان پر حملہ کر سکتے تھے اور اس وقت مکّے کے گلی کوچوں اور اس کے قرب و جوار میں گھمسان کا رن پڑتا اور چونکہ دفاعی منصوبہ اور محاذ آرائی کے لحاظ سے مسلمانوں کو فوقیت حاصل تھی اس لئے مسلمانوں کو یقینی طور سے فتح ہوتی۔ مگر اس طرح قریش اور دوسرے قبائل میں نفرت و انتقام کی ایسی آگ بھڑکتی کہ بجھائے نہ بجھتی۔ صحابہؓ میں سے کئی حضرات نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھانے کا مشورہ دیا مگر آپؐ مکّے میں داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ حُدیبیہ کی وادی میں ثنیتہ المرار کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔

اس قسم کی دفاعی چال کو (Indirect Approach) کہتے ہیں اور جیسا کہ پچھلے کسی باب میں بتایا جا چکا ہے اسے شاذ ہی کسی جرنیل نے کامیابی سے استعمال

کیا ہے۔ آپؐ کو اس طریقِ کار کی کامیابی کا پورا یقین تھا اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب بدیل بن ورقا الخزاعی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر قریش اور ان کے اتحادیوں کی طاقت کو مبالغہ آرائی سے بیان کر کے لڑائی کے نتیجے سے ڈرانے لگا تو آپؐ نے فرمایا کہ اگرچہ آپ بازی ہار چکے ہیں تاہم صلح کی پیش قدمی میری طرف سے ہو رہی ہے۔ اِس مختصر جواب کا بدیل پر بہت اثر ہوا۔ اور وہ قریش اور دوسرے قبائل کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ صلح لڑائی سے بہر حال مفید ہے:

بدیل کے سمجھانے پر وہ صلح پر آمادہ تو ہو گئے مگر طاقت اور برتری کا پندار پھر بھی باقی رہا۔ پیہم شکستوں اور ناکامیوں نے کھسیانا بنا دیا تھا، لہٰذا شرائطِ صلح کی تحریر و تسوید کے وقت بدکلامی پر اُتر آئے اگر مدِمقابل کوئی اور ہوتا تو اُسی وقت خونریزی ہو جاتی مگر آنحضرتؐ نے ضبط و تحمل سے کام لے کر صورتِ حال پر قابو پا لیا اور صلح نامہ مُرتّب ہو گیا۔ اور لوگ کشت و خون سے بچ گئے:

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیئے تو شروع سے آخر تک قریش کا طرزِ عمل اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ان پر احساسِ شکست طاری تھا اور ان کی کیفیت اس جُواری کی سی تھی جو محاربہ کی بازی میں نہ صرف عزّت و دولت سے ہاتھ دھو چکا ہو بلکہ زندگی کی پُوری کائنات ہار چکا ہو اور اب شکست، معذوری مایوسی کے سوا کچھ باقی نہ رہا ہو۔ ایسی حالت میں اس کا تلملانا اور جزبز ہونا نفسیاتی کمزوری کی دلیل تھا، اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے انہیں معذور سمجھ کر صبر و تحمل سے کام لیا اور ان نیم جانوں پر کوئی اور تازیانہ لگانے کی بجائے نرمی کا برتاؤ کیا۔ آپؐ قریش کو مٹانا نہیں چاہتے تھے، ان کی عزّت کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے، ان کا ورثہ نہیں لینا چاہتے تھے بلکہ ان کو عزّت و سربلندی عطا کرنا چاہتے تھے، ان کے حق کو قائم و دائم رکھنا چاہتے تھے۔ صلح حُدیبیہ کے موقعے پر آنحضرتؐ کی حدیث یہ ہے کہ ایسے حالات میں فاتح کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیئے اور قوت و قدرت کے باوجود حلم و تدبّر سے کام لے:

شرائطِ صلح میں بظاہر آنحضرتؐ صلعم کی طرف سے کمزوری کا اظہار ہوتا ہے اور بعض صحابہؓ اس پر ملول بھی ہوتے ہیں لیکن یہی اصولِ کامیابی ہیں۔ آنحضرتؐ کی دُور بین نگاہیں اس کو اچھی طرح دیکھ رہی ہیں اور جب آپؐ صحابہؓ کو اس راز سے آگاہ کرتے ہیں

تو وہ بھی مطمئن و مسرور ہو جاتے ہیں۔

غزوۂ خیبر۔

اس کے بعد آپؐ مدینے کو مراجعت فرماتے ہیں اور مرکز میں بیٹھ کر وسیع تر دائرہ کے دفاعی منصوبے کی جزئیات پر عمل فرماتے ہیں۔

یہود کی ریشہ دوانیاں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ مدینے اور نواحِ مدینہ کے یہودی اور ان کے اتحادی غطفان آنحضرتؐ کے خلاف جمعیت پیدا کرتے ہیں۔ آپؐ ان کی تادیب کے لئے روانہ ہوتے ہیں اور ایک ہی چال سے دونوں کو اس طرح زیر کر لیتے ہیں کہ ان کی طاقت و جمعیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ ایک طرف غطفان ہیں دوسری طرف خیبر کے یہودی۔ غطفان یہودیوں کی حمایت کے لئے آتے ہیں۔ لیکن جب آنحضرتؐ اپنی ماہرانہ چال سے دونوں کے درمیان پُراسرار طور پر روانہ ہوتے ہیں تو دونوں اپنی اپنی جگہ سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ غطفان یہود کی مدد سے دست بردار ہو کر اپنے دیار کی حفاظت کے لئے لوٹ آتے ہیں۔ اس طرح دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے یکے بعد دیگرے آپؐ دونوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہود کا وہی حال تھا جو دوسری جنگِ عظیم میں فرانسیسیوں کا میجنو لائن کے سقوط کے وقت تھا۔ جرمنوں نے خلافِ توقع عقب سے حملہ کر کے سارے دفاعی استحکامات کو بے کار کر کے رکھ دیا۔ یہی حال خیبر والوں کا ہؤا۔ ناکام ہو کر وہ وطیع اور سلالم کے قلعوں میں جمع ہوتے ہیں۔ آنحضرتؐ ان کو محصور کر کے بنو غطفان پر حملہ کرتے ہیں اور ان کی قوت کو شکست کر کے دوبارہ یہود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ان کو صاف کر کے دوسرے یہودیوں کو عارضی کاشتکار کی حیثیت سے وہاں آباد ہونے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ جس سے یہودیوں کے مختلف قبیلوں میں اور بھی تفرقہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آنحضرتؐ کے لئے یہود کی فتنہ انگیزی و دغابازی کا خاتمہ بہت ضروری تھا۔ وہ مسلمانوں کے دشمنوں کی ہر طرح مدد کرتے تھے اور مسلمانوں میں نفاق و شقاق اور بد اعتمادی پیدا کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے۔ اگر یہودی قریش کی مدد نہ کرتے تو اُحد اور خندق میں قریش اتنی بڑی فوج جمع نہ کر سکتے اور غطفان، بنو فزارہ، بنو مُرّہ، بنو اشجع، بنو قریظہ وغیرہ مدینے کے محاصرے میں حصّہ نہ لے سکتے۔ دفاعی منصوبے

کی تکمیل کے لئے یہودیوں کو سزا دینا ضروری تھا۔ غزوۂ خیبر ان کے اجتماعی استیصال کیلئے تجویز کیا گیا اور اس کامیابی کے بعد وہاں کے یہودیوں کو جلا وطن کر دیا گیا۔

وفود و مہمات۔

یہود سے فارغ ہو کر آپؐ نے مختلف قبائلی علاقوں میں مختلف وفود و مہمات روانہ کیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم وہ وفود تھے جو دفاعی دائرہ کے محیط پر مختلف ملکوں کے فرمانرواؤں کے پاس بھیجے گئے۔ اس سلسلے میں مدینے کی مرکزی حیثیت اور بھی سود مند ثابت ہوئی۔ یہاں سے آمد و رفت کے راستے آسان اور فاصلے کم تھے۔ اور یہ چیزیں تبلیغی وفود اور دفاعی مہمات دونوں کے لئے یکساں ضروری تھیں۔

فتحِ مکہ۔

جب مطلع دُور دُور تک صاف ہو گیا تو آپؐ نے مکے کی طرف توجہ کی۔ قریش صلحِ حدیبیہ کی خلاف ورزی کر کے اپنے جال میں خود پھنس چکے تھے اور مسلمانوں کے حلیف قبیلے کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا کر آنحضرتؐ کو باز پُرس کرنے پر مجبور کر چکے تھے لہٰذا آپؐ عظیم الشان لشکر لے کر روانہ ہوئے اور حسبِ سابق پُر اسرار طریقہ پر خفیہ اور پُر پیچ راستے سے پھر جب مکے میں داخل ہوئے تو اتنے عسکری نظم و ضبط کے ساتھ شہر کو چاروں طرف سے اس طرح گھیر کر کہ چند نفوس کے علاوہ نہ کسی کی جان گئی نہ مال لُٹا نہ عزت و آبرو پر حرف آیا نہ کسی کی ذلت و رسوائی ہوئی۔ سب کو معاف کر دیا گیا، سب کو آزاد کر دیا گیا۔

مکے کی فتح گویا دفاعی منصوبے کا تکملہ تھا۔ ساری مخالفتیں ساری عداوتیں، ساری سازشیں اور ساری شیطنتیں ختم ہو گئیں، جو مجبور و بے چارہ تھا وہ اب فاتح اور صاحبِ اقتدار ہے، اور جو ظالم اور سرکش اور باطل پرستی کے علمبردار تھے وہ عاجز و درماندہ اور ہادیٔ برحق کے سامنے سرنگوں۔ وہ ان کو ان کی آزادی واپس دے رہا تھا، ان کی خطاؤں کو معاف کر رہا تھا، زندگی کا درس دے رہا تھا اور حقیقی عزت و سربلندی کی شاہراہ کھول رہا تھا اور وہ خجل و پشیمان اور حیرت زدہ و آبدیدہ اس کی عظمت و رفعت کا اعتراف کر رہے تھے۔

یہ تھا ہجرت کا مقصد، یہ تھا دفاعی منصوبے کا راز، اس لے لئے تھی آپؐ کی جنگ اور

یہ تھے فتح کے معانی۔ نہ ادنیٰ فخر و غرور کا اظہار، نہ کسی انا و استکبار کا شائبہ، سر بارگاہِ الٰہی میں جھکا ہُوا اور زبان توفیقِ الٰہی کی سپاس گذاری میں مصروف۔ صلی اللہ علیہ وسلم!

فتحِ مکّہ کے بعد آپؐ نے حجاز کے امن و امان پر توجہ فرمائی۔ مختلف مہمات کے ذریعے گمراہ قبائل کو راہِ راست پر لائے اور تبلیغی وفود بھیج کر دولتِ ایمان و متاعِ عمل سے بہرہ ور کیا۔ یہاں تک کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کی بشارت پیکرِ وجود میں آگئی اور کفر زارِ حجاز اسلام کا گہوارہ بن گیا۔

اس کے بعد آپؐ نے تبوک کی مہم کا اعلان فرمایا اور ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ اس میں حسبِ سابق منافقوں نے منافقت سے کام لے کر مہم کو کمزور کرنا چاہا مگر ناکام رہے چونکہ آپؐ نے منزلِ مقصود کا اعلان فرما دیا تھا اس لئے لوگوں کو یقین نہ آیا اور ان قبائل اور ان کے سرداروں نے جن کے مقابلے کے لئے مہم تیار کی گئی تھی لڑنے کی کوئی تیاری نہ کی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جب آنحضرتؐ ان کے علاقے میں پہنچے تو وہ بھونچکے سے رہ گئے اور آپؐ سے صلح کر کے جزیہ دینے پر مجبور ہُوئے۔

یہ ہے خلاصہ ان تمام غزوات و مہمات کا جو آنحضرت صلعم کا تا اَبد زندہ رہنے والا کارنامہ ہے اور یہ ہے وہ دفاعی سیاست اور محمدیؐ فنِ حرب جس نے کفر و طاغوت کے سارے ہتھیاروں اور سارے ہتھکنڈوں کو بے کار کر کے اسلام کی توسیع و ترقّی اور مسلمانوں کے عروج و اقبال کی راہ کھول دی جسطرح آنحضرتؐ کے تمام دوسرے اقوال اور اعمال و افعال واجب التقلید ہیں اور اُسوۂ عمل کا حکم رکھتے ہیں اسی طرح آپؐ کی دفاعی حدیث واجب التعمیل اور واجب التقلید ہے۔ اور اس میں ہر اُس کیوں، کیا اور کیسے کا یقین افروز جواب موجود ہے جو اسلام کو سربلند اور اسلامی سوسائٹی کو مرضیاتِ الٰہی کے منہاج پر قائم کرنے کے سلسلے میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ روشنی کا وہ مینار ہے جو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکے اور پستی و درماندگی کی ذلتوں میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کو منزلِ مقصود کا پتہ دے رہا ہے۔ اے کاش، بانیٔ اسلامؐ کی راہ پر چلنے کا دعویٰ کرنے والے اب بھی بیدار ہو جائیں، اب بھی دیدۂ بینا سے دیکھیں اور گوشِ شنوا سے سُنیں کہ داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام کے بناؤ استحکام کے لئے کیا کیا اور کس کس طرح کیا، اسلام کس لئے آیا تھا اور ہم

اس کے ساتھ کیا کیا سلوک کر رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے فائدوں، ذلیل مصلحتوں اور تجدد فروشیوں میں کس طرح مست ہیں، وقت کی پکار کیا ہے؟ اور ہم رفضت و عافیت کے گوشوں میں بیٹھے ہوئے شخصی سُود و زیاں کو کس طرح تول رہے ہیں۔ یوں تو ہم میں ارباب علم و مشیخت بھی ہیں اور اصحابِ درس و افتاء بھی۔ فکر و نظر رکھنے والے بھی ہیں اور سحر طراز اہل قلم بھی، شاطرانِ بزم سیاست بھی ہیں اور منبر و محراب کو زینت بخشنے والے بھی، لیکن عزم و یقین اور جراٴت و حوصلہ رکھنے والے کہاں ہیں، اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے مر مٹنے والے کتنے ہیں، کتاب و سُنت کی مظلومی کا تماشا بنانے والوں کو راہِ راست پر لانے اور دفاعی حدیث پر عمل کرنے والے کون کون ہیں، مصلحت سنجی و قیل و قال کو چھوڑ کر میدانِ عمل میں آنے کے لئے کون تیار ہے؟ رسولِ اکرم کے راستے پر کون چلنا چاہتا ہے، توفیقِ الٰہی کی سعادت اندوزیاں کس کا مقصدِ حیات ہیں؟ اسلام آج اس کا جواب چاہتا ہے، ایمان اس کا جواب چاہتا ہے، وقت اس کا جواب چاہتا ہے ؎

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں راچہ شُد

اسباق۔

اب تک آنحضرت کی شخصیت اور آپ کی دفاعی سیاست کا فنی، واقعاتی اور تاریخی نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ اب دنیا کے ان چند چوٹی کے جرنیلوں کی شخصیت اور ان کے عسکری کردار کا جائزہ لیا جاتا ہے جو شہرت کے آسمان کے تابندہ ستارے سمجھے جاتے ہیں۔ چونکہ مصنف کو سپاہی کی حیثیت سے ان کے مطالعہ کے بہترین مواقع حاصل رہے ہیں اس لئے جو کچھ پیش کیا جائے گا وہ ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہو گا یا قابلِ اعتبار شہادتوں کی بنا پر۔

دوسری عالمی جنگ جاری ہے۔ شمالی افریقہ میں العلمین کا میدانِ کارزار گرم ہے۔ اتحادی فوجوں کی کمان فیلڈ مارشل منٹگمری کے ہاتھ میں ہے اور جرمن فوجوں کی مارشل رومیل کے ہاتھ میں۔ دونوں جنگ کی مشہور شخصیتیں ہیں۔

یہ فیلڈ مارشل منٹگمری کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ایک موٹر لاری پر نہایت نفیس و آرام دہ مکان بنا ہوا ہے۔ اس کا نام کارواں ہے۔ سالارِ اعظم اس میں آرام فرماتے ہیں۔ اس میں نہایت قیمتی گدّے دار پلنگ بچھا ہوا ہے، بجلی لگی ہوئی ہے، میز کرسیوں اور آسائش کے تمام لوازم موجود ہیں، دیواروں پر نقشے آویزاں ہیں، فیلڈ مارشل اسی میں استراحت فرماتے ہیں اور اسی میں دفتری کام کرتے ہیں، گویا گھر کا گھر، دفتر کا دفتر اور متحرک ؛

یہ سالارِ اعظم کے ایڈیکانگ ہیں۔ ایڈیکانگ صاحب فرماتے ہیں" ہمارے فیلڈ مارشل بڑے محنتی اور جفاکش ہیں۔ اس عمر میں بھی برابر ورزش کرتے ہیں، شراب اور سگریٹ کے قریب نہیں جاتے۔ لیجئے، یہ فوجی گاڑی آکر رُکی۔ مارشل صاحب کے چیف آف اسٹاف تشریف لائے ہیں۔ اب وہ ان کے متحرک مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ اجازت مل گئی لہٰذا اندر جاتے ہیں۔ فیلڈ مارشل پلنگ پر دراز ہیں، آنے کا سبب پوچھتے ہیں، وہ کہتے ہیں، جناب عالی ہماری فوج نے دشمن پر حملہ کر دیا۔ منٹگمری، بہت خوب، منصوبہ صحیح نکلا۔ یہ کہہ کر وہ کروٹ بدلتے اور سو جاتے ہیں۔ مشیر خاموشی سے لوٹ آتا ہے اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے اپنے دفتر کو چلا جاتا ہے۔ لڑائی گھمسان کی ہو رہی ہے ؛

اب اِدھر آئیے۔ یہ جرمن کیمپ ہے۔ لیجئے جرمن سالارِ اعلیٰ محاذِ جنگ پر موجود ہی نہیں، رخصت پر جرمنی گیا ہوا ہے۔ مگر اس کا اور اس کے ماتحت سالار کا کارواں بھی اسبابِ راحت و آسائش سے مزیّن ہے۔ لیکن ایک فرق ہے۔ یہاں کھانے پینے کا انتظام اتنا اچھا نہیں، نہ اعلیٰ درجے کے برتن اور چھری کانٹے ہیں اور نہ مسکوٹ (Mess) رومیل سادگی پسند ہے وہ بھی وہی کھانا کھاتا ہے جو اس کے سپاہی کھاتے ہیں۔ اس لئے اطالوی جرنیلوں کو رومیل سے شکایت رہتی ہے ؛

جنگ ۲۳ر کو شروع ہوئی ہے، ۲۶ر کو اس کے واپس آنے کی خبر ہے۔ لہٰذا اسے دیکھ کر ہی جانا چاہیئے۔ سنتے ہیں وہ شراب بہت کم پیتا ہے۔ اپنا کام بہت محنت سے کرتا ہے ؛

لیجئے آج ۲۶ر ہو گئی۔ رومیل واپس آگیا۔ اس کے کاروان میں چہل پہل بڑھ گئی۔ جب سے آیا ہے اپنے کام میں مصروف ہے۔ بڑا سرگرم اور مستعد جرنیل ہے۔

احکام پر احکام جاری ہو رہے ہیں۔ اب وہ محاذِ جنگ کے معائنے کے لئے جا رہا ہے ہر چھوٹے بڑے افسر کا حوصلہ بڑھا رہا ہے، اتنا سرگرمِ کار ہے کہ خواب و خور حرام ہے ؛

کیا کہا آپ نے؟ اُن کا اُستاد یا پیرومُرشد، منٹگمری اور رومیل کا؟

پیرومُرشد کہیئے یا اُستاد، دونوں کا ایک ہی ہے ——— نپولین۔ نپولین پر فرانس ہی کو نہیں سارے یورپ کو فخر ہے، وہ انہی دونوں کا مُرشد نہیں ہے، اس کے بعد جتنے جرنیل ہوئے ہیں سب اپنے آپ کو اسی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل سمجھتے ہیں، اور اسی پر ناز کرتے ہیں۔ نپولین نہ کہیے نپولین اعظم کہیئے ——— !

آیئے چشمِ تصوّر سے اس کے کیمپ کی بھی سیر کر لیجئے۔ اللہُ اکبر! کس کرّوفر اور کس دبدبے کا جرنیل ہے۔ خیمہ کتنا شاندار ہے اوپر سفید اور نیلی دھاریاں ہیں اور اندرونی حصّہ سُنہری و روپہلی کام سے آراستہ۔ بھئی مجھ سے غلطی ہوئی، نپولین محض جرنیل ہی نہیں شہنشاہ بھی ہے۔ دفاعی مشیر برتھیئر (Berthier) وزیر محلات ڈیورک (Duroc) اور وزیر اصطبل کیلنکورٹ (Caulaincourt) ہر وقت حضوری میں رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے افسروں اور حاکموں کا جمِ غفیر ہے جو ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ میدانِ جنگ میں بالعموم اس کے لئے تین کمرے مخصوص ہوتے ہیں کیونکہ فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں عام قاعدہ یہ ہے کہ لڑائی کے زمانے میں فوج کے آدمی شہریوں کے مکانوں میں قیام کرتے ہیں۔ لہٰذا جب خیمے کی ضرورت نہیں ہوتی تو کمرے مخصوص کیئے جاتے ہیں ؛

اس کی خوراک بہت کم ہے، شراب شاذ پیتا ہے۔ دن رات میں چھ گھنٹے سوتا ہے اور اگر وقت ملے تو تین گھنٹے آرام کرتا ہے۔ باقی ۱۵ گھنٹے کام کرتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ وِٹوریا (Vittoria) میں ہمیں اس لئے شکست ہوئی کہ جوزف دیر تک سوتا رہا۔ اگر ایکمل (Eckmuhl) کی لڑائی میں مَیں بھی رات کو سوجاتا تو وہ حیرت انگیز نقل و حرکت نہ کر سکتا جس کی وجہ سے مَیں نے پچاس ہزار فوج سے ایک لاکھ بیس ہزار کے لشکر کو شکست دی۔ مجھے مارشل لینز (Lannes) کو ٹھوکر مار کر اس لئے جگانا پڑا کہ وہ بہت ہی غافل سو رہا تھا۔ سپہ سالار کو عین لڑائی کے دوران میں کبھی نہیں سونا چاہیئے ؛

نپولین کی کم خوابی اس کی ایک خوبی سمجھی جاتی ہے۔ وہ چھ گھنٹے مسلسل سوئے یا حسبِ حالات تھوڑی تھوڑی دیر سو کر پورے کرے بہر حال اس سے زیادہ نہیں سوتا۔ رات کو کوچ کے وقت وہ دو خاص گاڑیاں استعمال کرتا ہے، اور ان میں سوتا ہے۔ اس کے ایڈی کانگ اس کے گھوڑوں کو لے کر اس کی گاڑی کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اس میں اس کی نشست ایسی ہے کہ اسے دراز کر کے وہ اس پر لیٹ جاتا ہے۔ ایک کرسی اس کے مشیر بر تھیئر کے لئے ہے جس پر وہ بیٹھتا ہے اور سارا وقت بیٹھے بیٹھے گذارتا ہے۔ ایک بڑا لیمپ لگا ہوا ہے اور ایک میز ہے جس پر جنگ کے نقشے تیار کئے جاتے ہیں اور جسے ہمیں موم بتیوں سے روشن کیا جاتا ہے۔

نپولین بہت بڑا شہسوار ہے، میدانِ جنگ میں جاتا ہے تو بیسیوں میل گھوڑے پر بیٹھ کر طے کرتا ہے۔ گھوڑوں کی ڈاک بندھی رہتی ہے تاکہ ہر دس میل پر تازہ دم گھوڑا مل جائے۔

رُعب داب کا یہ عالم ہے کہ کسی کو چون و چرا کی مجال نہیں۔ سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ سارے منصوبے خود بناتا ہے، ہر مرحلے پر غور و تعمق سے کام لیتا ہے، جب کسی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے تو برق رفتاری سے عمل کرتا ہے۔ اس کے دفاعی منصوبے لچکدار ہوتے ہیں تاکہ حسبِ حالات ان میں مناسب ردّ و بدل کیا جاسکے۔ منصوبہ تیار کر لیتا ہے تو برتھیئر کو بُلا کر ضبطِ تحریر میں لانے کا حکم دیتا ہے۔ غور و فکر اور منصوبہ آرائی کا کام عموماً رات کو کرتا ہے اور اس وقت اس کا کمرہ گویا دفاعی سائنس کی تجربہ گاہ ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں تنہا دس ہزار جنگجو سپاہیوں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ کامیابیاں اس کے قدم چومتی ہیں، شہرت و ناموری اس کی لونڈیاں ہیں، مُلک و قوم کو اس پر ناز ہے۔ لیکن چستی و مستعدی، غور و فکر، جوشِ عمل، موقع شناسی و مآل اندیشی کا دور رفتہ رفتہ ختم ہوتا جارہا ہے، فتوحات نے اسے متکبّر بنا دیا ہے، اب وہ ایک زود اشتعال اور جابر و مستبد حکمران ہے، ہر چیز کو حسبِ منشاء دیکھنا چاہتا ہے، انا و استکبار نے جوشِ عمل کو سرد کر دیا ہے۔ جن صفات کے اجتماع نے اسے شہرت کے آسمان پر پہنچایا تھا اب انہی کا تدریجی انحطاط اسے زوال کی طرف دھکیل رہا ہے حتّٰی کہ وہ شکست کھا کر گرفتار ہو جاتا ہے اور قید کی حالت میں

دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کے زوال کے ساتھ ملک و قوم پر بھی زوال آجاتا ہے اور تمام عروج و ناموری افسانہ بن کر رہ جاتی ہے +

ماضی قریب و بعید کے ان ناموروں کے حالات مشاہدہ کرنے کے بعد آئیے اب آپ کو ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کے مدینہ منورہ میں لے چلیں۔ چشم تصوّر وا کیجئے۔ ابھی غزوۂ خندق وقوع میں نہیں آیا۔ مدینے پر حملے کی خبریں اُڑ رہی ہیں، قرب و جوار کے یہودی قریش کے استقبال کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے لئے رسد و خوراک جمع کی جا رہی ہے۔ آنحضرتؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما ہیں، صحابہ کبارؓ آپؐ کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں۔ مدینے کے دفاع پر غور ہو رہا ہے۔ کسی صحابی کا خیال ہے کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے، کسی کی رائے ہے کہ آطاموں میں قلعہ بند ہو کر لڑنا چاہئے، سلمان فارسی ایران کی مثال پیش کرتے ہیں اور خندق کھود کر مورچہ بند ہونے کی تجویز پیش فرماتے ہیں۔ آنحضرتؐ سب کا مشورہ سنتے ہیں مگر سکوت فرماتے ہیں۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہو جاتی ہے۔ رات کو آنحضرتؐ نماز عشاء کے بعد مسجد ہی میں تشریف فرما رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے استمداد کرتے ہیں، دعا کرتے ہیں، سربسجود ہوتے ہیں، یہاں تک کہ دن نکل آتا ہے۔ صحابہ جمع ہوتے ہیں، نمازِ فجر پڑھی جاتی ہے، اس کے بعد آپؐ فرماتے ہیں گھوڑے منگاؤ، گھوڑے لائے جاتے ہیں۔ ان پر نہ زیب و زینت ہے، نہ زین و لگام۔ آنحضرتؐ اور صحابہ اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ قبضۂ تلوار پر ہے ایک گھوڑے کی گردن پر۔ آنحضرتؐ آگے ہیں اور صحابہؓ آپؐ کے پیچھے۔ شہر کے باہر آپؐ وادیوں اور قدرتی نشیب و فراز کا معائنہ فرماتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے یہاں سے یہاں تک اس وادی کو استعمال کیا جائے گا، یہاں سے وہاں تک خندق کھودی جائے گی، جس کی چوڑائی اور گہرائی اتنی ہوگی۔ یہاں سے یہاں تک کا کام فلاں صحابی کے ذمے ہوگا، وہاں سے وہاں تک فلاں کے۔ اسی طرح پوری خندق کی تیاری کا نقشہ بن جاتا ہے اور آنحضرتؐ بعد دوپہر اس کی داغ بیل ڈلوا دیتے ہیں اور کھدائی کے کام میں بہ نفس نفیس شرکت فرماتے ہیں۔ کھانا نہایت معمولی، چند کھجوریں اور روٹی۔ کھود چکتے ہیں تو روٹی سے یہی چند کھجوریں تناول فرما کر پیادہ پا روانہ ہو جاتے ہیں اور

کھدائی کے کام کی نگرانی فرماتے ہیں۔ دن بھر اس طرح کام کرنے کے بعد رات کو مسجد میں تشریف لاتے ہیں، دسترخوان بچھتا ہے، یہاں بھی وہی تھوڑی سی کھجوریں اور جو کی روٹی۔ خود بھی کھاتے ہیں اور صحابہؓ کو بھی دیتے ہیں۔ دوسرے دن پھر اسی طرح کام جاری رہتا ہے، مگر آج چند کھجوریں اور جو کی روٹی بھی نہیں آنحضرت نے پیٹ پر پتھر باندھ لیا ہے، کام جاری ہے، تمام صحابہؓ اور سارے مسلمان بھی گرسنگی و تشنگی کی تکلیفوں کے باوجود اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ آپؐ جہاں تشریف لے جاتے ہیں مسلمانوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگتے ہیں۔ آپؐ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں، مخبر و جاسوس خبریں لاتے ہیں اور سیدھے آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر واقعات سے مطلع کرتے ہیں۔ آنحضرت ان سے سوالات کرتے ہیں، ہدایات دیتے ہیں مگر یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ اب آپؐ کیا کرنے والے ہیں۔ جال باز اور جال بانہ دستے روانہ فرماتے ہیں اور ان کے سالاروں کو منزلِ مقصود بتاتے ہیں مگر کسی دوسرے شخص کو معلوم نہ ہوتا کہ کہاں بھیجے جا رہے ہیں۔ غرض ہر کام احتیاط و مآل اندیشی کے ساتھ خفیہ و رازدارانہ طریقہ پر ہو رہا ہے۔ وہ دشمن کے سامانِ رسد وغیرہ کو لوٹ رہے ہیں، قیدی لا رہے ہیں اور جنگ کے ہر منصوبہ پر نظم و ضبط کے ساتھ عمل کر رہے ہیں۔ دشمن کی طاقت زبردست ہے، کوسوں تک حملہ آور فوج کے آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں مگر خندق کو عبور نہیں کر سکتے۔ محاصرہ طول پکڑتا ہے، قریش اور ان کے حلیفوں کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیں گے مگر یہ طوالت خود ان کے لئے تباہ کن اور بلائے جان ثابت ہوتی ہے۔ ان کے اتحاد و یکجہتی کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے، بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخر کار آنحضرتؐ کی سیاست کاری رنگ لاتی ہے اور قریش بھاگ جاتے ہیں، ان کے بعد ان کے اتحادی بھی اپنی اپنی راہ لیتے ہیں +

بنو قریظہ نے عہد شکنی، دغابازی اور غداری کی ہے۔ لہٰذا غزوہ سے فارغ ہوتے ہی ان کے دیار کا محاصرہ کر لیتے ہیں اور انہیں کیفرِ کردار کو پہنچا کر واپس مدینے تشریف لاتے ہیں +

اس کے کچھ عرصہ بعد بنی لحیان کی گوشمالی کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ لشکر ساتھ ہے، مدینے سے روانہ ہو چکے ہیں مگر جائے مقصود کا کسی کو علم نہیں۔ غرآن پہنچتے ہیں تو بنی لحیان کو اپنی عافیت خطرے میں معلوم ہوتی ہے۔ گھر بار کو چھوڑ کر پہاڑوں میں جا چھپتے ہیں۔ آنحضرتؐ وہاں سے غسفان تشریف لے جاتے ہیں اور وہاں سے کچھ سواروں کو مکے کی طرف روانہ فرماتے ہیں اور یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ اس طرح جاؤ کہ اہل مکہ تمہیں دیکھ لیں۔ اس کے بعد مدینے کو مراجعت فرماتے ہیں اور وہاں سے مختلف مقامات کو مختلف قسم کی مہمیں روانہ کرتے ہیں اور یہ سب کامیاب ہو کر واپس آتی ہیں +

غزوۂ خندق کو ایک سال گذر چکا ہے۔ مہمات کے ذریعے جو مالِ غنیمت حاصل ہؤا ہے اس سے مسلمانوں کی حالت اچھی ہے، اونٹ اور دوسرے مویشی کافی تعداد میں ہیں۔ اب آپؐ عمرہ کرنے کے ارادے کا اظہار فرماتے ہیں اور ایک ہزار مسلمانوں کو ساتھ چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ کہاں ایک سال ہؤا جنگ جاری تھی اور اب بھی جنگی کیفیت طاری ہے کہاں عمرہ کے لئے مکے جانے کی تیاری۔ بڑی عجیب بات ہے۔ لیکن دراصل اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں آنحضرتؐ کی نظریں بہت دُور دیکھ رہی ہیں۔ تیاری جنگ کی نہیں فریضۂ مذہبی کی ادائیگی کی ہے، قربانی کے اونٹ ساتھ ہیں۔ مگر غسفان پہنچتے ہیں تو قریش کی مزاحمانہ تیاریوں کی خبر ملتی ہے۔ معاً راستہ بدل دیتے ہیں اور مکے کے قریب حدیبیہ میں اس طرح پہنچ جاتے ہیں کہ قریش کا رسالہ بالکل بے خبر رہتا ہے۔ اب مکہ سامنے ہے اور دشمن کی فوج آپؐ کی کھوج میں دُور نکل چکی ہے۔ مکے میں داخلے کا بہترین موقع ہے مگر آپؐ اس سے احتراز کرتے ہیں۔ ہر بات اور ہر حرکت و سکون تدبر و دانائی کا شاہکار ہے۔ قریش کا نمائندہ بُدیل حاضرِ خدمت ہوتا ہے۔ گستاخانہ اور تخویف آمیز انداز میں گفتگو کرتا ہے، صحابہؓ جز بز ہوتے ہیں۔ آپؐ صبر و سکون سے کام لیتے ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں "بدیل ایسی قریش کو شکست دے چکا ہوں لیکن اس کے باوجود صلح کے لئے پیشقدمی کرتا ہوں۔ بُدیل جہاں دیدہ و تجربہ کار آدمی ہے، بات کی تہ کو پہنچ جاتا ہے +

Indirect Approach کا نقطۂ کمال دیکھئے، بغیر ہتھیار، بغیر تصادم اور بغیر خونریزی مکہ اور نہ صرف مکہ بلکہ پورا حجاز فتح کر لیا۔ ظاہر بین نظروں نے اگر دیکھنے میں کوتاہی کی تو ایک سال کے بعد فاتحانہ داخلۂ مکہ نے اسے ثابت کر دیا۔

اللہ اکبر! کیا سادگی اور کیسی پُرکاری ہے۔ اس کا نام ہے فتح و کامیابی، اسے کہتے ہیں عظمت و جلالت، یہ ہے قیادت و سالاری اور یہ ہے فنِ حرب و سپہ گری۔ کیا اس کی کوئی مثال نپولین کے عسکری کردار میں موجود ہے؟ اس کے پیش رووں کے کردار میں ملتی ہے؟ اس کے بعد آنے والوں کے کردار میں ملتی ہے؟ کامیابی و فتح مندی کے حقیقی معیار پر کوئی بھی پورا اُترتا ہے؟ مقابلے پر کوئی بھی ٹھہرتا ہے، کسی کو بھی نمونۂ تقلید بنایا جا سکتا ہے؟ نہیں بنایا جا سکتا، یہ مقام صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تعظیم و توصیف اور تقلید کی سزاوار صرف آپؐ کی ذاتِ بابرکات ہے۔ دوسروں کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہ کیجئے، ترقی کی شاہراہ سے بھی مُنہ نہ موڑئیے، صحیح و صالح علم و فن مسلمان کی میراث ہے، یہ جہاں بھی ملے اسے لے لینا چاہئے، لیکن تحصیلِ علم و فن اور بات ہے اور کورانہ تقلید اور۔ اللہ نے قرآن مجید میں جو بار بار اپنے رسولؐ کی سُنت پر عمل کرنے کے لئے کہا ہے تو اس سے مُراد یہ نہیں ہے کہ اس کے دائرے میں صرف عبادات و معاملات ہی آتے ہیں، وہ عبادات و معاملات جن کا مفہوم انتہائی محدود کر دیا گیا ہے بلکہ اس میں آپؐ کی دفاعی حدیث بھی شامل ہے کیونکہ یہی آپؐ کے مشن کی تکمیل کا ذریعہ بنی اور اسی سے خدا اور رسولؐ کے دشمنوں کو شکست ہوئی۔ اسی سے دنیا میں اسلام پھیلا اور اسی پر ہمارے ملّی وجود کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ پھر جب خدا کے برگزیدہ پیغمبر کو وقت کے موانع پر قابو پانے کے لئے دفاعی سیاست سے کام لینا اور حرب و ضرب کی کارروائی اختیار کر کے راستے کی مشکلات کو دور کرنا پڑا تو آج جب مسلمان اپنے اصل مقام کو کھو کر اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں تو یقیناً دفاعی سُنت پر ہی عمل پیرا ہو کر زندہ رہ سکتے ہیں۔ کوئی انجمن آرائی، کوئی سیاست بازی، کوئی خطابت اور کوئی زورِ قلم انہیں منزلِ مقصود پر نہیں پہنچا سکتا۔ یہ تمام طریقے اختیار کئے جا چکے، سارے ذرائع آزمائے جا چکے، ان میں سے کسی کی کمی نہیں، ہر چیز کی افراط ہے۔ ہر چیز بہتات سے موجود ہے مگر دفاعی حدیث پر نظر رکھنے والوں

کا فقدان ہے، آنحضرت کی سیاست و تدبیر اور فن سپہ گری کی اہمیت کو سمجھنے والوں کی کمی ہے، اس جذبہ اور اس جوش کی کمی ہے جس کے سامنے صحراؤں کی پہنائیاں سمٹ گئیں، پہاڑوں کی بلندیاں پست ہو گئیں، اسباب و وسائل کی قلت بے معنی ہو کر رہ گئی، ذرّے آفتاب بن گئے، زور آور زیر ہو گئے اور زندگی سر تا سر رحمت بن گئی۔

حاصل کلام، آنحضرتؐ کے دفاعی منصوبے اور اس کے تحت سارے غزوات و مہمات کے جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور جو سیاست، دفاع اور فنِ جنگ کا لبِ لُباب کہے جا سکتے ہیں یہ ہیں :۔

ا۔ دفاعی منصوبہ سادہ مگر مکمل ہو۔ سادے سے مُراد یہ ہے کہ اس میں ایسی گنجائش رکھی جائے کہ جنگ کے بدلتے ہُوئے حالات کے مطابق بآسانی مناسب ردّ و بدل کیا جا سکے کوئی سیاست دان صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ جنگ کے وقت حالات کیا ہوں گے، لیکن دفاعی ماہر ہر امکان کو مدِّ نظر رکھتا ہے اور جب منصوبہ تیار کرتا ہے تو اس میں ان سب کا لحاظ رکھتا ہے تاکہ بوقتِ ضرورت اس میں حسبِ حال تبدیلی کی جا سکے ۔ جنگ کا فریق کوئی ایک ملک بھی ہو سکتا ہے اور ایک سے زیادہ ممالک متحدہ محاذ بنا کر بھی سامنے آ سکتے ہیں لہٰذا اس کو مدِّ نظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے ۔

دفاعی منصوبہ زمانۂ امن میں تیار ہونا چاہیئے اور پوری تفصیل کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا صیغۂ راز میں رہنا بھی اشد ضروری ہے ۔ منصوبے پر عمل درآمد کے لئے بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کا راز ان میں سے کسی پر ظاہر نہیں ہونا چاہیئے ۔ ہر کام اور ہر ذمہ داری کی تکمیل جُداگانہ طور پر بغیر کسی افشائے راز کے کی جائے ۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری نہیں کہ سیاستدان دفاعی سیاست میں بھی کماحقہٗ درک رکھتے ہوں ۔ پھر امن کے زمانے میں ان کی توجہات دوسرے معاملات پر مرکوز ہوتی ہیں لہٰذا قبل از جنگ اگر وہ اُسے صحیح بھی قرار دیدیں تو جنگ چھڑنے پر اس میں مین میخ نکالتے اور اپنی مرضی کے مطابق ردّ و بدل کرانا چاہتے ہیں ۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ منصوبہ ایسا بنایا جائے جو ذہنی طور پر قابلِ قبول ہو ۔ مثال کے طور پر کسی آزاد ملک کا کوئی باشندہ اس کے لئے تیار نہ ہو گا کہ

اس کے مُلک کی زمین کا ایک چپہ بھی دشمن کے حوالے کیا جائے۔ خواہ دفاعی چال کیلئے ایسا کرنا کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اور اس سے فتح ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ اسے منصوبے کے اس پہلو کا علم ہوگا تو فوراً اس کے خلاف شور مچائے گا اور حکومت پر زور دے گا کہ اسے ترک کرکے دُوسرا منصوبہ بنایا جائے۔ زمانۂ امن میں چونکہ کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا لہٰذا اس قسم کے تاثرات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے عزم و حوصلہ پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے +

دفاعی منصوبہ انتظامی نقطۂ نظر سے بھی ہر قسم کی خامیوں سے پاک ہونا چاہیئے۔ جو جرنیل ناتجربہ کار ہوتا ہے وہ اس پہلو پر پوری توجہ نہیں دیتا۔ صرف اصولِ جنگ ہی کو فنِ سپہ گری تصوّر کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑا نقص اور کوتاہی ہے اور اس کا نتیجہ تباہ کُن ہوتا ہے +

۲۔ دشمن کو دفاعی سیاست کی چالوں کے ذریعے اپنے منصوبے سے بالکل بے خبر رکھنا چاہیئے اور اصل منصوبے پر پورے عزم و جرأت اور سُرعت و بے باکی سے اس طرح ناگہانی طور پر عمل کرنا چاہیئے کہ دشمن بدحواس ہو جائے +

۳۔ مجاہد کے لئے ارادے کی پختگی، بے باکی، مستعدی اور دلیری کی صفات لازمی ہیں۔ اسے آرام طلبی سے دُور رہنا چاہیئے۔ عاقبت بین ہونا چاہیئے اور دشمن کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے +

۴۔ سپہ سالار کو اصل منصوبہ مخفی رکھ کر جملہ انتظامی مراحل اپنی نگرانی میں طے کرانے چاہئیں۔ وہ اپنے مشیروں سے مشورہ لے اور ہر نقطۂ نظر پر غور کرے مگر منصوبے کا فیصلہ خود کرے اور اُسے اپنے آپ تک محدُود رکھے۔ اُسے مشیروں سے بحث نہیں کرنی چاہیئے۔ جب منصوبہ تیار ہو چکے اور اس پر عمل کا وقت آئے تو ماتحت سالاروں کو اس کے ان حصّوں سے حسبِ موقع آگاہ کر سکتا ہے جن پر وہ اس وقت عمل کرانا چاہتا ہے +

۵۔ اپنی دفاعی نقل و حرکت کو انتہائی طور پر راز میں رکھنا چاہیئے۔ مگر دشمن کے دفاعی منصوبے کی اطلاعات حاصل کرنے پر پوری توجہ صرف کرنی چاہیئے۔ اور اس کے لئے مخبروں، جاسوسوں، جانباز، غارت گر اور چالباز دستوں سے

پورا کام لینا چاہیئے

۶۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہو تو جوانمردی، ثابت قدمی اور تحمل و ایثار کی صفات سب سے زیادہ نمایاں ہونی چاہئیں کیونکہ یہ دفاعی منصوبے کی کامیابی کا آخری و فیصلہ کن مرحلہ ہے اور اس کا انحصار انہی کی کارفرمائی پر ہے ۔

۷۔ جنگ محض سپاہی نہیں لڑتے ملت کا ہر فرد لڑتا ہے ۔ کوئی تلوار چلاتا ہے ، کوئی قلم کی طاقت سے کام لیتا ہے، کوئی محنت و مشقت سے معاونت کرتا ہے، کوئی اسلحہ وغیرہ تیار کرتا ہے ۔ جہاد ہر شخص پر فرض ہے لہٰذا ہر فرد کو خواہ مرد ہو یا عورت دفاعی سیاست کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور آنحضرتؐ کی دفاعی حدیث کو سامنے رکھ کر قومی و ملی فوائد کے تمتع کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ جو قوم دفاعی سیاست کو نہیں سمجھتی، فنِ حرب سے نابلد رہتی ہے، جذبۂ حبِ وطن، نظم و ضبط اور اتحاد و ایثار کو روبہ عمل نہیں لاسکتی وہ زندہ نہیں رہ سکتی ۔ اور نہ اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق ہے ۔

۸۔ بہترین سالار وہ ہے جو اپنی فوج کو دانائی و دُور اندیشی سے لڑائے تاکہ اپنا نقصان کم سے کم ہو اور دشمن کی فوج کا زیادہ سے زیادہ ۔ مگر یاد رہے کہ دشمن پر مادی نقصان کا اثر سب سے کم ہوتا ہے، سب سے زیادہ اور دیرپا اثر اخلاقی نقصان کا ہوتا ہے ۔ اگر اسے ذہنی و اخلاقی طور پر زیر کر لیا جائے تو پھر وہ سرتابی نہیں کر سکتا ۔

دفاعی اصول چند ہیں اور یہ ہمیشہ اٹل رہیں گے البتہ ان کو روبہ عمل لانے کے ذرائع بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے ۔ ان کے بدلنے کے لئے حالات پر نظر رکھنا اور ان کو صحیح طور پر سمجھنا ضروری ہے ۔

ہر آزاد مسلمان کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ جب جنگ و جہاد کا وقت آئے گا تو اسے میدانِ جہاد میں جاکر اس میں عملی حصہ لینا ہوگا ۔ لہٰذا اسے جہاد کی تربیت و تیاری کو زندگی کا معمول سمجھنا چاہیئے اور دفاعی سیاست کے اصول و عمل سے پوری پوری واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ جہاں یہ فرض مردوں پر عائد ہوتا ہے وہاں عورتوں کا فرض یہ ہے کہ وہ جہاد کے امدادی کاموں کی انجام دہی کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں دورانِ امن میں ان کی جگہ اندرونِ خانہ اور ان کا کام اس کی زینت و اہتمام اور زمانۂ جنگ و جہاد میں فتح و نصرت کے لئے مجاہدین کے

کاموں میں ہاتھ بٹانا اور زخمیوں کی تیمارداری کرنا ہے +

یہ ہے اسلام کا تقاضا، یہ ہے ہادیٔ اسلام کا راستہ۔ اس میں مضمر ہے ترقّی و سربلندی کا راز اور اس میں پوشیدہ ہے ہماری ساری واماندگیوں کا علاج۔ ہادیٔ برحقؐ کا اُسوۂ عمل، اور اس کے نتائج وہ اور ہماری بے راہ روی و بے عملی اور اس کے نتائج یہ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

جنگ کے ہتھیار

آغازِ اسلام سے اِس وقت تک

اِس باب میں ہم ہتھیاروں کے متعلق کچھ ضروری باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے اُن ہتھیاروں میں جو آنحضرت صلعم نے استعمال کئے تھے اور اُن اسلحہ میں جو آج کی لڑائیوں میں استعمال کئے جاتے ہیں کیا فرق ہے اور جدید ہتھیار کیا ہیں۔ اسلحہ کے متعلق مفصّل معلومات ہماری کتاب "زنگر وٹ کا ماضی" میں ملاحظہ کیجئے +

آنحضرت صلعم نے اپنے غزوات میں سیاستِ دفاع دفنِ حرب وضرب کے بہترین واعلیٰ ترین اصولوں پر عمل کر کے اُمت کے لئے بے مثل حدیث چھوڑی ہے مگر غفلت وکوتاہی کہئے یا بے پروائی کہ نہ تو اہلِ اسلام نے اسے اُسوۂ عمل بنایا اور نہ دُنیائے مغرب کے علماء وماہرین نے اس پر کوئی روشنی ڈالی۔ بطورِ مثال آنحضرت صلعم نے غزوۂ خندق میں جو طریق کار اختیار کیا اس پر ساڑھے تیرہ سو سال بعد دوسری عالمی جنگ میں عمل کیا گیا مگر اختراعِ جدید کا نام دے کر۔ ۱۸-۱۹۱۴ء تک مغرب کے دفاعی مبصر تیز رفتار تاتاری رسالوں کی شمشیر زنی ونیزہ بازی اور توپوں کو متحرک بنانے والی سپہ گری کے افسوں زدہ تھے۔ اس لئے فوجوں میں رسالے کی تعداد کافی ہوتی تھی۔ چھوٹی بڑی توپیں گھوڑوں کی کئی کئی جوڑیوں کی مدد سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جاتی تھیں۔ پلٹن کو ان سے بچانے کے لئے تیز مار رائفلوں سے لیس کیا جاتا تھا اِس کے علاوہ ہاٹچکس مشین گنوں اور دیگر میکسم گنوں (بھاری مشین گنوں) سے بھی مسلح کیا جاتا تھا اور ساتھ ہی مورچہ کھودنے کے لئے بیلچے وغیرہ بھی دئے جاتے تھے +

جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو جرمن توپ خانے نے توپ کے گولے کی

طاقت سے اینٹورپ، لیج اور نیمور کو چند روز کے اندر کھنڈر بنادیا۔ رسالے گتھم گتھا ہوگئے اور جب جرمن رسالے غالب آکر فرانس کے دارالحکومت پیرس تک پہنچ گئے تو طے کیا گیا کہ ان کو روکنے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ اس کے بعد پلٹنیں خندقوں میں گھس گئیں اور رسالے مجبور ہو کر پیچھے ہٹ گئے یا انہیں اپنی فوجوں کے میمنہ ومیسرہ میں متعیّن کردیا گیا۔ اس طرح گویا غزوۂ خندق کے کامیاب تجربہ کو دہرایا گیا۔ فریقین کی پیدل فوجیں ایک دوسرے کے خلاف مورچوں پر ڈٹ گئیں اور ان کا درمیانی حصہ Noman's Land یعنی انسانی قتل گاہ قرار دیا گیا کیونکہ دونوں فریق حملہ کے وقت ایک دوسرے پر اسقدر گولہ باری کرتے تھے کہ اس میں کئی لاکھ جانیں تلف ہوگئیں۔ اور دونوں طرف کی فوجیں غیر متحرک بن گئیں۔ جہاں قیاس یہ تھا کہ جنگ چند ہفتوں کے اندر ختم ہو جائے گی وہاں تین سال گذرنے کے بعد بھی خاتمہ نظر نہ آتا تھا۔ غزوۂ خندق میں مشرکین نے ایک جگہ سے خندق کو عبور کرنے کی کوشش کی تھی جس میں انہیں قطعاً ناکامی ہوئی اور اس کے بعد انہوں نے لڑائی ختم کردی مگر اتحادیوں نے جنگ کو جاری رکھنے کا ایک دوسرا منصوبہ بنایا اور یہ منصوبہ ایسے آلے کی ایجاد تھی جس سے فریقین کے مورچوں کے درمیانی خطّے کو کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ طے کیا جاسکے۔ چنانچہ اس کے لئے ایسی رتھ تیار کی گئی جسے بیلوں یا گھوڑوں کی بجائے مشین سے چلایا گیا اور جس میں بہت سے خطرات سے محفوظ ہو کر دشمن پر حملہ کیا جاسکتا تھا +

اس مشینی رتھ یا ٹینک کی پیش رو وہ رتھ تھی جو ۱۴۷۲ء میں ایجاد ہوئی تھی اور جو ہوا کے زور سے چلتی تھی۔ اس کی ایجاد کا سہرا ایک فرانسیسی کے سر تھا مگر یہ اس وجہ سے کامیاب نہ ہوئی کہ اسے صرف ہوا کے رُخ پر چلایا جاسکتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور فرانسیسی نے اس پر ایک بوائلر (Boiler) لگایا تاکہ اسے بھاپ کی مدد سے متحرک کیا جاسکے مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی +

۱۷۹۹ء میں نپولین نے ایک نئی قسم کی رتھ بنائی جس کا نام جنگی موٹر (ThE Automobile in War) رکھا گیا۔ اسی طرح ستر سال تک مختلف تجربے ہوتے رہے مگر اطمینان بخش طور پر کامیابی کسی میں نہ ہوئی۔ اسکے بعد ۱۸۶۵ء میں ایک انگریز انجینئر

نے ایسی رتھ تیار کی جو دشوار گذار راستوں پر بھی چل سکے لیکن برطانوی حکومت نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اس سے جنگ کی ہولناکی اور بربریت بڑھ جائے گی۔ پھر جرمن انجینئر کرنل وان لیرز (Von Layriz) نے ایک ریل گاڑی پر تیز مار توپ لگائی تا کہ دشمن پر گولہ باری کی جا سکے۔ برطانوی ماہرین نے مشین گنوں کو گھوڑے پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا طریقہ نکالا جس سے فن حرب کے اصولوں میں بڑا تغیر ہوا۔ لیکن ۱۹۱۴-۱۸ء کی عالمی جنگ میں خندق کے تجربہ کی تجدید نے اس فوقیت کو ختم کر دیا تو مارچ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ نئی قسم کا آہن پوش برطانوی مشینی رتھ میدان میں آیا جس کا نام ٹینک رکھا گیا۔ اس نام کے انتخاب میں مصلحت یہ تھی کہ دشمن کو اس آلۂ جنگ کا راز معلوم نہ ہو سکے۔ مگر ٹینک کی کارکردگی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا لہٰذا ۱۹۱۸ء میں جب لڑائی ختم ہو گئی تو اکثر حکومتوں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ لیکن جرمنی کی اس پر خاص توجہ رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ۱۰ ؍مئی ۱۹۴۰ء کو جب ہٹلر نے فرانس پر حملہ کیا تو اس نے ٹینک اور نئے ہوائی جہازوں کی مدد سے آناً فاناً فرانس کو دبا لیا۔ اور اسی طرح سارے یورپ پر چھا گیا+

ٹینک کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض بہت بھاری اور زرہ پوش و بکتر بند ہوتے ہیں۔ ان پر عموماً رائفل، مشین گن اور ٹینک شکن گولے کا اثر نہیں ہوتا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے ان کی رفتار کم ہوتی ہے مگر ان کی توپوں کی مار بہت دُور تک اور بڑی طاقتور ہوتی ہے۔ ایسے ٹینک ۹۵ ٹن وزن کے بھی ہوتے ہیں+

دوسری قسم کے ٹینک کروزر کہلاتے ہیں۔ ساخت اور وزن میں ہلکے ہونے کی وجہ سے تیز رفتار ہوتے ہیں۔ ان کی توپوں کی مار بہت لمبی نہیں ہوتی اور ان کا گولہ زیادہ موٹی آہنی چادر کے آر پار نہیں جاتا۔ ان کا وزن تقریباً پندرہ بیس من یا اس سے زیادہ ہوتا ہے+

کچھ ٹینک کروزر ٹینکوں سے بھی ہلکے ہوتے ہیں۔ ہلکے ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کے بکتر کی چادر موٹائی میں کم ہوتی ہے لہٰذا وزن بھی کم ہوتا ہے۔ وہ تیز رفتار ضرور ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر بیٹھے ہوئے سپاہی بڑی توپ کے گولے سے محفوظ نہیں ہوتے+

بکتر بند موٹر گاڑیوں پر مشین گنیں، چھوٹے دہانے کی توپیں اور خاص قسم کے کیریئر بھی ہوتے ہیں جن پر مورچہ شکن چھوٹی توپیں چڑھائی جاتی ہیں۔ ان کی مدد سے معمولی سی آڑ لے کر دشمن کی پلٹن کو مار کر بھگایا جاسکتا ہے۔ انہیں ٹرینچ مارٹر {Trench-Mortar} کہتے ہیں —— اب فوج کے اہم اعضاء و جوارح کے خصوصی ہتھیاروں کا حال سنئے :۔

پلٹن۔

پلٹن کے خاص ہتھیار رائفل، سنگین، ہلکی قسم کی مشین گن، ٹرینچ مارٹر اور ہلکی قسم کی ٹینک شکن توپ ہوتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں فیصلہ کن لڑائی پلٹن ہی لڑتی ہے۔ اس لئے اسے ملکۂ میدان کہتے ہیں +

پلٹن کے ہتھیار ہلکے اس لئے ہوتے ہیں کہ سپاہی بلاوجہ ان کے بوجھ سے نہ تھکیں۔ ان کی مار لمبی نہیں ہوتی۔ لمبی مار کے لئے توپ خانہ اور بڑی مشین گن استعمال کی جاتی ہے +

مشین گن۔

مشین گن ایسا آلۂ جنگ ہے جس کی مدد سے ایک ہزار گز فاصلے پر فائر نہایت کارگر اور زیادہ عرصہ تک مسلسل کیا جاسکتا ہے۔ عام طور پر مشین گن کی مار دو ہزار گز تک بہت عمدہ ہوتی ہے مگر ساڑھے چار ہزار گز تک بھی اچھی طرح گولہ مارتی ہے۔ اس سے دشمن پر دن اور رات میں ہر وقت ایسی جگہ بھی فائر کیا جاسکتا ہے جہاں وہ زمین کے نشیب یا فراز کی وجہ سے چھپا ہوا ہو اور بغیر طاقتور آلات کے اسے دیکھا نہ جاسکتا ہو۔ اس سے ایک منٹ میں ۲۵۰ (دو سو پچاس) کارتوس چلتے ہیں۔ گولیوں کے کارتوسوں کے علاوہ آگ لگانے والے کارتوس بھی چلائے جاسکتے ہیں جنہیں عام طور پر رات کے وقت گولیوں کی مار دکھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کا نام ٹریسر کارتوس یعنی کھوج لگانے والے کارتوس ہے +

توپ خانہ۔

توپ خانے سے دشمن پر بہت دور سے گولہ باری کی جاتی ہے۔ مگر بہت قریب کے

نشانوں پر بھی گولے برسائے جاسکتے ہیں۔ یہ دشمن کی پلٹن، ٹینکوں، مورچوں، راستوں اور ہوائی جہازوں وغیرہ کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ مختلف موقعوں پر مختلف قسم کے گولوں سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض گولے قلعہ شکن ہوتے ہیں، بعض ٹینک شکن بعض انسانوں ہی کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض سے دھواں پیدا کیا جاتا ہے۔ بعض سے زہریلی قسم کی گیس نکلتی ہے اور بعض رات کے وقت تاریک علاقوں میں روشنی پیدا کرنے کے کام آتے ہیں +

توپ خانے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چند لمحوں کے اندر صحیح نشانہ پر گولہ باری کرسکتا ہے۔ پھر ذرا سے وقت میں اس کا رُخ ایک نشانے سے دوسرے نشانے پر بدلا جاسکتا ہے۔ آجکل اس کی مار کا فاصلہ ۸۰ میل تک ہے۔ لیکن جدید قسم کے راکٹ (Rocket) گولے کے استعمال سے اب یہ فاصلہ کئی گُنا بڑھ جائے گا +

جن توپوں کو بحری جہازوں پر استعمال کیا جاتا ہے وہ زمین پر قائم کرکے چلائی جانے والی توپوں سے کسی قدر مختلف ہوتی ہیں۔ ان کے دہانے بری توپوں سے عموماً بڑے ہوتے ہیں اس لئے ان کی مار بھی لمبی ہوتی ہے اور گولہ بھی بہت وزنی ہوتا ہے۔ اسی طرح ہوائی جہاز مار توپیں (Anti-Air Craft Guns) بری و بحری دونوں توپوں سے الگ ہوتی ہیں۔ ٹینک شکن توپوں کا گولہ ساخت میں مختلف ہوتا ہے +

ہوائی جہاز۔

آجکل ہوائی جہاز دشمن کے خلاف طرح طرح سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مختلف کاموں کے لئے ہوائی جہاز بھی مختلف ساخت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً جو ہوائی جہاز دشمن کے علاقے میں، اس کے جنگی مورچے کے خلاف یا کسی عمارت اور پُل وغیرہ پر بمباری کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ان میں نشانے کی جگہ تک بڑے بڑے وزنی بم اُڑا کر لے جائے جاتے ہیں، پھر یہ بم موقعہ دیکھ کر گرائے جاتے ہیں۔ اگر بمباری دشمن کی فوج پر کی جاتی ہے تو ہلکے بم استعمال کئے جاتے ہیں۔ پُلوں، عمارتوں اور کارخانوں وغیرہ پر بڑے اور وزنی بم استعمال کئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان سے

زہریلی گیس بھی چھوڑی جاتی ہے۔ بعض اوقات ان سے فوجی دستوں، توپ خانوں، موٹر گاڑیوں، سامانِ حرب و رسد اور زخمیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان میں کچھ بامبر (Bomber) یعنی بم پھینکنے والے ہوتے ہیں، کچھ فائیٹر (Fighter) یعنی لڑاکے اور کچھ فریٹر (Freighter) یعنی باربردار ہوتے ہیں۔ مختلف ساخت کے جہازوں کے نام مختلف ہوتے ہیں مگر ان کی خاص قسمیں یہی ہیں +

۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ جوں جوں طویل ہوتی گئی سائنس کی نئی ایجادیں تجربہ گاہ کی بجائے میدانِ جنگ کے عملی تجربات پر مبنی ہوتی گئیں۔ مثلاً ٹینک ایسے بنائے گئے جن سے زیرِ زمین دشمن کی بچھائی ہوئی سرنگوں کو صاف کیا جا سکے +

دشمن ہوائی جہازوں کے خلاف گولہ باری کے لئے (Radar) جیسا آلہ ایجاد ہوا۔ اس سے سمندر میں دشمن کے بحری جہازوں اور تحت البحر کشتیوں کی آمد کا بہت فاصلے سے پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دشمن کے ہوائی جہاز کتنے فاصلے پر ہیں (Radar) سے گولے کا شتابہ (Fuse) خود بخود چل جاتا ہے اور اس طرح اس سے توپ کا گولہ چند لمحوں کے اندر پھینک دیا جاتا ہے +

بحری جنگ کے لئے ایسی بندرگاہیں بنائی گئیں جہاں بحری بیڑا ہر قسم کا سامانِ جنگ اُتار سکے اور دشمن کے حملے سے جو نقصان ہو اس سے اپنی فوج کو بچایا جا سکے۔ اگر دشمن زمین دوز ہو جائے تو سنگین کی دست بدست جنگ کی بجائے ٹینکوں سے آگ برسا کر اسے جلا کر خاکستر کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے آلے ہیں جن کی مدد سے سپاہی پہاڑی علاقوں میں چھپے ہوئے دشمن پر آتش باری کر کے اس کے زمین دوز مورچوں کو تباہ کر سکتے ہیں۔ امریکیوں نے اس قسم کے آلات جاپانیوں کے خلاف کثرت سے استعمال کئے کیونکہ انہیں زمین دوز مورچوں میں بیٹھ کر لڑنے کا خاص ملکہ تھا۔ امریکیوں نے جب شروع شروع میں ان کے ان مورچوں پر حملہ کیا تو ان کا زبردست جانی نقصان ہوا۔ اس آلے کو شعلہ انداز (Flame Thrower) کہتے ہیں۔ امریکی فوج اسی آلے کی مدد سے انہیں زیر کرنے میں کامیاب ہوئی +

خود بخود اُڑنے والے ہوائی جہاز اور بم۔

جرمنی نے اتحادیوں کے خلاف ایسے ہوائی جہاز استعمال کئے جو ہوا بازوں کے بغیر خود بخود چلتے تھے۔ انہیں ریڈیائی لہروں کی مدد سے اُڑایا جاتا تھا اور حملے کے مقام پر پہنچا کر گرا دیا جاتا تھا۔ ان سے زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ وی ۲ (V 2) بم بھی اسی قسم کا ایک خوفناک ہتھیار تھا جسے راکٹ کی مدد سے اڑایا جاتا تھا +

ایٹم بم۔

موجودہ زمانے کی سب سے خطرناک اور حیرت انگیز ایجاد ایٹم بم ہے۔ اس کی ہلاکت و تباہ کاری بڑی ہولناک ہے۔ لیکن ہائیڈروجن بم کے سامنے ایٹم بم کی حیثیت بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسی توپ کے مقابلے میں بندوق کی۔ ہائیڈروجن بم تیار ہو چکا ہے اور حال ہی میں امریکہ نے اس کا تجربہ بھی کیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے آلاتِ جنگ و تباہ کاری تیار ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئے اور وہ ہے کسی قوم کا عزم و حوصلہ۔ یہ سچ ہے کہ خالی عزم و حوصلہ کام نہیں دیتا، تدبیر و چارہ گری لازمی ہے، کارگاہِ حیات میں اسکے بغیر چارہ نہیں، مگر اسباب و وسائل بھی تنہا کام نہیں دیتے لیکن اگر عزم و حوصلہ مندی کی صفات موجود ہوں تو وسائل کی قلت کسی درجے میں بھی حارج نہیں ہوتی +

, 1897-

22459